# دین وشریعت

توحید، عقائد، رسالت، اجتہاد، معجزات، کرامت، منکرین حدیث کی گمراہی،
رویتِ باری تعالیٰ، عملی شریعت، عبادات، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، اخلاق،
معاملات ومعاشرت، دین کی خدمت ونصرت، جہاد، سیاست وحکومت،
احسان وتصوف، نیز نورِ یقین واحسانی کیفیت سے متعلق اہم تعلیمات اور
رابطہ مع اللہ پیدا کرنے کے لئے ابتدائی لائحہ عمل

از


مولانا محمد منظور نعمانی

ناشر

الفرقان بکڈپو، نظیرآباد لکھنؤ

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِ سْلَام

# دین وشریعت

توحید، عقائد، رسالت، اجتہاد، معجزات، کرامت، منکرین حدیث کی گمراہی، رویتِ باری تعالیٰ، عملی شریعت، عبادات، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، اخلاق، معاملات و معاشرت، دین کی خدمت ونصرت، جہاد، سیاست وحکومت، احسان وتصوف، نیز نورِ یقین واحسانی کیفیت سے متعلق اہم تعلیمات اور رابطہ مع اللہ پیدا کرنے کے لئے ابتدائی لائحہ عمل

مولانا محمد منظور نعمانیؒ

علماء دیوبند کے علوم کا پاسبان
دینی وعلمی کتابوں کا عظیم مرکز ٹیلیگرام چینل
حنفی کتب خانہ محمد معاذ خان
درس نظامی کیلئے ایک مفید ترین
ٹیلیگرام چینل

ناشر

الفرقان بکڈپو، نظیر آباد لکھنؤ-۱۸

E-mail: alfurqan_lko@yahoo.cam

جملہ حقوق طبع محفوظ ہیں

جدید کمپیوٹرائز ایڈیشن جلی سرخیوں کے ساتھ

نام کتاب ........................ دین وشریعت

مصنف ........................ مولانا محمد منظور نعمانیؒ

ایڈیشن ........................ ۳۲واں

سال اشاعت ........................ ۲۰۱۹ء

طباعت ........................ کاکوری آفسیٹ پریس لکھنؤ

بسعی واہتمام ........................ محمد حسان نعمانی

قیمت

-/250 روپے

ناشر

الفرقان بکڈپو، نظیر آباد لکھنؤ-۱۸

E-mail: alfurqan_lko@yahoo.cam

# فہرست مضامین وعنوانات


| مضامین وعنوانات | صفحہ نمبر |
|---|---|
| عرض ناشر — ازمحمد حسان نعمانی | ۱۲ |
| مقدمہ — ازمولانا سید ابوالحسن علی ندوی | ۱۳ |
| شکر نعمت اور پیش لفظ — ازمصنف | ۱۹ |
| دین وشریعت کی بنیاد اور اس کے دو حصے اعتقادی وعملی | ۲۵ |
| ایمان | ۲۶ |
| عقائد اور ایمانیات | ۲۶ |
| اللہ تعالیٰ کی ہستی | ۲۷ |
| خدا کی ہستی کے موضوع پر ایک دلچسپ گفتگو اور عام فہم استدلال | ۳۰ |
| توحید | ۳۲ |
| بیان توحید کا ایک طریقہ | ۳۲ |
| بیان توحید کا دوسرا طریقہ | ۳۳ |
| کم سے کم کس درجے کی توحید معتبر ہے اور لا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ کا ابتدائی مطالبہ کیا ہے؟ | ۳۵ |
| قرآن مجید کا بیان کہ مشرکینِ عرب بھی ایک درجہ توحید کے قائل تھے۔ | ۳۵ |
| پھر اُن کا شرک کیا تھا؟ | ۳۶ |
| مشرکین عرب کا تلبیہ | ۳۸ |
| مشرکین عرب کے شرک کی حقیقت اور قرآن میں اس کی تردید | ۳۸ |
| ان مشرکوں کے معبود کون تھے؟ | ۴۱ |

| مضامین وعنوانات | صفحہ نمبر |
|---|---|


| مضامین وعنوانات | صفحہ نمبر |
|---|---|
| یہ مشرک لوگ خدا کو سب سے بڑا اور اصل خالق و مالک ماننے کے باوجود دوسروں سے کیوں اپنی حاجتیں طلب کرتے تھے؟ | ۴۳ |
| اس شیطانی دھوکہ سے نکالنے کی قرآنی تدبیر | ۴۴ |
| توحید اور شرک سے متعلق دو اہم سوال | ۴۶ |
| عالمِ اسباب کی چیزوں سے مدد لینا شرک کیوں نہیں؟ | ۴۷ |
| عبادت کسے کہتے ہیں؟ | ۴۷ |
| بعض چھوٹے درجہ کے شرک | ۴۸ |
| نئے زمانے کے نئے بُت | ۴۹ |
| خاتم النبیین کی تکمیلِ توحید | ۵۱ |
| **عقیدۂ آخرت** | |
| آخرت پر ایمان لانے کا مطلب کیا ہے؟ | ۵۵ |
| آخرت عقلاً بھی ضروری ہے | ۵۵ |
| جزا اور سزا اس دنیا میں کیوں نہیں دی جاتی؟ | ۵۸ |
| خدائی شان اور اس کے جلال و جمال کے ظہور کے لئے بھی آخرت کی ضرورت ہے | ۵۹ |
| عقیدۂ آخرت کا اثر انسان کی زندگی پر | ۶۰ |
| آخرت کی تفصیلات نبوت ہی کے راستہ سے معلوم ہوسکتی ہیں | ۶۱ |
| آخرت کی تفصیلات میں شبہ، علم و عقل کی نارسائی کی وجہ سے ہوتا ہے | ۶۱ |
| اللہ اور آخرت پر ایمان کا تقاضا | ۶۳ |
| **رسالت** | |
| رسالت کی ضرورت | ۶۴ |
| رسول کون ہونا چاہئے؟ | ۶۵ |

| صفحہ نمبر | مضامین وعنوانات |
|---|---|
| ۶۵ | نبی فرشتہ نہیں بلکہ انسان ہی ہوسکتا ہے |
| ۶۶ | نبی اگر خدایا خدا کا اوتار یا فرشتہ ہو، تو نبوت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے |
| ۶۷ | نبیوں کو خدا کا اوتار یا فرشتہ ماننے کے بعد ان کی زندگیوں میں کوئی کمال بھی نہیں رہتا |
| ۶۸ | قرآن مجید کا اعلان کہ سارے پیغمبر انسان ہی تھے |
| ۶۸ | دنیا میں انبیاء برابر آتے رہتے ہیں |
| ۶۹ | ایمان سب نبیوں پر اور پیروی صرف نبیِ وقت کی |
| ۷۰ | پہلی شریعتوں کی منسوخی کی ایک عام فہم مثال |
| ۷۱ | انبیاءؑ شریعت ساز نہیں، بلکہ شریعت رساں ہوتے ہیں |
| ۷۲ | انبیاءؑ کے اجتہاد کی حیثیت |
| ۷۳ | ائمہ مجتہدین کا اجتہاد |
| ۷۴ | اُمت کے مجتہدین |
| ۷۴ | اجتہاد کا حق کس کو ہے؟ |
| ۷۵ | نئی روشنی کے بے علم مجتہد |
| ۷۵ | نبوت وہبی ہے کسبی نہیں |
| ۷۶ | معجزات |
| ۷۶ | معجزہ نبی کا نہیں، بلکہ اللہ کا فعل ہوتا ہے |
| ۷۶ | معجزہ بھی انسانوں کی ضرورت ہے |
| ۷۷ | قرآن مجید کا بیان کہ معجزے اللہ ہی کے اختیار میں ہیں |
| ۷۸ | کرامت |
| ۷۸ | ولی کون ہوتا ہے؟ |
| ۷۹ | استدراج |
| ۸۰ | کرامت ولایت کی شرط نہیں ہے |

| مضامین وعنوانات | صفحہ نمبر |
| --- | --- |
| اولیاء اللہ سے عناد کا نتیجہ خدا دشمنی ہے | ۸۰ |
| رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات | ۸۱ |
| قرآن مجید بحیثیت معجزہ | ۸۱ |
| اعجاز قرآن کے چند عام فہم پہلو | ۸۱ |
| قرآن پاک کی معجزانہ محفوظیت | ۸۱ |
| اس کی معجزانہ علمی شان | ۸۲ |
| قرآن پاک کی معجزانہ فصاحت وبلاغت | ۸۴ |
| ان سب پہلوؤں سے قرآن پاک آج بھی معجزہ ہے | ۸۵ |
| آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک دوسرا زندہ تاریخی معجزہ | ۸۶ |
| ایک بڑا دلچسپ اور بصیرت افروز مکالمہ | ۸۷ |
| ایک اور زندہ معجزہ | ۹۰ |
| مقام نبوت اور کسی کو نبی ماننے کا مطلب | ۹۲ |
| اطمینان قلبی کے لئے دلیل یا حکمت دریافت کرنے میں مضائقہ نہیں | ۹۳ |
| ہماری عقلوں کی پرواز | ۹۳ |
| پیغمبر کی بعض باتوں کو ماننا اور بعض باتوں کو نہ ماننا بھی کفر ہے | ۹۴ |
| منکرینِ حدیث کی گمراہی | ۹۵ |
| وحدتِ ادیان کے مبلّغین اور حدیث کے منکرین کی مشترک غلطی | ۹۷ |
| اُمہات العقائد کی خصوصیت | ۹۹ |
| باقی عقائد | ۹۹ |
| عقائد کی دو قسمیں | ۱۰۰ |
| ضروریات دین | ۱۰۱ |
| دوسرے درجے کے عقائد | ۱۰۱ |
| اُمت میں اختلافِ عقائد کا آغاز | ۱۰۱ |

| مضامین و عنوانات | صفحہ نمبر |
|---|---|


| | |
|---|---|
| اہل سنت والجماعت کا اصول | ۱۰۲ |
| دوسرے فرقے | ۱۰۳ |
| مرتکبِ کبیرہ کے بارے میں اختلاف اور اس کی بنیاد | ۱۰۴ |
| مسئلۂ رویتِ باری تعالیٰ | ۱۰۵ |
| معتزلہ کے انکار کی بنیاد | ۱۰۶ |
| اہلِ سنت کے اثبات کی بنیاد | ۱۰۶ |
| معتزلہ کے عقلی شبہ کا جواب | ۱۰۷ |
| مسئلہ جبر وقدر | ۱۰۸ |
| حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ایک مکتوب میں طریقۂ اہل سنت کی وضاحت | ۱۰۹ |
| سلف صالحین کے اتباع ہی میں فتنوں سے حفاظت ہے | ۱۱۱ |
| اس زمانہ میں سلف صالحین کا اتباع ہمیشہ سے زیادہ ضروری ہے | ۱۱۲ |
| ایک گمراہ کن مغالطہ | ۱۱۲ |
| خوارج کا قرآنی نعرہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جواب | ۱۱۳ |
| فقہی مسائل میں تقلید | ۱۱۴ |


## عملی شریعت


| | |
|---|---|
| شریعت کے شعبے | ۱۱۶ |
| عبادات کی خصوصی اہمیت | ۱۱۶ |
| عبادات سے کیا مُراد ہے؟ | ۱۱۶ |
| عبادت کا مقصد | ۱۱۷ |
| انسان کے روحانی اور ملکوتی پہلو کا نشو ونما عبادت سے ہوتا ہے | ۱۱۸ |
| عبادات کے بارے میں مادیت زدہ لوگوں کی غلط فہمی | ۱۱۹ |
| اس غلط فہمی کی ایک مثال | ۱۲۰ |
| ارکانِ اربعہ | ۱۲۲ |

| مضامین وعنوانات | صفحہ نمبر |
|---|---|
| نمازاوراس کی خاص اہمیت | ۱۲۲ |
| نماز کا تعلق اللہ کی صفت حاکمیت سے بھی ہے اور محبوبیت سے بھی | ۱۲۳ |
| نماز ایمان کا خارجی وجود ہے | ۱۲۵ |
| نماز زندگی کے تمام شعبوں پر اثر ڈالتی ہے | ۱۲۶ |
| اپنی نمازوں کی تکمیل اور ترقی کی ضرورت | ۱۲۷ |
| اس کی چند اصولی تدبیریں | ۱۲۷ |
| نماز سمجھ کر پڑھی جائے | ۱۲۸ |
| اس بارے میں بعض لوگوں کا غلو | ۱۲۸ |
| نماز میں خیالات آنے کی شکایت | ۱۲۹ |
| نماز کو بہتر بنانے کی ایک نبویؐ تدبیر | ۱۳۱ |
| نوافل | ۱۳۱ |
| تہجد کی غیر معمولی اہمیت اور اُس کی خاص برکات | ۱۳۲ |
| تہجد کی ایک خاص تاثیر | ۱۳۴ |
| آخر شب میں اللہ کا ذکر | ۱۳۵ |
| چاشت کے نفل | ۱۳۶ |
| زکوٰۃ | ۱۳۷ |
| نماز کی طرح زکوٰۃ کو بھی بہتر طریقے پر ادا کرنے کی فکر ضروری ہے | ۱۳۸ |
| زکوٰتوں کو نورانی بنانے کی تدابیر | ۱۳۸ |
| روزہ | ۱۳۹ |
| روزہ کی برکات حاصل کرنے کی شرطیں اور تدبیریں | ۱۴۰ |
| نفلی روزوں کے بارے میں اُسوۂ نبویؐ اور ہمارا طرزِ عمل | ۱۴۱ |
| نفلی روزے نہ رکھنے کا اثر ہمارے رمضان کے روزوں پر | ۱۴۲ |
| حج | ۱۴۲ |

| صفحہ نمبر | مضامین وعنوانات |
|---|---|


حج کے لئے روح اور باطن کو تیار کرنے کی ضرورت ۱۴۳
ارکانِ اسلام کے رکن ہونے کا مطلب اور اُن کا امتیاز ۱۴۴
ارکان میں حقیقت پیدا کرنے کی کوشش احیاء دین کے سلسلہ کا بنیادی کام ہے ۱۴۶

## اخلاق حسنہ

دین میں اخلاق کی اہمیت ۱۴۷
اعمالِ صالحہ کی چار قسمیں ۱۴۷
اخلاق میں ایک گونہ اللہ تعالیٰ کی نیابت ہے ۱۴۹
اخلاق کے متعلق چند احادیث نبویؐ ۱۴۹
قرآن وحدیث میں اچھے اخلاق کی تاکید اور بُرے اخلاق پر سخت وعیدیں ۱۵۰

## معاملات اور معاشرت

دین میں معاملات اور معاشرت کی خصوصی اہمیت ۱۵۶
دین میں معاملات اور معاشرت کی اہمیت کا ایک دوسرا پہلو ۱۵۷

## دین کی خدمت ونصرت

نبوت ختم ہوگئی مگر کارِ نبوت باقی ہے اور اب قیامت تک کے لئے اس کی ذمہ داری اُمت محمدیؐ پر ہے ۱۶۳
دین کی خدمت ونصرت کے مختلف شعبے اور مختلف صورتیں ۱۶۵
قرآن مجید میں نصرتِ دین اور جہاد فی سبیل اللہ کی عمومی تاکید وترغیب ۱۶۵
دین کی جدوجہد اور خدمت ونصرت کے خاص خاص شعبوں کی تاکید وترغیب ۱۶۸
دعوتِ حق، امر بالمعروف ونہی عن المنکر ۱۶۸
تبلیغ تعلیم وتربیت، اصلاح وارشاد ۱۷۱
قتال فی سبیل اللہ ۱۷۵

| مضامین وعنوانات | صفحہ نمبر |
|---|---|
| جہاد کے بارے میں غلط فہمی کی بنیاد | ۱۷۶ |
| جہاد کے بارے میں قرآنی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات | ۱۷۷ |
| سورۃ الحج کی اِذنِ جہاد والی آیتوں کے دو خاص نکتے | ۱۷۸ |
| سورۂ توبہ کی ایک آیت میں مجاہدین کے اوصاف | ۱۷۹ |
| فی سبیل اللہ جم کر قتال کرنے والے بندے اللہ کے محبوب ہیں | ۱۸۰ |
| راہِ خدا میں شہید ہونے والے مرتے نہیں، بلکہ زندۂ جاوید ہو جاتے ہیں | ۱۸۱ |
| حدیثوں میں جہاد و شہادت کی ترغیب و فضیلت | ۱۸۲ |
| امت کی طرف سے نصرتِ دین کے تمام شعبوں کی انجام دہی کا صحیح ترین نظام خلافتِ راشدہ کا نظام تھا | ۱۸۴ |
| وفاتِ نبویؐ کے بعد انتخابِ خلیفہ کے مسئلہ کی اصل نوعیت کیا تھی؟ | ۱۸۲ |
| خلافتِ راشدہ کے بعد دین کی خدمت و نصرت کا نظام | ۱۸۵ |
| دین کی خدمت اور اس کی راہ میں جدوجہد کرنے والے ''انصار اللہ'' اور ''خلفاء نبویؐ'' ہیں | ۱۸۶ |
| حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تحقیق کہ رسول اللہ ﷺ کی خلافت دو قسم کی ہے | ۱۸۶ |
| حکومت والی خلافت، اُمت میں عرصہ سے مفقود ہے، لیکن دوسری خلافت باقی و جاری ہے | ۱۸۷ |
| **سیاست وحکومت** | ۱۸۸ |
| کائنات کا حقیقی مالک و فرماں روا | ۱۸۹ |
| نظریۂ خلافت | ۱۹۰ |
| اسلامی حکومت کا سربراہ (خلیفہ) کا انتخاب | ۱۹۱ |
| شوریٰ کی پابندی | ۱۹۱ |
| اسلام کا حکومتی منشور اور حکومت واقتدار کا مقصد | ۱۹۲ |

| صفحہ نمبر | مضامین وعنوانات |
|---|---|
| ۱۹۲ | اسلامی حکومت کی ذمہ داریاں |
| ۱۹۶ | قانون |
| ۱۹۷ | اسلامی حکومت میں عُہدوں کے طالبوں اور خواہشمندوں کو عُہدے نہیں دیے جائیں گے |
| ۱۹۸ | اسلامی حکومت کے عُہدے داروں کی معاشرت کا معیار زیادہ بلند نہیں ہونا چاہئے |
| ۱۹۹ | اسلامی ممالک کی موجودہ حکومتوں کو ''اسلامی حکومت'' بنانے کے سلسلہ کا بنیادی کام |
| ۲۰۰ | غیر اسلامی اقتدار کے تحت رہنے والے مسلمانوں کا مسئلہ |
| ۲۰۶ | سورۂ یوسف کا پیغام |
| | **احسان وتصوف** |
| ۲۱۳ | احسان وتصوف کی حقیقت |
| ۲۱۵ | حضور ویادداشت ونسبت، احسانی کیفیت ہی کی تعبیریں ہیں |
| ۲۱۸ | احسانی نسبت پیدا کرنے کے لئے طریقۂ صوفیہ کا آغاز |
| ۲۱۸ | ہزار سال سے زیادہ کا تجربہ اور صلحائے اُمت کا اتفاق |
| ۲۱۹ | اغلاطِ تصوف اور اُن کی اصلاح |
| ۲۲۰ | ضرورتِ مُرشد |
| ۲۲۱ | اللہ والوں کی پہچان |
| ۲۲۲ | اصلاحِ عام |
| ۲۲۳ | اس درجہ کے طالبین کے لئے ابتدائی لائحہ عمل |
| ۲۳۰ | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو خاص دعائیں |
| ۲۳۳ | ضمیمہ (غیر اسلامی نظام حکومت میں شرکت اور ملازمت) |

# عرضِ ناشر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

والد ماجد قدس سرہٗ کی یہ تصنیف ''دین وشریعت'' جو آپ کے ہاتھ میں ہے، پہلی دفعہ ۱۳۷۸ھ (۱۹۵۸ء) میں شائع ہوئی تھی، الحمد للہ اُس وقت سے اب تک یہ برابر شائع ہو رہی ہے، ہماری معلومات کے مطابق انگریزی، فرانسیسی، اور گجراتی زبانوں میں بھی اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پہلے یہ چھوٹے کتابی سائز میں شائع ہوئی تھی۔

۱۹۸۴ء میں مصنفؒ نے اس پر نظر ثانی کی اور ایک اہم ضمیمہ کا اضافہ کیا، ساتھ ہی ایک بیش قیمت اضافہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے تحریر کردہ مقدمہ کا ہوا۔ جب سے یہ اسی طرح چھپتی چلی آرہی تھی۔ کتاب جس قدر اہمیت کی حامل ہے افسوس ہے کہ اس کے مطابق معیاری اشاعت ہم نہ کر سکے، اللہ کی توفیق سے اب اس کا کمپیوٹرائزڈ ایڈیشن جلی سرخیوں کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے۔ جس سے کتاب کی افادیت میں یقیناً اضافہ ہوگا۔

موجودہ دور میں، خاص طور پر ہمارے ملک میں اسلام کے خلاف جس طرح کا پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے اس سے مسلمان تعلیمیافتہ طبقہ تک متاثر ہو رہا ہے۔ لہٰذا اِس وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہر تعلیمیافتہ مسلمان، اسلام اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں اس طرح واقف ہو کہ سب سے پہلے تو اس کا دل مطمئن ہو، وہ اُن پر عمل کرے، پھر اس پروپیگنڈہ کے خلاف دوسروں کو حقیقت سے واقف کرائے۔

بلاشبہ یہ کتاب اس وقت کی خاص ضرورت ہے، اس کتاب میں اسلامی اصول وتعلیمات کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ دین وشریعت کے بارے میں ذہنوں کو بصیرت اور دلوں کو یقین واعتماد اور اپنے بزرگوں کے اختیار کئے ہوئے مسلکِ اہلِ سنت کے بارے میں پورا اطمینان ہوتا ہے۔ اور ہر طرح کے شکوک وشبہات دور ہوتے ہیں۔

آخری کلمہ اللہ کی حمد ہے اور حُسنِ توفیق، حُسنِ قبول اور حُسنِ خاتمہ کی دعا۔

محمد حسان نعمانی

(۹ر صفر المظفر ۱۴۴۱ھ)

# مقدّمہ

از: مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للّٰہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

جب یہ حقیقت مسلّم ہے کہ اسلام آخری دین ہے، وہ حدود وثغور اور ممالک واقالیم ہی نہیں، زمان ومکان، نسل وزبان اور عقول واذہان کے حدود سے بھی آزاد، ایک دائمی، زندہ جاوید اور عالمگیر پیغام، دعوت، اور زندگی کا دستور العمل ہے، تو اس سے لازماً ایک دوسری حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ ہر زمانہ، ہر ماحول، ہر ذہنی سطح اور ہر زبان واسلوب میں اس کو اس طرح پیش کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کے ماننے والوں اور پیرؤوں کے ایمان واطمینان میں اضافہ، ذہین طبیعتوں کی ذہنی تشفی کا سامان، اور ان کے ان نئے سوالات کا جواب ہو۔ جو ماحول، خاص طرح کی تعلیم وتربیت، ہمسایہ قوموں کے ساتھ رہنے، دوسرے مذاہب کا مطالعہ یا اہم واقعات وتغیرات نے اُن کے ذہن میں پیدا کردیئے ہیں، نیز ایک طالب حق اور سلیم الطبع انسان کو سمجھانے اور اس کے سامنے اسلام یا اس کے کسی عقیدہ یا حکم کی معقولیت ثابت کرنے کا بقدر ضرورت سامان ہو۔

اس ابدی صداقت کو سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے (جنہوں نے آغوشِ نبوت میں تربیت حاصل کی تھی اور قرآن مجید کا عمیق وممتاز فہم رکھتے تھے) اپنے اس حکیمانہ جملہ میں بیان فرمادیا ہے، جو اغلب ہے کہ اُنہیں کے لفظوں میں اِس وقت تک نقل ہوتا چلا آرہا ہے اور

اپنے اندر معانی کا ایک دفتر رکھتا ہے۔ اُن کا ارشاد ہے:۔

کلّموا الناس علی قدر عُقولھم اتریدون اُن یکذّب اللّٰہ ورسولہٗ۔

لوگوں سے ان کی عقلی سطح اور فہم کے مطابق (دینی) بات کرو، کیا تم چاہتے ہو

کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی تکذیب کا اُن کو موقع ملے۔

اس عالمی صداقت اور قانون فطرت کا تقاضہ تھا کہ علوم اسلامیہ کی تاریخ میں اسلامی عقائد کی تشریح (جس کا اصطلاحی اور معروف نام علم کلام ہے) اور طریقِ دعوت سب سے زیادہ اس اصول پر عمل اور اپنے کو زندگی کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرے، امام ابوالحسن اشعریؒ، امام غزالیؒ، جلال الدین رومیؒ، شیخ الاسلام حافظ ابنِ تیمیہؒ، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تحریریں اور تصنیفات اس کوشش کا ایک نمونہ ہیں، دورآخر میں علامہ حسین الجسر طرابلسی کا رسالہ ''الحمیدیہ'' بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

جہاں تک اس زمانہ کا تعلق ہے یہ کام پہلے سے زیادہ دشوار اور نازک ہو گیا کہ ذرا سی غفلت، کسی رجحان کے غلبہ یا ذہنی ردِّعمل کے نتیجہ میں دین کی یہ تفہیم، زمانہ کے اثرات سے متاثر، روح اور مقاصد دین سے دور، اور رائج الوقت اور مقبول زمانہ فلسفوں، تحریکوں اور نظریات کی ترجمان بن سکتی ہے۔ اس کام سے صحیح طور پر وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا ہے جس نے ایک طرف دین کا علم، اس کے ماہر اساتذہ اور علماء راسخین سے حاصل کیا ہو، کتاب وسنت سے براہ راست استفادہ کی صلاحیت اور قدرت رکھتا ہو، تعلیم کے ساتھ علماء راسخین کی صحبت بھی پائی ہو، پھر اسکے ساتھ وہ عوام وخواص کے مختلف حلقوں میں رہا ہو، ان کے حالات وخیالات سے واقف ہو، اس نے زندگی کسی خیالی دنیا علمی حصار یا ''دینی جزیرہ'' میں نہ گزاری ہو، اہل حرفت سے لے کر دانشوروں اور علماء اور واعظین سے لے کر سیاسی میدان میں کام کرنے والوں تک سے اس کا اختلاط ونشست وبرخاست رہی ہو، پھر وہ (وہبی یا اکتسابی طریقہ پر) دقیق مسائل کو سہل اور عام طریقہ پر بیان کرنے اور سادہ سے سادہ زبان بولنے اور لکھنے پر قادر ہو،

اس سب کے علاوہ اس کے اندر اخلاص، سوزِ دروں اور دعوت کا طاقتور جذبہ بھی پایا جاتا ہو کہ اس کے بغیر کوئی کوشش مؤثر اور انقلاب انگیز نہیں ہوتی۔

ہمارے زمانہ میں جب انگریزی نظامِ تعلیم خود مسلمانوں کے ذہنوں پر پورا اثر ڈال چکا تھا اور اس میں کئی نسلیں پورے طور پر پرورش پا چکی تھیں اسی کے ساتھ مغرب سے آئے ہوئے مادّی فلسفوں، مادّی طریق فکر، سیاسی تحریکات اور مسلم ممالک اور اسلامی معاشرہ میں کئی طرح کے خلا کے وجود کا احساس، پسماندگی اور شکست خوردگی کا حد سے بڑھا ہوا شعور اور بعض حلقوں میں (خلوص کے ساتھ) ہر اس نظریہ کا خیر مقدم جو اسلام کو زمانہ کے مطابق ثابت کرنے اور مسلمانوں کو غلبہ اور طاقت دلانے کی کوشش کرے، اس کام کو زیادہ نازک اور مشکل بنا دیا تھا، پھر اس کے ساتھ عوام اور متوسط طبقہ کو سامنے رکھنے اور روزمرّہ کی سادہ زبان میں ان دینی حقائق کو بیان کرنے کی کوشش نے اس کو اور دشوار اور اس کوشش کے نتائج کو مشکوک بنا دیا تھا کہ بعض اوقات وہ ''اجتماعِ ضدّین'' کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔

مجھے اس حقیقت کے اعلان میں مسرّت اور کسی قدر فخر محسوس ہوتا ہے کہ رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر الفرقان نے اس اہم اور نازک کام کا بیڑہ اُٹھایا، اور پہلے کم تعلیم یافتہ اور سادہ ذہن رکھنے والے لوگوں کے لئے ''اسلام کیا ہے'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جس کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے اتنے ایڈیشن اردو میں اور ترجمے انگریزی، فرانسیسی، برمی، ہندی، گجراتی، کنڑی اور ہندوستان کی دیگر متعدد زبانوں میں نکلے جو اردو کی کم دینی، دعوتی کتابوں کے ہوئے ہوں گے۔ اس کی افادیت واثر کا مجھے ذاتی طور پر تجربہ اور علم ہے اور کم خواندہ لوگوں کے لیے اسلام کو سمجھنے نیز اس پر عمل کرنے کے لئے ہمارے پاس اس وقت بھی کم کتابیں ہیں جو اس کی طرح مفید اور مؤثر ہوں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مولانا کو توفیق دی کہ وہ اس سے بلند معیار کی کتاب پیش کریں جس میں ان کے بقول ''اسلامی اصول و تعلیمات کو اس طرح پیش کیا جائے کہ

دلوں سے عہد حاضر کے شکوک وشبہات اور اہل زیغ وضلال کے مغالطات وتحریفات کی بھی صفائی ہو اور اس کے ذریعہ علم و واقفیت کے ساتھ دین وشریعت کے بارے میں ذہنوں کو بصیرت اور قلوب کو یقین و اعتماد اور سلف صالحین کے اختیار کیے ہوئے مسلک، اہل سنت کے بارے میں اطمینان بھی حاصل ہوتا چلا جائے'' [1]

اس کتاب کی تصنیف میں جو (وقت کی ایک بڑی ضرورت تھی) مولانا کی علمی مشغولیتوں اور تبلیغی دوروں کی وجہ سے شاید بہت تاخیر ہوتی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ایک تقریب وتحریک پیدا کردی، محرم ۱۳۷۲ھ (ستمبر ۱۹۵۲ء) میں ہم دونوں نے (جو اس وقت لکھنؤ اور اس کے اطراف میں نظام الدین (دہلی) کے طرز کی تبلیغی جدوجہد ونقل وحرکت کے ذمہ دار تھے اور ایک ہی جگہ کچہری روڈ لکھنؤ کے تبلیغی مرکز میں قیام تھا، طویل تجربہ اور واقفیت کی بنا پر اس ضرورت کا شدت سے احساس کیا کہ تبلیغی کارکنوں اور رفقائے جماعت کی ذہنی تربیت اور ان کی دینی واقفیت میں اضافہ اور توسیع کی ضرورت ہے، تاکہ وہ شعوری طور پر خود بھی واقف اور مطمئن ہوں اور دوسروں کو بھی واقف اور مطمئن کرسکیں، اس کے لیے ایک تربیتی ہفتہ کا نظام بنایا گیا، جس میں دین کے ضروری شعبوں اور پہلوؤں پر ایک جامع، معلومات افزا اور مربوط تقریر کی جائے، مولانا نے اسلام کے بنیادی عقائد ومسائل پر اور دین وشریعت کے موضوع پر تقریر کا ذمہ لیا، اور میں نے اصلاح وتجدید کی تاریخ اور اس کی اہم شخصیتوں کا عنوان اختیار کیا، پہلی کوشش کے نتیجہ میں زیر تبصرہ ''دین وشریعت'' جیسی قیمتی ومفید کتاب وجود میں آئی، اور دوسری کوشش کے نتیجہ میں ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کا سلسلہ مرتب ہوا۔ جس کا پہلا حصہ ۱۹۵۵ء میں دار المصنفین اعظم گڑھ کی طرف سے شائع ہوا، پھر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ نے اس کو اپنی مطبوعات میں شامل کرلیا اور تحدیث بالنعمۃ کے طور پر اس کا ذکر کیا جاتا ہے کہ حال میں اس کا پانچواں حصہ جو حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ

---

[1] دین وشریعت صفحہ ۲۰

کے عہد اور ان کے اخلاف وخلفاء کے تذکرے پر مشتمل ہے، مرتب ہوا اور طباعت کے لیے پریس جارہا ہے۔ ؎

مولانا نے ان تقریروں کی یادداشت کو سامنے رکھ کر جو بعض دوستوں نے قلمبند کرلی تھی اور جس میں قدرتی طور پر خطابی انداز تھا، اس کو ایک مکمل اور منضبط کتاب کی شکل میں ڈھال دیا، جس اجمال کی قدرے تفصیل کی ضرورت سمجھی اس کی تفصیل کی، اور جن مضامین کا اضافہ ضروری اور مفید محسوس کیا اُن کا اضافہ کیا۔ اس طرح یہ کتاب مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے اور اُن غیر مسلموں کیلئے بھی جو اسلام کو کسی حد تک علمی وعقلی اور عملی طور پر سمجھنا چاہتے ہیں، ایک رہنما اور معلّم کتاب بن گئی، کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عام فہم ہونے کے ساتھ اس میں دین کی صحیح فہم، مطالعہ اور صحبت کا نچوڑ آ گیا ہے، اسی کے ساتھ اس میں توازن، حقیقت پسندی بھی ہے، اور وہ مولانا کی عمومی تحریری خصوصیت کے مطابق حشو وزائد سے پاک ہے، مولانا نے تفہیم کیلئے بعض ذاتی واقعات اور دقیق حقائق سمجھانے کے لیے بعض مکالمے بھی نقل کئے ہیں، جدید ذہن اور لٹریچر کو سامنے رکھتے ہوئے بعض ایسے مضامین بھی آ گئے ہیں جو عقائد کی ''عرفی'' کتابوں میں نہیں ملیں گے، مثلاً وحدتِ اَدیان کے فتنہ کا رد، منکرین حدیث کی گمراہی کا بیان، اہل السنۃ والجماعۃ کے بنیادی امتیاز کا اظہار، نئے زمانے کے نئے بتوں کا تذکرہ، نفس پرستی پر ضرب، اعجاز قرآن پر مختصر لیکن مفید بحث، ارکان اربعہ کی اصل روح اور مقصد کی توضیح۔

اس سلسلہ میں مولانا نے ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نماز کا تعلق اللہ کی صفت حاکمیت سے بھی ہے اور محبوبیت سے بھی اور نماز ایمان کا خارجی وجود ہے، نیز یہ کہ ارکان میں حقیقت پیدا کرنے کی کوشش احیاءِ دین کا بنیادی کام ہے، وہ امراض کی نشاندہی کے ساتھ تدبیر وعلاج بھی بتاتے چلتے ہیں۔ بعض قدیم ودقیق کلامی مسائل کی بڑی خوبی

---

؎ الحمدللہ یہ سلسلہ تکمیل کو پہونچ کر ۵ جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ (حسان نعمانی)

سے تلخیص وتسہیل کی ہے، مثلاً رویتِ باری، جبروقدر کا مسئلہ، آخرت کی ضرورت، اور یہ کہ جزاوسزا اس دنیا میں کیوں نہیں دی جاتی، سلف صالحین کے اتباع کی کیا اہمیت ہے؟ خلافت راشدہ کی عظمت وانفرادیت، سیاست وحکومت کے بارے میں متوازن ومعتدل نقطۂ نظر اور جامع گفتگو۔

کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں (بہت سی اصلاحی و دعوتی کتابوں کے برخلاف) اخلاق کی اہمیت، معاملات ومعاشرت، دین کی خدمت ونصرت، جہاد فی سبیل اللہ، دعوت حق، امر بالمعروف نہی عن المنکر پر پورا زور دیا گیا ہے اور ان پر مستقل ابواب اور مضامین ہیں، آخر میں احسان وتصوف کی بحث ہے، اس سلسلہ میں تصوف کے اغلاط کی نشاندہی بھی کی گئی ہے اور طالبین کے لیے لائحہ عمل مرتب طریقہ پر پیش کر دیا گیا ہے، اس طرح اس کتاب نے دین کی تفہیم اور اسلام کی ضروری تعلیم کے ساتھ، ایک مختصر لیکن جامع رہنمائے زندگی کی حیثیت اختیار کر لی ہے، جس کو ایک مشغول ومتوسط درجہ کا آدمی اپنی زندگی کا دستور عمل بنا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ بڑی خوبی یہ ہے کہ اسلام کو سمجھنے کے لیے کسی طالب حق غیر مسلم کے ہاتھ میں اس کا انگریزی ترجمہ بے تکلف دیا جا سکتا ہے۔[1]

اب جبکہ مصنف کی نظر ثانی اور کچھ اضافات وترمیمات کے بعد اس کا جدید ایڈیشن شائع ہونے کو جا رہا ہے، راقم سطور ان چند سطور کے لکھنے کی (جن کو اس سے بہت پہلے لکھنا چاہیے تھا) سعادت حاصل کر کے اس کارِ خیر میں برائے نام شرکت حاصل کر رہا ہے۔

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہ حسنی

۸ر جمادی الاولیٰ ۱۴۰۴ھ، ۱۱ر فروری ۱۹۸۴ء

---

[1] اس کا انگریزی ترجمہ Islamic Faith & Practice کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔
(حسان نعمانی)

# شکرِ نعمت اور پیش لفظ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

رَبِّ اَوۡزِعۡنِیۡۤ اَنۡ اَشۡکُرَ نِعۡمَتَکَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ
وَاَنۡ اَعۡمَلَ صَالِحًا تَرۡضٰىہُ وَاَدۡخِلۡنِیۡ بِرَحۡمَتِکَ فِیۡ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیۡنَ [1]

رب العزت جلّ جلالہٗ وعمّ نوالہٗ کے انعامات واحسانات اپنے اس سیاہ کار بندہ پر بے حد وبیشمار ہیں اور ان میں سب سے بڑا انعام واحسان یہ ہے کہ محض اپنے فضل سے اس نے ایک اسلامی گھرانے میں پیدا فرما کر مجھے پیدائشی مسلمان بنایا اور پھر میرے مرحوم والد ماجد کو توفیق دی کہ دنیوی تعلیم اور اس کے ذریعہ دنیوی ترقی کے خاص امکانات وترغیبات بلکہ بعض خاص سہولتیں حاصل ہونے کے باوجود انھوں نے محض جذبۂ خدا طلبی کے تحت میرے بارے میں یہ فیصلہ کیا کہ دین کی خدمت کے لیے میں علمِ دین حاصل کروں، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم اور والد مرحوم کی نیت کی برکت سے مجھے علمِ دین کا کچھ حصّہ عطا بھی فرما دیا، پھر اُس نے دین کی ٹوٹی پھوٹی خدمت کی بھی کچھ توفیق دی۔

من آں خاکم کہ ابرِ نو بہاری　　　کند از لطف بر من قطرہ باری

---

[1] ''اے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ تیری اُن نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائیں اور توفیق دے کہ ایسے نیک عمل کروں جن کو تیری رضامندی حاصل ہو اور اپنی رحمت سے مجھے اپنے نیک بندوں میں شامل فرما''۔ (قرآن مجید میں سورہ نمل میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی یہ دعا نقل فرمائی گئی ہے)۔

اگر بر روید از تن صد زبانم    چو سوسن شکر لطفس کے توانم

اسی سلسلہ کا ایک خاص احسان وانعام یہ بھی ہے کہ اس نے چھوٹی بڑی متعدد ایسی کتابیں میرے قلم سے لکھوائیں، جو اس کے بندوں کی دینی اصلاح کا بہانہ بنیں۔ ان سب کتابوں کو اللہ کے فضل سے یہ قبولیت تو اس دنیا ہی میں نصیب ہوگئی کہ دینی حلقوں میں عام طور سے اُن کو پسند کیا گیا اور نافع اور مفید سمجھا گیا، نیز اُن کی اشاعت بھی بفضلہٖ تعالیٰ اس سے بہت زیادہ ہوئی جتنی کہ مجھ جیسے بے ہنر اور بے سلیقہ مصنّف کی کتابوں کی ہونی چاہیے اور آخرت میں بھی ان کی قبولیت کی میں اپنے ربّ کریم کے رحم وکرم سے امید رکھتا ہوں اور دعا کرتا ہوں۔ اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْنِی بِدُعَائِکَ شَقِیًّا۔

میری ان کتابوں میں اللہ تعالیٰ نے خاص کر ''اسلام کیا ہے؟'' کو جو تاثیر اور قبولیت اس دنیا میں عطا فرمائی ہے اس کو دیکھتے ہوئے اس عاجز کو اس کی بڑی امید ہے کہ اِنْشَاءَ اللّٰه وہ آخرت میں بھی میری نجات اور مغفرت کا ذریعہ بن جائے گی۔

''اسلام کیا ہے؟'' کی قبولیت ونافعیت کا خاص ظاہری سبب میری نظر میں یہ ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کو خاصی حد تک جامع ہے اور اس کا طرز بیان سادہ اور زبان آسان ہے، لیکن چونکہ اس کے لکھتے وقت بیچارے سادہ دل، کم تعلیم یافتہ عوام ہی کو سامنے رکھا گیا تھا، اس لیے اس میں مشکّکین کے شکوک وشبہات اور اہلِ زیغ کے خیالات سے بالکل تعرض نہیں کیا گیا تھا۔

''اسلام کیا ہے؟'' کی اشاعت کے کچھ ہی دنوں بعد سے مجھے خیال تھا کہ ایسی ہی جامع اس سے آگے کے درجہ کی ایک کتاب اور تیار ہونی چاہئے جس میں اسلامی اصول وتعلیمات کو اس طرح پیش کیا جائے کہ دلوں سے عہد حاضر کے ملحدانہ شکوک وشبہات اور اہل زیغ وضلال کے مغالطات وتحریفات کی بھی صفائی ہو اور اس کے ذریعہ علم دواقفیت کے ساتھ دین وشریعت کے بارے میں ذہنوں کو بصیرت اور قلوب کو یقین واعتماد اور سلف صالحین

کے اختیار کیے ہوئے مسلکِ اہلسنّت کے بارے میں اطمینان بھی ہوتا چلا جائے۔

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس عاجز کے نزدیک —— واللہ اعلم بحقیقۃ الحال —— اسی آرزو کی عملی شکل ہے۔ اس کی ترتیب و تالیف کی تاریخ بھی قابل ذکر ہے۔

۱۳۷۲ھ کے شروع میں، لکھنؤ کے ہمارے دینی دوستوں اور رفیقوں نے آٹھ دن کا ایک تعلیمی و تربیتی پروگرام بنایا اور میرے ذمہ اس سلسلہ میں یہ کام کیا کہ "دین و شریعت" کے عنوان پر روزانہ ایک گھنٹہ تقریر کر دیا کروں اور اس کی کوشش کروں کہ آٹھ تقریروں میں "دین و شریعت" کے تمام شعبوں پر ایسی اصولی اور بقدر ضرورت تفصیلی روشنی پڑ جائے، جس سے اس کے بارے میں وہ بصیرت و اطمینان ہو سکے، جس کی فی زمانہ خاص ضرورت ہے، میں نے اپنی تقریروں کا نقشہ اسی مقصد کو سامنے رکھ کر مرتب کیا، اور مقررہ تاریخ آجانے پر ان تقریروں کا سلسلہ شروع ہو گیا، چھ دن کی تقریروں میں، میں نے اپنے نقشہ کے مطابق ایمانیات، عبادات، اخلاق، معاشرت و معاملات کے شعبوں پر گفتگو کی، لیکن اللہ کی مشیّت کہ چھٹے دن تقریر کے دوران ہی میں مجھے بخار ہو گیا، جس کی وجہ سے دین کے اُن شعبوں کا بیان بالکل رہ گیا جن پر میں ساتویں اور آٹھویں دن گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ یَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ۔

اس پروگرام کے سلسلہ کی تقریروں کے ساتھ ساتھ قلمبند ہونے کا بھی خاص انتظام کیا گیا تھا۔ جو چھ تقریریں میں نے کی تھیں، جب چند روز کے بعد صاف ہو کر نظر ثانی کے لیے میرے پاس آئیں تو میں نے محسوس کیا کہ اگر ان میں معمولی ترمیم کر کے ایک مستقل تصنیف کی شکل ان کو دی جائے اور میرے مریض ہو جانے کی وجہ سے جن شعبوں پر گفتگو نہیں ہو سکی، ان پر لکھ کر اس کی کمی کو پورا کر دیا جائے تو وہ کتاب تیار ہو جائے گی جس کی میں آج کل کے ذہین تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے "اسلام کیا ہے؟" کی اشاعت کے بعد سے ضرورت محسوس کر رہا تھا۔

جو چھ تقریریں قلمبند ہو کر میرے پاس آ گئی تھیں، نظر ثانی اور معمولی ترمیمیں کر کے اُن کو تو اسی زمانہ میں ''ماہنامہ الفرقان'' کی ایک خاص اشاعت میں ''دین و شریعت'' ہی کے عنوان سے شائع کر دیا گیا تھا، لیکن جو کام اس سلسلہ میں اس وقت رہ گیا تھا، دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے وہ برابر ٹلتا رہا، اب اللہ تعالیٰ کی توفیق سے وہ بھی انجام پا گیا، اور اب وہ اس مکمل کتاب کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ بِعِزَّتِهٖ وَجَلَالِهٖ تَتِمُّ الصّٰلِحَات۔

جو مقالہ میری چھ تقریروں سے مرتب ہو کر ''دین و شریعت'' ہی کے عنوان سے ۲۷ھ میں الفرقان کی ایک خاص اشاعت میں شائع ہوا تھا وہ بھی اس میں لے لیا گیا ہے، لیکن اس میں جا بجا کئی کئی صفحے کے اضافے اور کافی ترمیمیں کی گئی ہیں اور آخر میں ''دین کی خدمت و نصرت'' اور سیاست و حکومت'' اور احسان و تصوف'' کے شعبوں پر جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ مستقل اضافہ ہے اور وہ کتاب کا ایک تہائی حصّہ ہے۔

یہ عاجز اس کتاب کی تالیف کو بھی اللہ تعالیٰ کا خاص انعام سمجھتا ہے اور امید رکھتا ہے کہ انشاء اللہ ناظرین کو اس کے مطالعہ سے ''دین و شریعت'' کے بارے میں ذہنی بصیرت بھی حاصل ہوگی اور قلبی اطمینان بھی اور عمل کا شوق و جذبہ بھی۔ اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوگا۔ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ!

## چند ضروری باتیں:

(۱) اس کتاب میں کہیں تقریر کا انداز محسوس ہوگا اور کہیں تصنیف و تحریر کا، لیکن اس کتاب کی تیاری کی جو تاریخ اوپر ذکر کی جا چکی ہے اس کے بعد اس سلسلہ میں کسی وضاحت اور معذرت کی ضرورت نہیں، ابتدائی حصہ میں یعنی ایمانیات اور عبادات کے بیان میں تقریر کا رنگ کہیں کہیں زیادہ نمایاں ہے، اسی کا یہ نتیجہ ہے ان مقامات پر سلسلہ کلام، موضوع کا بہت زیادہ پابند نہیں رہا ہے، مثلاً نبوت و رسالت کے بیان میں انبیا علیہم السّلام کے اجتہاد

کے ذکر کے ساتھ ائمہ مجتہدین کے اجتہاد کا بھی ذکر آ گیا ہے، اسی طرح معجزہ کی بحث میں کرامت کا اور پھر اولیاء اللہ کا اور اُن کے مقام اور اُن کے حقوق کا بھی ذکر آ گیا ہے اور تقریر کی روانی میں ایسا ہونا بالکل قدرتی ہے اور اصولاً صحیح بھی ہے۔

(۲) ''دین کی خدمت و نصرت'' کے شعبہ پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کے لکھتے وقت میں نے دین کی خدمت کرنے والی اس دور کی کسی جماعت اور حلقہ کو سامنے نہیں رکھا ہے، بلکہ اس شعبہ سے متعلق دین کے جو مطالبات اور جو اصول و احکام ہیں اور اللہ و رسول کی طرف سے جو تاکیدیں اور ترغیبیں ہیں بس ان کو ایک خاص ترتیب سے مرتب کر کے پیش کرنے کی کوشش ہے۔

(۳) اسی طرح ''سیاست و حکومت'' کے بیان میں کسی خاص ملک کی سیاست و حکومت کو سامنے نہیں رکھا گیا ہے، بلکہ اس شعبہ سے متعلق اسلام کی اصولی تعلیمات و ہدایت کا ذکر کیا گیا ہے اور ''اسلامی اقتدار'' اور ''غیر اسلامی اقتدار'' کے علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں کے احوال و امکانات کے اختلاف کی وجہ سے دین کے احکام و مطالبات میں جو فرق پڑ جاتا ہے بس اصولی درجہ میں اس کو ظاہر کیا گیا ہے، خاص خاص ملکوں کے سیاسی مسائل (جن کی نوعیت دوامی نہیں بلکہ وقتی ہوتی ہے) ان سے تعرّض کتاب میں مناسب بھی نہیں تھا، ان مسائل و مباحث کی مناسب جگہ مجلاتی مضامین و مقامات ہیں۔ ہاں! سیاست و حکومت کے شعبہ ہی سے متعلق ایک بات بطور استدراک کے یہاں لکھنی ضروری ہے، کتاب مکمل ہو جانے کے بعد اس بیان کو پڑھا تو محسوس ہوا کہ یہ بات اس میں جتنی صفائی اور صراحت سے آنی چاہیے تھی، نہیں آئی ہے کہ اسلام چونکہ صرف عقائد و عبادات ہی کا داعی نہیں ہے بلکہ وہ پوری انسانی زندگی کی تنظیم خدا پرستی اور روحانیت و مادیت کے صحیح توازن کی بنیاد پر کرنے کا علمبردار ہے اور یہ کام بغیر حکومتی اقتدار کے پورے طور سے انجام نہیں پا سکتا اس لیے حکومت بھی اسلام کے نظام و پروگرام کا ایک اہم جز ہے اور یہ مسلمان کا

دین وایمان ہے، لیکن اس کا یہ تقاضا ہرگز نہیں ہے کہ جس علاقہ میں اقتدار اسلامی نہ ہو، وہاں رہنا مسلمان کے لیے جائز ہی نہ ہو، یا کاروبار حکومت سے الگ رہنا اس کے لئے ضروری ہو، بلکہ اس کا فیصلہ دین وشریعت کی روشنی میں مختلف احوال میں مختلف ہوگا۔ غیر اسلامی حکومتوں کے حالات ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے شرعاً ان میں شرکت وتعاون کی گنجائش ہی نہ ہو، اور ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ اشتراک وتعاون ہی میں اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت ہو، اصل بات بس یہ ہے کہ جو کچھ ہو دین وشریعت کی روشنی میں اور اس کی قائم کی ہوئی حدود کا پابند رہ کر ہو اور دنیا طلبی کے تحت نہ ہو، بلکہ خدا طلبی کے تحت ہو۔

(۴) ''احسان اور تصوف'' کے موضوع پر جو کچھ اس عاجز نے لکھا ہے وہ دراصل اپنے بزرگوں سے سنی سنائی، یا ان کی کتابوں میں دیکھی بھالی باتیں ہیں، ورنہ میں اپنی آرام طلبی اور بے عملی کی وجہ سے اس دولت سے محروم ہوں، ہاں اس دولت والوں کو دیکھا اور پایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اُن کی محبت بھی دی ہے۔ بس حدیث نبویؐ ''اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ'' میرا سہارا ہے۔

اُحِبُّ الصَّالحِينَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ      لَعَلَّ اللّٰه يَرْزُقُنِي صَلَاحًا

(۵) آیتوں اور حدیثوں کے ترجموں میں، میں نے لفظی ترجمہ اور نحوی ترکیب کی پابندی نہیں کی ہے، بلکہ ناظرین کی سہولتِ فہم کے لیے اکثر آزاد ترجمہ کیا ہے اور بس مطلب ادا کر دینا پیش نظر رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کو دنیا میں قبولیت ونافعیت عطا فرمائے اور آخرت میں اس کو میرے لیے ذریعۂ مغفرت ورحمت بنائے اور میرے تمام دینی مربّیوں، محسنوں کے حسنات میں اس کتاب کو بھی شامل فرمائے۔ وَمَاهُوَ عَلَيْهِ بِعَزِيْزٍ ٥

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

صفر ۱۳۷۸ھ (دسمبر ۱۹۵۸ء)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

# دین وشریعت کی بنیاد اور اس کے دو حصّے

## اعتقادی وعملی!

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دین اسلام اور اسلامی شریعت کی بنیاد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم وہدایت پر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علوم اور احکام آپ لائے، جو قرآن مجید میں اور حدیثوں میں محفوظ ہیں وہی دین اسلام کی اُساس اور بنیاد ہیں، پھر اِن میں سے کچھ کا تعلق اعتقاد سے ہے اور کچھ کا اعمال سے۔ یعنی آپ کی لائی ہوئی ہدایت میں ایک حصّہ تو وہ ہے جس میں کچھ ایسی حقیقتوں کی اطلاع دی گئی ہے جن کو ہم ازخود نہیں جان سکتے تھے اور ہم کو یہ حکم ہے کہ ان حقیقتوں کو ہم مانیں اور ان پر ایمان لائیں۔ یہ اسلام کا ایمانی اور اعتقادی حصّہ ہے اور یہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اور دوسرا حصّہ وہ ہے جس میں عملی زندگی کے متعلق احکام ہیں کہ یہ کام کرو اور یہ نہ کرو، یہ اسلام کا عملی حصّہ ہے۔ اور پھر اس میں بہت سے شعبے ہیں:۔ مثلاً عبادات کا شعبہ، اخلاق اور آداب کا شعبہ، معاملات کا شعبہ، معاشرت کا شعبہ، دین کی دعوت ونصرت کا شعبہ، سیاست وحکومت کا شعبہ وغیرہ وغیرہ۔ اسلام ان سب کو حاوی ہے، اور یہ سب اس کی شاخیں ہیں۔

آئندہ اوراق میں انشاء اللہ اسلام کے ان سب شعبوں کے متعلق اصولی اور ضروری باتیں بیان کی جائیں گی۔

سب سے پہلے ایمانی اور اعتقادی حصّے کے متعلق کچھ عرض کیا جاتا ہے:

## ایمان:

پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ دین وشریعت کی خاص اصطلاح میں ایمان اِس کو کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول کو اللہ کا رسول مانا جائے، اور یقین کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ ہماری ہدایت کے واسطے وحی کے ذریعہ ان کو بہت سی وہ باتیں بتلاتا ہے، جو ہم آنکھ کان وغیرہ اپنے علمی ذرائع سے معلوم نہیں کر سکتے، اور اس بناء پر اُن کی اُن سب باتوں کی تصدیق کی جائے، جو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچائیں، اور اُن پر یقین کیا جائے، اور اُن کے لائے ہوئے دین کو دینِ حق کی حیثیت سے قبول کیا جائے۔ پس کسی آدمی کے مومن ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ان سب باتوں کو حق مانے جن کی اطلاع اللہ کے پیغمبر دیں، اگر ان میں سے کسی ایک چیز کا بھی کسی نے انکار کیا تو وہ مومن نہیں ہوسکتا، مثلاً اگر کوئی شخص کہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا رسول بھی مانتا ہوں اور آپ نے اللہ کی توحید اور اُس کی صفات کے بارے میں جو کچھ بتلایا ہے اُس کو بھی میں حق مانتا ہوں، لیکن قیامت اور جنّت دوزخ کے متعلق جو کچھ آپ نے اطلاعات دی ہیں (جو ہم قرآن وحدیث میں پڑھتے ہیں) اُن کو میری عقل قبول نہیں کرتی، لہٰذا میں اس کو تسلیم نہیں کرتا، تو ایسا شخص مومن نہیں ہوسکتا۔

الغرض ایمان اس کا نام ہے، کہ "**کل ماجاء به الرسول من عند الله**" کی تصدیق کی جائے یعنی ان سب باتوں کو حق مانا جائے اور قبول کیا جائے جو پیغمبر، اللہ کی طرف سے پہنچائے اور بتلائے۔[1]

## عقائد اور ایمانیات:

اس کے بعد معلوم ہونا چاہیئے کہ جن باتوں پر ایمان لانے اور اعتقاد رکھنے کا اہم

---

[1] جو لوگ اللہ کے کسی پیغمبر کی حیاتِ مقدسہ میں براہ راست ان کی زبان سے اُن کی ہدایت اور تعلیم سُنیں اُن کے لئے تو ان کی ہر اُس بات کی تصدیق شرطِ ایمان ہے، جو وہ پیغمبر اُن کے سامنے اللہ کی طرف سے بیان کریں، اگر وہ اُن کی ایسی ایک بات کا بھی انکار کریں گے تو مومن نہ رہیں گے، لیکن جب پیغمبر دنیا میں نہ رہیں تو صرف اُن باتوں کی تصدیق کرنا شرطِ ایمان ہے جن کا ثبوت ان پیغمبر سے ایسے یقینی قطعی اور بدیہی طریقہ سے ہو جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو، دین کی ایسی تعلیمات کو خاص علمی اصطلاح میں ضروریاتِ دین کہتے ہیں، ان سب پر ایمان لانا شرطِ ایمان ہے، اگر ان میں سے کسی ایک کا بھی کوئی انکار کرے تو مومن نہیں رہے گا، اور اگر وہ پہلے مسلمان تھا تو اسلام سے اُس کا رشتہ کٹ جائے گا۔ ۱۲

سے مطالبہ کیا گیا ہے، اُن میں سے کچھ کا تعلق اللہ کی ذات وصفات سے ہے اور کچھ کا تعلق دوسری چیزوں سے ہے، مثلاً:۔ رسولوں سے، ملائکہ سے، قیامت سے۔

ہم پہلے دین کے اُس ایمانی اور اعتقادی حصّے کو لیتے ہیں جس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے، کیونکہ مقصدی حیثیت سے یہی حصّہ سب سے زیادہ اہم ہے۔

## اللہ تعالیٰ کی ہستی:

اس سلسلہ میں سب پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کو مانا جائے، یعنی اِس پر یقین کیا جائے کہ اِس ساری کائنات کی پیدا کرنے والی اور عالم کے اِس کارخانہ کو چلانے والی ایک ہستی ہے اور وہ اللہ ہے۔

یہاں ایک بات یہ بھی سمجھ لینی چاہئے کہ تاریخ سے اور دنیا کی مذہبی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا عقیدہ دنیا کی قوموں میں ہمیشہ سے رہا ہے، یعنی اتنی بات ہر زمانہ میں اور تمام قوموں میں مانی جاتی رہی ہے کہ اس دنیا کا کوئی پیدا کرنے والا ہے، اور وہ بڑی طاقتوں والا ہے، اور غالبًا یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں آنے والے جن پیغمبروں کا ذکر کیا گیا ہے اُن کی تعلیم اور دعوت کے سلسلہ میں توحید وغیرہ کا تو ذکر آتا ہے لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کے ماننے پر کوئی خاص زور دینے کی ضرورت سمجھی ہو۔

خود قرآن مجید کا رویہّ بھی یہی ہے کہ اللہ کی توحید اور اس کی صفات کے بیان سے تو وہ بھرا ہوا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اُس کا وجود منوانے پر اس میں اتنا زیادہ زور نہیں دیا گیا ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ ساری انسانی دنیا کا گویا یہ ایک مسلمہ مسئلہ رہا ہے اور انسانوں کی فطرت اگر بالکل مسخ نہ ہو جائے تو اس کائنات کے پیدا کرنے والے کی ہستی کا مسئلہ اُن کیلئے ایسا ہی فطری اور بدیہی ہے جیسا کہ اپنے وجود اور اپنی ہستی کا مسئلہ، اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے اس زمانہ میں بھی جس کو دہریت کا زمانہ کہا جاتا ہے، اُن مغربی مما لک میں بھی جو دہریت کا سرچشمہ سمجھے جاتے ہیں، خدا کے منکروں کی تعداد خدا کے ماننے والوں کے مقابلہ میں آٹے میں نمک سے زیادہ نہیں ہے، حتّٰی کہ روس جو خدا بیزاری اور خدا دشمنی کا

مرکز سمجھا جاتا ہے وہاں بھی خدا کے منکر خدا کے ماننے والوں کی بہ نسبت اقلیت میں ہیں۔[1]

بہر حال ہمارا خیال ہے کہ اسی لئے اس مسئلہ کو زیادہ قابل بحث نہیں سمجھا گیا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن پاک نے اس مسئلہ کو بالکل بے دلیل چھوڑ دیا ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اِس مسئلہ کے بالکل فطری اور بدیہی ہونے کی وجہ سے اس پر ایسی توجہ نہیں دی گئی جیسی کہ توحید پر یا صفات الٰہی پر دی گئی ہے، بلکہ سوچنے والوں کے لئے معمولی رہنمائی اور کچھ اشارے کر دینا کافی سمجھا گیا ہے، مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ط ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ٥ (الانعام۔ ع ۱۲)

بیشک اللہ ہی ہے پھاڑنے والا دانے اور گٹھلی کا، وہی نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے، اور نکالنے والا ہے مردہ کو زندہ سے، یہ سب کرنے والا اللہ ہی ہے، پھر تم کدھر بہکے جاتے ہو۔

مطلب یہ ہے کہ انسان برابر دیکھتے ہیں اور تجربہ کرتے ہیں کہ غلّہ کے کسی دانہ کو یا کسی پھل کی گٹھلی کو زمین میں دبا دیا جاتا ہے پھر وہ دانہ اور گٹھلی اندر ہی اندر پھٹتے ہیں، اور اُن میں سے ایک نہایت نرم ونازک ریشہ نکلتا ہے اور وہ سطح زمین کو چیرتا ہوا اوپر نکل آتا ہے، تو غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس دانہ کو یا گٹھلی کو زمین کے اندر کس نے قاعدہ سے شگاف دیا، اور کس نے اس بے جان اور سوکھے ہوئے دانہ یا گٹھلی میں سے وہ ہرا جاندار ریشہ یعنی اکھوا نکالا، پھر وہ ریشہ جو ریشم کے دھاگے سے بھی زیادہ نرم ہوتا ہے کس کی طاقت اور کارفرمائی سے زمین کو چیرتا ہوا اوپر نکل آیا؟ تو قرآن پاک کی اس آیت میں بتلایا گیا کہ بس سمجھ لو کہ یہ

---

[1] ابھی ۸؍جنوری ۱۹۵۳ء کے روزنامہ ''قومی آواز لکھنؤ'' میں جرمنی کے مشہور پروٹسٹنٹ چرچ لیڈر پاسٹرنی موئکر کا ایک بیان شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے اپنے روس کے حالیہ دورے کے تاثرات اور مشاہدات بیان کئے ہیں، اس کے دو فقرے یہ ہیں ''اندازاً اس وقت روس کی ۶۵ فیصدی آبادی گرجا گھروں سے متعلق ہے'' ''اس وقت خود ماسکو میں ۶۶ گرجا گھر موجود ہیں، اور ان کے علاوہ پورے سودیت یونین میں ۲۰ ہزار گرجا گھر قائم ہیں، اور گرجا گھر کے بڑے پادری سے لے کر معمولی راہبوں تک کو کلیساؤں کی ترقی کی اُمید ہے''۔ (قومی آواز ۸؍جنوری ۵۳ء صفحہ ۴ کالم ۱و۲) یہ بیان پاسٹرنی موئکر نے عالمی چرچ کونسل کی سنٹرل کمیٹی کے ممبران کے سامنے دیا ہے۔۱۲

سب کچھ اللہ کی قدرت سے، اور اُسی کی کارفرمائی سے ہوا، اور یہ سب کچھ اللہ ہی نے کیا۔ (اِنَّ اللّٰهَ فٰلِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ط) آگے فرمایا، اسی طرح تم دیکھتے ہو کہ ایک بالکل بے جان چیز میں سے جاندار چیز پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً بے جان انڈے میں سے بولنے چہکنے والی اور آسمان کی فضا میں اُڑنے والی چڑیا نکل آتی ہے اور بعض جاندار چیزیں بجائے جاندار بچہ جننے کے بے جان انڈا دیتی ہیں، اور پھر اُسی بے جان انڈے سے جاندار بچہ نکل آتا ہے۔

قرآن مجید انسان کے اس روزمرہ کے تجربہ اور مشاہدہ کو اس کے سامنے رکھ کر کہتا ہے کہ یہ سب کرشمے اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت کے ہیں اور یہ سب کچھ کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، پس جو لوگ قدرت خداوندی کی ان کھلی کارفرمائیوں کو دیکھنے کے باوجود اللہ کو نہیں جانتے، اور نہیں پہچانتے، اُن کی آنکھوں پر دے پڑے ہوئے ہیں، اور اُن کی عقلیں ماری گئی ہیں۔

اسی طرح ایک جگہ فرمایا گیا:

"وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ٥"

(ذاریٰت۔ع۔۱)

اور یقین لانے والوں کے لئے زمین میں ہماری نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں،
اور خود تمھارے اندر بھی ہیں، تو کیا تم کو دکھلائی نہیں دیتا۔

مطلب یہ ہے کہ انسان اگر اپنی بصیرت سے کام لے اور دیکھنا چاہے تو زمین میں ہماری ہستی اور ہماری قدرت کی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں، اور خود انسانوں کے وجود میں بھی ہماری کچھ نشانیاں موجود ہیں، ذرا انسان غور تو کرے کہ ماں کے رحم میں اس کی یہ حسین و موزوں صورت کس نے بنائی؟ کس نے دیکھنے والی آنکھ بنائی؟ کس نے سننے والے کان بنائے؟ کس نے ذائقہ لینے والی زبان اور سونگھنے والی ناک بنائی؟ کس نے اس کی زبان کو گویائی دی؟ کس نے ماں کے پستانوں میں اس کے لئے دودھ کی نہر جاری کی؟ کس کے قبضہ میں اس کی زندگی اور موت ہے؟ انسان اگر خود اپنے بارے میں اس طرح غور کرے، تو ہر سوال کا جواب خود اُس کی عقل یہی دے گی کہ یہ سب کچھ نظر نہ آنے والی ایک قدرت و حکمت والی ہستی نے کیا ہے اور وہی اللہ ہے۔

اور ایک جگہ بڑے عجیب سوالیہ پیرایہ میں فرمایا گیا:۔

"اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (ابراھیم۔ع۔۲)

کیا اُس اللہ کی ہستی میں کس کو شک ہوسکتا ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

یعنی جو شخص زمین کو دیکھتا ہے اور زمین پر جو کچھ ہوتا رہتا ہے اُس کو بھی دیکھتا رہتا ہے اور اوپر جو آسمان اور ستارے وغیرہ نظر آتے ہیں اُن کو بھی دیکھتا ہے، اُس کے لئے زمین وآسمان کے خالق کے بارے میں شک کرنے کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے؟

## خدا کی ہستی کے موضوع پر ایک دلچسپ گفتگو اور عام فہم استدلال

ایک دفعہ ایک ایسے صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے جو اللہ تعالیٰ کی ہستی کے بارے میں شک رکھتے تھے اور اُس پر بحث کرنا چاہتے تھے، راقم سطور نے اپنی جیب سے کاغذ کا ایک پُرزہ نکال کے اُن کے سامنے رکھتے ہوئے کہا، کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس کاغذ پر جو حروف لکھے ہوئے ہیں وہ کسی لکھنے والے نے نہیں لکھے ہیں، بلکہ آپ سے آپ لکھے گئے ہیں، تو کیا آپ میری اس بات کو مان لیں گے یا اس کا امکان بھی تسلیم کریں گے؟ انھوں نے کہا، نہیں، یہ بالکل ناممکن ہے پھر میں نے کہا اور اگر اسی طرح میں اپنی اس گھڑی کے متعلق آپ سے کہوں کہ یہ کسی بنانے والے نے بنائی نہیں ہے بلکہ آپ سے آپ یہ بن گئی ہے یا اپنے اس فونٹن پن کے بارے میں دعویٰ کروں کہ یہ کسی بنانے والے نے بنایا نہیں ہے بلکہ یوں ہی آپ سے آپ بن کر آسمان سے گر پڑا ہے، یا اگر کسی دوڑتی ہوئی موٹر کے متعلق میں آپ سے کہوں کہ اس کو کسی نے بنایا نہیں ہے بلکہ یہ آپ سے آپ بن گئی ہے اور کوئی ڈرائیور اس کو چلا نہیں رہا ہے بلکہ یہ آپ سے آپ دوڑ رہی ہے اور ہر موڑ پر خود ہی قاعدہ کے مطابق مُڑ جاتی ہے تو کیا آپ میری ان باتوں کو باور کرسکیں گے؟۔

اُن صاحب نے جواب دیا کہ اِن میں سے تو کسی بات کو بھی عقل تسلیم نہیں کرسکتی، میں نے اُن سے کہا کہ اللہ کے بندے! موٹر، فونٹن پن، اور گھڑی جیسی چیزوں کے متعلق تو

آپ کی سمجھ میں نہیں آ سکتا کہ یہ آپ سے آپ بن گئی ہیں، اور اس کاغذ پر لکھے ہوئے ٹیڑھے ترچھے اِن چند حروف کے متعلق بھی آپ کی عقل کسی طرح نہیں مان سکتی کہ یہ آپ سے آپ لکھے گئے ہیں، لیکن چاند، سورج جو ایک حیرت انگیز حکیمانہ نظام کے ساتھ چل رہے ہیں، اور ان سے بھی عجیب تر انسان کی ہستی، اُس کا دل و دماغ اور اُس کی آنکھیں اور اُس کے کان اور اس کی زبان، ان سب کے متعلق آپ کی عقل یہ مان سکتی ہے کہ یہ بغیر کسی کے بنائے آپ سے آپ یوں ہی بن گئے ہیں؟ پھر میں نے اُن سے کہا کہ جس طرح آپ کے نزدیک یہ بات بالکل بدیہی اور نا قابل بحث ہے کہ کاغذ کے اس پُرزہ پر جو کچھ لکھا ہوا ہے اُس سے کسی لکھنے والے نے لکھا ہے اور اس گھڑی اور فونٹن پن کو کسی بنانے والے نے ہی بنایا ہے اور موٹر بھی کسی کارخانہ میں بنی ہے اور اگر وہ چل رہی ہے تو یقیناً کسی چلانے والے کے چلانے سے چل رہی ہے۔ اسی طرح یہ بات اس سے بھی زیادہ بدیہی اور قطعًا نا قابل بحث ہے کہ چاند سورج اور انسان و حیوانات اور یہ ساری کائنات کسی حکیم و خبیر اور کسی کامل القدرۃ ہستی کی بنائی ہوئی ہے، اور اس میں شک اور حجت کرنا اپنی فطرت کے مسخ ہو جانے، یا عقل سے اپنے بالکل کورے ہونے کا ثبوت دینا ہے۔

بہر حال میرا خیال بلکہ یقین یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا مسئلہ چونکہ انسانوں کے لئے بالکل فطری اور بدیہی مسئلہ تھا، اس لئے قرآن پاک میں اس پر زیادہ بحث نہیں کی گئی، بلکہ مذکورۂ بالا قسم کے استدلالی اشارات کر دینا ہی کافی سمجھا گیا، اور یہی ہونا بھی چاہئے تھا، کیونکہ کسی بدیہی مسئلہ کو موضوعِ بحث و استدلال بنانا اور اُس پر لمبے چوڑے دلائل پیش کرنا اصولِ حکمت کے خِلاف ہے اور ایسا کرنے سے آسان مسئلہ خواہ مخواہ مشکل اور نظری بن جاتا ہے۔

الغرض اللہ تعالیٰ کی ہستی کا مسئلہ انسانی فطرت کے لئے شک اور بحث کے قابل ہے ہی نہیں، اور اسی لئے یہ گمراہی کبھی بھی انسانوں میں زیادہ نہیں پھیلی، بلکہ بسا اوقات تو ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ بظاہر خدا کا انکار کرنے والوں کو جب ٹٹولا گیا تو اندازہ ہوا کہ اُن کے بھی دل کے کسی گوشہ میں خدا کی ہستی کا اقرار چھپا ہوا موجود ہے۔

## توحید

ہاں! خدا کی توحید کا مسئلہ ایسا ہے جس میں بہت سی قومیں گمراہ ہوئی ہیں، اور اسی لئے تمام انبیاء علیہم السّلام کی دعوت اور تعلیم کا یہ خاص موضوع رہا ہے، اور قرآن مجید میں اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں تو اس مسئلہ کی ایسی تکمیل اور تفصیل کی گئی ہے کہ کوئی گوشہ نہیں چھوڑا گیا ہے، قرآن پاک میں اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں اس بارے میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اُس کو سمجھنے کے لئے پہلے ایک بات یہ سمجھ لینی چاہئے کہ شرک میں وہی شخص گرفتار ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی صفات کا صحیح علم نہیں ہوتا، اور جس کو صفاتِ خداوندی کا صحیح علم ہو جائے، اُس سے کبھی شرک نہیں ہو سکتا۔

مثلاً جو شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ ہی پیدا کرنے والا ہے، اللہ ہی پالنے والا ہے، اللہ ہی رزق دیتا ہے، اللہ ہی اولاد دیتا ہے، اللہ ہی مارتا اور جلاتا ہے، اللہ ہی تندرست اور بیمار کرتا ہے، اللہ ہی امیر یا غریب بناتا ہے، غرض اس دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے سب اللہ ہی کے حکم سے اور اُسی کے کرنے سے ہوتا ہے۔ سب اُس کے محتاج ہیں اور وہ کسی کا بھی محتاج نہیں ہے، تو جو شخص اللہ تعالیٰ کی ان صفات پر یقین رکھتا ہو، ظاہر ہے کہ وہ نہ اللہ کے سوا کسی سے اپنی حاجتیں مانگے گا، نہ کسی کی عبادت کرے گا، نہ کسی کو راضی اور خوش کرنے کے لئے نذریں اور منتیں مانے گا۔

## بیان توحید کا ایک طریقہ

تو قرآن شریف میں، اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں میں بھی توحید کو سمجھانے اور دل میں بٹھانے کے لئے ایک تو یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے، کہ اللہ کی صفات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، تاکہ بندے یہ جان لیں کہ جب اللہ کی ایسی شان ہے اور اس میں یہ سب صفتیں موجود ہیں، تو بس وہی بندگی اور عبادت کے لائق ہے۔

قرآن شریف کے اس طریقۂ تعلیم اور طریقۂ بیان کو سب سے پہلے آپ سورۂ فاتحہ میں دیکھئے! پہلے بندوں سے کہلوایا گیا:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝
ہر قسم کی حمد وستائش اُسی اللہ کے لئے ہے جو ساری کائنات کا رب اور پروردگار ہے،
بڑی رحمت والا اور نہایت مہربان ہے، انصاف کے دن کا مالک ہے، یعنی ایک
آنے والے دن میں اصلی جزا اور سزا وہی دینے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی یہ صفات بیان کرا کے آگے کہلایا گیا، کہ:۔

"اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ".

یعنی جب اللہ تعالیٰ ہی رب اور پالنے والا ہے، اور ہماری زندگی کی ساری ضرورتیں وہی مہیا کرتا ہے، اور وہ بڑی رحمت والا نہایت مہربان بھی ہے اور اِن صفاتِ جمال کے ساتھ وہی آخرت والی زندگی میں جزا اور سزا دینے والا صاحبِ جلال و جبروت حاکم بھی ہے، تو بس پھر اُسی کی عبادت ہم کریں گے، اور اپنی ضرورتوں میں صرف اُسی سے مدد مانگیں گے۔

## بیانِ توحید کا دوسرا طریقہ

اور کہیں بیانِ توحید کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے توحید کا ذکر کیا گیا اور یہ بیان فرمایا گیا کہ اللہ ہی عبادت اور بندگی کے لائق ہے اور بس وہی اِلٰہ اور معبود ہے، اور اس کے بعد بطور دلیل اور سند کے اللہ کی شان اور صفات بیان کی گئیں، مثلاً آیت الکرسی میں پہلے فرمایا گیا: "اَللّٰہُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" (اللہ کے سوا کوئی عبادت اور بندگی کے لائق نہیں) اور آگے اس کی صفات اور اس کی شان کو اس طرح بیان فرمایا گیا:۔

"اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ" یعنی وہی زندۂ جاوید ہے، اور اسی کی زندگی اپنی ذاتی زندگی ہے اور اس کے سوا جن کو زندگی ملی ہے وہ اسی کی دی ہوئی ہے، اور عارضی ہے اور وہی زندۂ جاوید ہستی اس ساری کائنات کو تھامے ہوئے اور سنبھالے ہوئے ہے (اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ کا یہی مطلب ہے) آگے فرمایا:۔

لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ" نہ اُسے اونگھ لگتی ہے، اور نہ نیند آتی ہے، یعنی وہ ہمہ وقت بیدار اور باخبر ہے، کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی بندہ اُس کی طرف اپنی کسی ضرورت

کے لئے متوجہ ہو، اور وہ اُس وقت اپنے آرام میں اور اُونگھ یا نیند کی حالت میں ہو، اُونگھ یا نیند جیسی چیزوں کا اُس کے پاس گذر ہی نہیں۔

''لَهٗ مَافِي السَّمٰوٰاتِ وَمَافِي الْاَرْضِ '' زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے اُسی کا ہے، وہی سب کا مالک و مختار ہے۔ آگے فرمایا گیا ہے:۔

مَنْ ذَالَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ '' کون ہے جو اُس کی بارگاہ میں اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش بھی کر سکے، یعنی کسی کی بھی یہ مجال نہیں۔

''یَعْلَمُ مَابَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَاخَلْفَهُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ اِلَّا بِمَا شَآءَ'' جو کچھ بندوں کے سامنے اور حاضر ہے وہ اُس کو بھی جانتا ہے، اور جو اُن کے پیچھے ہے اور اُن سے غائب اور اوجھل ہے وہ اُس سے بھی واقف ہے، اور مخلوقات اور بندوں کے علم کا حال یہ ہے کہ اللہ کے بے نہایت علم میں سے وہ کسی ایک چیز کو بھی پوری طرح نہیں جان سکتے، اِلّا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی اُن کو دینا چاہے، تو وہ بس اُسی کو اور اس کے بتانے کے بقدر ہی جان سکتے ہیں۔ آگے فرمایا گیا:۔

وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَلَا یَؤُدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ۔ اُس کا تختِ حکومت زمین و آسمان کی وسعتوں پر چھایا ہوا ہے، اور اُن کے تھامنے سے وہ تھکتا نہیں، اور وہ اونچی شان والا، بڑی عظمت والا ہے۔

جیسا کہ آپ نے دیکھا اس آیت الکرسی میں پہلے توحید کا ذکر کیا گیا:۔ (اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ) اور اس کے بعد اللہ کی وہ شان اور وہ صفتیں بیان کی گئیں جن کے جاننے کے بعد آدمی خود بخود اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ صرف یہی ہستی اِلٰہ و معبود ہے، اور عبادت اور بندگی صرف اِسی کا حق ہے۔

اِسی طرح سورۂ اخلاص میں پہلے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت بیان فرمائی گئی:۔ ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' یعنی کہو اور اقرار کرو، کہ وہ اللہ ایک ہے، یکتا ہے، اور اس کے بعد اس کی وہ صفات بیان کی گئیں جن کو جاننے کے بعد آدمی خود اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے، فرمایا گیا:۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ۔'' یعنی اللہ بے نیاز ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں ہے اور اس کے علاوہ سارے موجودات اس کے محتاج ہیں۔ ''لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ '' نہ کوئی اس کی اولاد، نہ وہ کسی کی اولاد۔ وَلَمْ یَكُنْ

لَهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۔'' اور کوئی اس کے برابر اور ہمسر نہیں۔

اِن چھوٹے چھوٹے جملوں میں اللہ کی جو شان اور صفت بیان کی گئی ہے اس کو جاننے کے بعد آدمی خود بخود یہ سمجھ سکتا ہے کہ اِلٰہ اور معبود بننے کے لائق صرف یہی ذات ہے جس کی شان یہ ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں، اور سب اس کے محتاج ہیں، اور نہ کوئی اس کی جنس ہے اور نہ کوئی اُس کے مانند اور ہمسر ہے۔

یہ ہم نے قرآن مجید کے بیانِ توحید کے متعلق ایک اصولی بات کہی ہے اس سے توحید اور قرآن مجید کے توحیدی مضامین کو سمجھنے کے لئے ایک راستہ کھُل جاتا ہے۔

## کم سے کم کس درجہ کی توحید معتبر ہے، اور ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کا ابتدائی مطالبہ کیا ہے؟

توحید کے متعلق اسی طرح کی ایک اصولی بات اور بھی سمجھ لینی چاہئے اور وہ یہ کہ توحید کا یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک ماننے کا ایک درجہ تو وہ ہے جس کو بہت سے مشرکین بھی مانتے ہیں لیکن قرآن مجید کے بیان کے مطابق وہ کافی نہیں، مثلاً اتنی بات کہ زمین و آسمان اور اس ساری کائنات کا پیدا کرنے والا اور بنانے والا ایک ہی ہے، ایسا نہیں ہے کہ کچھ چیزیں کسی نے پیدا کی ہوں، اور کچھ کسی نے۔ خود قرآن مجید میں جابجا اس کی شہادت موجود ہے کہ اتنی بات عرب کے مشرک بھی مانتے تھے۔

## قرآن مجید کا بیان کہ مشرکین عرب بھی ایک درجہ توحید کے قائل تھے:

لفظوں کے تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ کئی جگہ قرآن مجید میں یہ مضمون بیان فرمایا گیا ہے کہ اگر ان مشرکوں سے پوچھا جائے کہ بتلاؤ زمین و آسمان اور اِس ساری کائنات کو کس نے پیدا کیا؟ تو وہ کہیں گے اور اقرار کریں گے کہ اللہ نے:۔

''وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۔(عنکبوت۔ ع۔٦)

بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ یہ بھی مانتے اور اقرار کرتے تھے کہ اس سارے کارخانہ کو چلانے والا بھی اللہ ہی ہے، وہی روزی دیتا ہے، وہی مارتا اور جلاتا ہے، چنانچہ سورۂ یونس میں فرمایا گیا:۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ط فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ" (یونس۔ع۔۴)

"یعنی اے پیغمبر! آپ ان مشرکوں سے پوچھئے کہ بتاؤ کون تمھیں زمین و آسمان سے روزی دیتا ہے، اور کون کانوں اور آنکھوں کا مالک ہے، اور کس کا اِن چیزوں پر اختیار ہے، اور کون زندہ سے مُردہ کو اور مُردہ سے زندہ کو نکالتا ہے، اور کون ہے جو اس تمام کارخانۂ ہستی کا انتظام کر رہا ہے؟ تو آپ جب اُن سے پوچھیں گے تو وہ صاف کہیں گے کہ یہ سب کرنے والا صرف ایک اللہ ہے"!

بہرحال اتنی توحید کے قائل عرب کے مشرک بھی تھے۔

## پھر اُن کا شرک کیا تھا؟

تو اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ پھر اُن کا شرک کیا تھا؟

قرآن مجید ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ساری کائنات کا خالق و مالک اور مدبّر و منتظم یعنی اس پورے کارخانۂ ہستی کا چلانے والا ماننے کے باوجود یہ سمجھتے تھے کہ جن ہستیوں کو ہم دیوی اور دیوتا مانتے ہیں وہ اگرچہ اُسی اللہ کے پیدا کئے ہوئے اور مخلوق ہیں، لیکن ان کا اللہ سے ایسا خاص تعلق ہے، کہ اگر وہ کسی کو کچھ دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں، اور کسی سے کچھ چھیننا چاہیں تو چھین سکتے ہیں، کسی کو دولت دے کر امیر کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، کسی سے دولت چھین کر اُس بیچارہ کو غریب و فقیر بنانا چاہیں تو بنا سکتے ہیں، اسی طرح اگر کسی کو بیمار یا تندرست کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، کسی کو اولاد دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں۔ الغرض یہ مشرکین سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے خاص تعلق کی وجہ سے ہمارے اِن دیوتاؤں کو ایسے

جزوی کاموں کے اختیارات دے دیئے ہیں، اور اسی بناء پر وہ انھیں راضی اور خوش رکھنے کے لئے ان کی عبادت کرتے تھے، نذریں اور منتیں مانتے تھے، چڑھاوے چڑھاتے تھے، اُن کی مورتیوں کے گرد طواف کرتے تھے، اور اپنی ضرورتوں اور حاجتوں میں اُن سے مدد مانگتے تھے، تو قرآن پاک نے ان کے اسی خیال اور اسی طرز عمل کو شرک قرار دیا ہے، اور اکثر قوموں، ملکوں کے مشرکوں میں یہی شرک رہا ہے، ایسے مشرک دنیا میں غالباً بہت کم ہوئے ہیں جن کا عقیدہ یہ ہو، کہ اس دنیا کے پیدا کرنے اور چلانے میں اللہ کا کوئی ساتھی اور شریک ہے، اور جہاں تک ہمارے معلومات ہیں کسی مشرک قوم نے بھی اپنے معبودوں کو اللہ کے برابر نہیں سمجھا، اور جیسا کہ میں نے عرض کیا مشرکین عرب کے متعلق تو قرآن و حدیث میں صاف صاف اس کی شہادت موجود ہے، اور قرآن مجید ہی میں اُن کے اس طرز عمل کا تذکرہ کئی جگہ فرمایا گیا ہے، کہ جب وہ کشتی میں دریا کا سفر کرتے تھے، اور اُس کی موجیں خطرہ کی صورت پیدا کر دیتی تھیں تو وہ سب دیوتاؤں کو بھول جاتے تھے اور صرف اللہ ہی کو پکارتے تھے، اور اُسی سے آس لگاتے تھے، چنانچہ ایک جگہ فرمایا گیا:۔

"وَاِذَامَسَّکُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّا اِیَّاہُ"

(سورۂ بنی اسرائیل۔ ع۔۷)

"اور جب سمندر میں تم پر کوئی مصیبت اور آفت آتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے سِوا اپنے اُن سب دیوتاؤں کو بھول جاتے ہو جن کو تم دوسرے موقعوں پر پکارا کرتے ہو"

"وَاِذَا غَشِیَھُمْ مَوْجٌ کَالظُّلَلِ دَعَوُ اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ"

(سُورۂ لقمان۔ ع۔۴)

"اور جب سمندر کی موجیں بادلوں کی طرح اُن کو گھیر لیتی ہیں، تو اُس وقت وہ اپنے اعتقاد کو اللہ کے لئے خالص کر کے بس اُسی کو مدد کے لئے پکارتے ہیں"۔

بہرحال مشرکین عرب کے قول سے بھی اور عمل سے بھی یہ بات بالکل ظاہر ہے، کہ

وہ اپنے دیوتاؤں کو خدا کے برابر نہیں سمجھتے تھے، بلکہ خدا کو سب سے بالا اور برتر سمجھتے تھے، اور اپنے دیوتاؤں کو خدا کی مخلوق اور خدا کا مملوک جانتے تھے۔

## مشرکین عرب کا تلبیہ:

حدیث کی کتابوں میں مشرکین عرب کا تلبیہ بھی نقل کیا گیا ہے، جو وہ اپنے مشرکانہ حج میں پڑھتے تھے، اس کے آخری الفاظ یہ نقل کئے گئے ہیں:۔

"اِلَّا شَرِیکًا هُوَلَکَ تَمْلِکُهٗ وَمَامَلَکَ"۔ (ترمذی)

یعنی وہ اپنے حج کے تلبیہ میں اللہ تعالیٰ سے کہتے تھے، کہ:۔

"اے اللہ! ہم آپ کی بارگاہ میں حاضر ہیں، آپ کا کوئی شریک نہیں، ہاں ایسے شریک ہیں جو آپ کی ملکیت میں ہیں، آپ اُن کے مالک ہیں، اور جو کچھ ان کی ملکیت میں ہے اُس کے بھی آپ ہی مالک ہیں"۔

## مشرکین عرب کے شرک کی حقیقت اور قرآن میں اس کی تردید:

بہر حال مشرکین عرب کا شرک یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے معبودوں کو اللہ کی طرح دنیا کا خالق یا رازق سمجھتے ہوں، یا کسی حیثیت یا کسی صفت میں بھی اللہ کے برابر کہتے ہوں، بلکہ اُن کا شرک یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ساری کائنات کا خالق و مالک اور مدبّر و منتظم ماننے کے باوجود یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے تعلق اور تقرب کی وجہ سے ہمارے ان دیوتاؤں کو بھی کچھ جزوی اختیارات حاصل ہیں، اور یہ چاہیں تو بناؤ بگاڑ کر سکتے ہیں، اور اسی بنیاد پر یہ اُن کو خوش کرنے لئے اُن کی عبادت کرتے تھے، یعنی سجدہ اور طواف جیسے اعمال کرتے تھے، نذریں اور منتیں مانتے تھے، چڑھاوے چڑھاتے تھے اور اُن سے حاجتیں اور مُراد مانگتے تھے، بس اُن کا یہی خیال اور یہی عمل شرک تھا، اور اکثر مشرک قوموں میں اسی قسم کا شرک رہا ہے، اور اسی وجہ سے قرآن پاک میں اسی شرک کا رد زیادہ کیا گیا ہے، ایک جگہ فرمایا گیا:۔

"وَاتَّخَذُوا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝

وَلَا یَمْلِکُوْنَ لِاَنْفُسِہِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا یَمْلِکُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَیٰوۃً وَّلَا نُشُوْرًا" ——— (فرقان۔ع۔۱)

"اور اِن مشرکوں نے اللہ کے سوا ایسے معبود بنا لئے ہیں جو کوئی چیز بھی نہیں بنا سکتے، اور وہ خود اللہ کے بنائے ہوئے ہیں، اور دوسروں کا کیا ذکر، خود اپنے نفع نقصان پر بھی انھیں اختیار نہیں، اور نہ اِس دنیا کے مرنے جینے پر اور نہ حیات بعد الموت پر اُنھیں کوئی اختیار ہے، (یعنی اُن کے قبضہ اور اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے)"۔

اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

"قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ج لَا یَمْلِکُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَمَا لَہُمْ فِیْہِمَا مِنْ شِرْکٍ وَّمَا لَہٗ مِنْہُمْ مِنْ ظَہِیْرٍ"۔ (سبا۔ع۔۳)

اے پیغمبر! اِن مشرکوں سے کہئے کہ جن کو تم اللہ کے سوا مالک و مختار سمجھتے ہو وہ ایک ذرّہ کے بھی مالک نہیں، نہ آسمانوں میں نہ زمین میں، اور اُن میں اِن کا کوئی ساجھا بھی نہیں، اور نہ اُن میں سے کوئی اللہ کا مددگار رہے۔

یعنی زمین و آسمان کی کوئی ذرّہ برابر چیز بھی نہ تو ان کی ملکیت ہے، نہ اس کی ملکیت میں خدا کے ساتھ ان کی کوئی شرکت ہے، اور ایسا بھی نہیں ہے کہ بغیر ملکیت اور شرکت کے خدا اُن سے کسی معاملہ میں مدد لیتا ہو۔ اور سورۂ بنی اسرائیل میں ایک جگہ فرمایا گیا:۔

"قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِہٖ فَلَا یَمْلِکُوْنَ کَشْفَ الضُّرِّ عَنْکُمْ وَلَا تَحْوِیْلًا" (بنی اسرائیل۔ع۔۶)

"اے پیغمبر! ان مشرکوں سے کہئے کہ اللہ کے سوا جن کو تم نے مالک و مختار اور قابل عبادت سمجھ رکھا ہے، انھیں تمھاری کسی تکلیف کے دور کرنے اور ہٹا دینے کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے (یعنی یہ محض تمھاری خام خیالی ہے)"۔

اور سورۂ یونس کے آخری رکوع میں بڑے اہتمام اور بڑی تفصیل کے ساتھ فرمایا گیا ہے:۔

"قُلْ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ شَکٍّ مِّنْ دِیْنِیْ فَلَآ اَعْبُدُ
الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلٰکِنْ اَعْبُدُ اللّٰہَ الَّذِیْ
یَتَوَفّٰکُمْ وَاُمِرْتُ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ o وَاَنْ اَقِمْ
وَجْھَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا وَّ لَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ o وَلَا
تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَالَا یَنْفَعُکَ وَلَا یَضُرُّکَ فَاِنْ فَعَلْتَ
فَاِنَّکَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیْنَ o وَاِنْ یَّمْسَسْکَ اللّٰہُ بِضُرٍّ فَلَا
کَاشِفَ لَہٗٓ اِلَّا ھُوَ ج وَاِنْ یُّرِدْکَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِہٖ ط
یُصِیْبُ بِہٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ وَھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ" o

(یونس۔ع۔۱۱)

"اے نبیؐ آپ کہیے کہ اے لوگو! اگر تمھیں میرے دین کے بارے میں کوئی شک وشبہ ہے تو سُن لو، میں صاف صاف کہتا ہوں کہ میرا طریقہ اور میرا دین یہ ہے کہ اللہ کے سوا تم جن کی عبادت اور پرستش کرتے ہو، میں اُن کی عبادت نہیں کرتا، اور نہیں کروں گا، بلکہ میں صرف اللہ کی عبادت کرتا ہوں، اور کرتا رہوں گا، جو تمھیں موت دینے والا ہے، اور مجھے اُسی اللہ کا حکم ہے کہ میں ایمان والوں میں سے ہو جاؤں اور یہ کہ تم سیدھا کرو اپنا رُخ اللہ کی اطاعت اور عبادت کے لئے سب طرف سے یکسو ہو کر، اور ہرگز نہ ہو مشرکوں میں سے، اور نہ پکارو اللہ کے سوا اُن ہستیوں کو جو نہ تمھیں کوئی نفع پہنچا سکتی ہیں، اور نہ کوئی تکلیف دے سکتی ہیں اور اگر تم نے ایسا کیا تو پھر تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے، اور یقین کرو کہ اگر اللہ تمھیں کوئی تکلیف پہنچائے تو اللہ کے سوا کوئی اس کو دُور کرسکنے والا نہیں، اور اگر وہ تمھارے لئے کسی بھلائی کا ارادہ کرے، اور اپنی رحمت سے نوازنا

چاہے تو اُس کے فضل و کرم کو روک سکنے والا اور ہٹانے والا کوئی نہیں،
وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے نوازے، اور نصیب فرمائے،
وہ بہت بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے"۔

پس اِن آیتوں میں، اور ان کے علاوہ سیکڑوں آیتوں میں مشرکین عرب کے جس شرک کا ردّ کیا گیا ہے، وہ یہی ہے کہ وہ کچھ ہستیوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اگر چہ یہ اللہ کی مخلوق اور مملوک ہیں، لیکن خدا کے ساتھ ان کا ایسا تعلق اور اس کے کارخانہ میں ان کا ایسا عمل دخل ہے کہ یہ ہماری تکلیفیں دُور کر سکتے ہیں، اور دولت اور عزّت اور اولاد جیسی چیزیں ہمیں دے سکتے ہیں، اور اِسی عقیدے کی بنا پر وہ اپنی حاجتیں اُن سے مانگتے تھے، دُعائیں کرتے تھے، اور انھیں خوش کرنے کے لئے اُن کی عبادت کرتے تھے، یعنی جس طرح خدا کو راضی کرنے کے لئے اور اپنی عاجزی اُس کے سامنے ظاہر کرنے کے لئے اُس کی عبادت اور پرستش کی جاتی ہے، اِسی طرح وہ اپنے ان معبودوں کی بھی عبادت کرتے تھے، تو قرآن پاک نے ان کے اس عقیدہ کو بھی شرک قرار دیا، اور عبادت واستعانت کے ان کے عمل کو بھی، اور اُن کو دعوت دی کہ اللہ کے سوا کسی کو وہ نفع وضرر کا مالک ومختار اور اپنے اختیار اور ارادے سے متصرّف نہ سمجھیں، اور عبادت واستعانت میں اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔

## ان مشرکوں کے معبود کون تھے؟

یہاں ایک بات یہ بھی سمجھ لینی چاہئے کہ یہ ہستیاں کون تھیں جن کے متعلق یہ مشرک ایسا عقیدہ رکھتے تھے؟ اور جن کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر اُن سے دعائیں، اور اُن کی عبادت کرتے تھے؟۔

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مشرک لوگ یہ سارے معاملات پتھر کی مورتیوں ہی کے ساتھ کرتے تھے، لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ پتھر کی یہ مورتیاں اُن کی اصل معبود نہیں تھیں، بلکہ مشرکین کا یہ مشرکانہ عقیدہ اور مشرکانہ عمل اُن بزرگ روحوں اور اُن روحانی ہستیوں کے ساتھ تھا، جن سے یہ پتھر کے بُت منسوب تھے۔ قرآن مجید سُورۂ نوح میں قومِ نوح کے چند بتوں کے یہ نام آئے ہیں:۔ وَدّ، سُوَاع، یغوث، یعُوق، نَسر، اور ان کے متعلق

روایات میں ہے کہ دراصل یہ نام چند بزرگوں کے ہیں، جو واقعی بزرگ اور اہل اللہ تھے، جب وہ انتقال کر گئے، تو کچھ زمانہ کے بعد اُن کے عقیدت مندوں نے اُن کی یادگار کے لئے نشانی کے طور پر اُن کے مجسمے بنائے اور اُن کی تعظیم کرنے لگے، بعد کی نسلوں کو شیطان نے اُن کی عبادت کے راستہ پر لگا دیا، اِسی طرح مشرکین عرب جن بتوں کی پرستش کرتے تھے، وہ بُت بھی کچھ روحانی ہستیوں کی نشانی یا یادگار سمجھے جاتے تھے، اور دراصل عبادت اُن روحانی ہستیوں کی کی جاتی تھی، اور انھیں کو حاجت روا اور مشکل کُشا سمجھا جاتا تھا، جس طرح ہندوؤں میں مثلاً کرشن جی یا رام چندر جی کی مورتی کی پوجا کی جاتی ہے، تو عبادت اور پوجا اس مورتی کی مقصود نہیں ہوتی، بلکہ کرشن جی اور رام چندر جی کی شخصیت کی عبادت مقصود ہوتی ہے، اور اس مورتی کو اُن کے دھیان اور اُن کی پوجا کا ذریعہ بنایا جاتا ہے، اور اسی نسبت سے اس کا احترام کیا جاتا ہے، اور جس طرح کہ بہت سے مسلمان کہلانے والے جاہل تعزیوں پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں، اُن کو جُھک جُھک کر سلام کرتے ہیں، اور سُنا ہے کہ اُن پر عرضیاں تک لٹکاتے ہیں، اور اُن کے ساتھ وہ سب حرکتیں کرتے ہیں جو بُت پرست اپنے بتوں کے ساتھ کرتے ہیں، لیکن یہ تعزیہ دار اور تعزیہ پرست دراصل کاغذ اور بانس سے بنے ہوئے اُس تعزیہ میں کوئی غیبی طاقت اور قدرت نہیں سمجھتے، بلکہ وہ یہ سب کچھ امام حسینؓ کے نام پر کرتے ہیں، اور تعزیہ کو اُن کی نشانی اور یادگار سمجھتے ہیں، تو یہ بالکل وہی بُت پرستوں والی منطق ہے، ہاں بعض نہایت احمق قسم کے گنوار سُنا ہے ایسے بھی ہوتے ہیں جو بانس اور کاغذ سے بنے ہوئے تعزیہ ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، تو اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے مشرکوں میں بھی بعض اتنے احمق تھے جو اپنے ہاتھ کے تراشے ہوئے پتھر کے بتوں ہی کو حاجت روا سمجھتے تھے، اور اس لئے براہِ راست اُن ہی کی عبادت کرتے تھے چنانچہ قرآن مجید میں ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا:۔

"اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ"

"کیا تم پتھر کی ترشی ہوئی اُن مورتیوں کے معبود بناتے ہو جن کو خود تم نے اپنے ہاتھوں سے تراشا اور بنایا ہے"۔

تو ایسی آیتیں دراصل اُسی احمق طبقہ کے مشرکوں سے متعلق ہیں جو پتھر کے بتوں ہی میں کرشمہ سمجھتے تھے، اور اُن ہی سے اپنی حاجتیں مانگتے، اور اُن کی عبادتیں کرتے تھے اور جو مشرک اتنے احمق نہیں تھے، اور وہ پتھر کے بتوں کو اصل معبود نہیں سمجھتے تھے، بلکہ کچھ واقعی یا فرضی بزرگ رُوحوں اور رُوحانی ہستیوں کو نفع وضرر کا مختار اور حاجت روا سمجھتے تھے، اور اُن ہی کی دراصل عبادت کرتے تھے، اور بتوں کو صرف ان کی نشانی یا ان کی جلوہ گاہ سمجھتے تھے، اُن سے فرمایا گیا:۔

"اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ" (اعراف۔ع۔۲۴)

جن ہستیوں کی تم عبادت کرتے ہو وہ تو تمھاری ہی طرح ہمارے بندے ہیں۔

اور ایک دوسرے موقع پر سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا، کہ وہ تو خود ہمارے محتاج ہیں، ہمارے در کے بھکاری ہیں، اپنی ضرورتیں ہم سے مانگتے ہیں، ہمارے قُرب کے طلبگار رہتے ہیں، اور اس راستے میں برابر کوششیں کرتے رہتے ہیں، اور ہمارے رحم کے اُمیدوار اور ہمارے عذاب سے ترساں ولرزاں رہنے والے ہیں، آیت کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ"

(بنی اسرائیل۔ع۔۶)

پس اس قسم کی آیتوں میں اُن مشرکوں کے شرک کا رد کیا گیا ہے جو بتوں کو اصلی معبود اور حاجت روا نہیں سمجھتے تھے بلکہ کچھ مقرب رُوحانی ہستیوں کو ایسا سمجھتے تھے، اور بتوں کو ان کا نمائندہ یا اُن کی نشانی یا جلوہ گاہ سمجھتے تھے، اور افسوس ہے کہ یہی حال بہت سے مسلمان کہلانے والے جاہل تعزیہ پرستوں اور قبر پرستوں کا بھی ہے، وہ بزرگانِ دین کے متعلق اِسی قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں، اور اسی بنا پر اُن کی قبروں اور تعزیوں کے سامنے جھکتے، اور نذریں چڑھاتے ہیں۔

## یہ مشرک لوگ خدا کو سب سے بڑا اور اصل خالق و مالک ماننے کے باوجود دُوسروں سے کیوں اپنی حاجتیں طلب کرتے تھے؟

شرک اور مشرکوں کے سلسلہ میں ایک اور بات بھی یہیں سمجھ لینی چاہیے، بہت سوں کے

دل میں سوال پیدا ہوتا ہوگا اور پیدا ہونا چاہئے کہ یہ مشرک لوگ جب یہ جانتے اور مانتے تھے کہ ساری دنیا کا اصل خالق و مالک اور سارے کارخانۂ ہستی کا چلانے والا ایک اللہ ہی ہے اور جن کو وہ دیوی دیوتا اور حاجت روا و مشکل کشا سمجھتے ہیں وہ بھی اسی کے مملوک اور مخلوق ہیں، اور اگر ان کو کچھ اختیار بھی ہے تو وہ جُزوی ہی ہے اور کُلی اختیار صرف اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہ خدا موجود ہے اور اس سے بھی مانگا جا سکتا ہے تو وہ خدا کے ہوتے ہوئے اپنی حاجتیں اِن دیویوں دیوتاؤں سے کیوں مانگتے تھے، اور کیوں بجائے خدا کے اِن کی عبادت کرتے تھے؟۔

یہ سوال عرب کے پُرانے زمانہ کے مشرکوں کے متعلق بھی پیدا ہوتا ہے، اور ہمارے زمانہ کے مشرکوں مثلاً بت پرست ہندوؤں کے متعلق بھی پیدا ہوتا ہے، بلکہ مسلمان کہلانے والوں میں جو تعزیہ پرست اور قبر پرست قسم کے لوگ ہیں اُن کے متعلق بھی پیدا ہوتا ہے اور ہم نے اس پر بہت غور کیا ہے اور آخر میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ سب مشرکین یہ سمجھتے تھے اور سمجھتے ہیں کہ اللہ کو راضی اور خوش کرنا اور پھر اُس سے اپنے کام کرالینا تو بہت مشکل ہے کیونکہ اللہ تو جب راضی ہوگا، جب اُسکے بتلائے ہوئے سب مذہبی احکام پر چلا جائے، جھوٹ نہ بولا جائے، بے ایمانی نہ کی جائے، کسی کو دھوکا نہ دیا جائے، کسی کا حق نہ مارا جائے، سارے حرام اور ناپاک کاموں سے بچا جائے، اور پاک زندگی گذاری جائے اور یہ ان مشرکوں کے لئے بہت مشکل ہے، یہ تو ساری عمر پاپڑ بیلنا ہوا، اس لئے وہ خدا کو راضی کر کے اُس سے اپنے کام کرانے سے تو مایوس ہو گئے، اور اس کے سوا اُنھوں نے جن جھوٹی سچی واقعی یا فرضی ہستیوں کو حاجت روا اور نفع ونقصان کا مختار سمجھ رکھا ہے ان کے متعلق ان کا خیال ہے کہ ان کو صرف پانچ پیسے کے بتاشوں سے راضی کر کے یا ان کے سامنے بس ڈنڈوت اور سجدہ کر کے یا دو چار پیسے کے ہار پھول چڑھا کے اور ایک چراغ جلا کے سارے کام کرائے جا سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تو سارے شرک کی جڑ بنیاد یہی شیطانی دھوکہ ہے۔

## اس شیطانی دھوکے سے نکالنے کی قرآنی تدبیر

اللہ کی مخلوق کو شیطان کے اس فریب سے نکالنے کی صورت یہی ہے کہ انھیں یہ بتایا جائے کہ اللہ کے سوا کسی کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے، نہ پیدائش، نہ پرورش، نہ موت، نہ

حیات، نہ تندرستی، نہ بیماری، نہ امیری، نہ غریبی، نہ عزّت، نہ ذلت، بلکہ سب کچھ اللہ ہی اختیار میں ہے، اور وہی کسی کو کچھ دے سکتا ہے اور ساری کائنات اُسی کی محتاج ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا:۔

"قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ ط بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ٥ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ٥" (آل عمران۔ ع۔۳)

کہو، اے اللہ! سارے ملک اور ساری کائنات کے مالک! تو ہی ہے جس کو چاہے حکومت و بادشاہت دے، اور جس سے تو چاہے چھین لے، جسے تو چاہے عزّت دے، اور جسے چاہے رسوائی اور ذلت دے، ہر خیر اور ہر قسم کی بھلائی صرف تیرے ہی قبضہ اور اختیار میں ہے (اور صرف خیر اور بھلائی ہی نہیں بلکہ) ہر چیز (خواہ بھلی ہو یا بُری) تیری قدرت میں ہے، تو ہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور رات دن کا یہ نظام تیرے ہی چلانے سے چل رہا ہے، اور تو ہی زندہ کو مُردہ سے اور مُردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور جس کو تو چاہے بے حساب روزی دیتا ہے!

اور کہیں فرمایا گیا:۔

"بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ" (یٰسین۔ ع۔۵)

ہر چیز کا اختیار صرف اُسی کے ہاتھ میں ہے

کہیں فرمایا گیا:۔

"لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (شوریٰ۔ ع۔۲)

زمین وآسمان کے سارے خزانوں کی کنجیاں اُسی کے پاس ہیں۔

کہیں فرمایا گیا:۔

"مَایَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِکَ لَهَا وَمَا یُمْسِکْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ" (فاطر۔ع۔۱)

اللہ آدمیوں کے لئے جس رحمت کا دروازہ کھولے اور جو نعمت کسی کو دینا چاہے کوئی نہیں ہے اُسے روک سکنے والا، اور جو وہ نہ دینا چاہے، اور روکے، تو کوئی نہیں ہے اس کے بعد اس کو دے سکنے والا، اور جاری کرنے والا۔

قرآن مجید میں مشرکوں کو شرک سے بچانے کے لئے زیادہ تر یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے یعنی ان کو بتلایا گیا ہے کہ شیطان نے تمھیں یہ غلط باور کرا رکھا ہے کہ کسی اور کے ہاتھ میں بھی کچھ اختیار ہے، اور اللہ کے سوا اور بھی کوئی ایسی ہستی ہے جس کے قبضہ میں تمھارا بناؤ بگاڑ اور تمھاری حاجتیں ہیں، یہ شیطان کا نرا دھوکا ہے، تمھارا نفع نقصان اور تمھاری ساری حاجتیں اللہ کے اور صرف اللہ ہی کے قبضہ میں ہیں، لہذا بس اللہ ہی کو اپنا حاجت روا سمجھو اور جو مانگنا ہو اُسی سے مانگو، اور اُسی کی عبادت کرو۔

## توحید اور شرک سے متعلق دو اہم سوال

اس موقع پر دو باتیں اور بھی ایسی ہیں جن کا سمجھ لینا ضروری ہے، ایک یہ کہ عبادت کیا ہے؟ جس کا غیرُ اللہ کے لئے کرنا شرک ہے؟ اور دوسری بات یہ کہ اس عالم اسباب میں ہم بہت سے چیزوں سے نفع اُٹھاتے اور کام لیتے ہیں، جیسے پانی سے پیاس بجھاتے ہیں، آگ اور سورج سے روشنی اور گرمی حاصل کرتے ہیں، دوا سے شفا حاصل کرنا چاہتے ہیں، اسی طرح اپنے جیسے بہت سے آدمیوں سے ہم بہت سے موقعوں پر مدد لیتے ہیں، مثلاً حکیموں، ڈاکٹروں سے علاج میں مدد لیتے ہیں، مقدمات میں وکیلوں سے مدد لیتے ہیں، اسی طرح اپنے کاموں میں نوکروں مزدوروں سے مدد لیتے ہیں، علیٰ ہذا القیاس بہت سے غریب اور فقیر امیروں سے مدد کے اور اعانت کے طالب ہوتے ہیں، تو اس کی کیا حیثیت ہے، اور یہ شرک کیوں نہیں ہے؟ پہلے آپ دوسری بات کو سمجھ لیجئے!۔

## عالمِ اسباب کی چیزوں سے مدد لینا کیوں شرک نہیں؟

اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عالمِ اسباب میں جن چیزوں میں جو خاصیتیں اور جو تاثیریں رکھ دی ہیں، جیسے پانی میں پیاس بجھانے کی تاثیر، اور آگ اور سورج میں روشنی اور گرمی پہنچانے کی تاثیر، اور دوا میں مرض کو دُور کرنے کی تاثیر، تو سب جانتے ہیں کہ ان تاثیروں میں خود اُن چیزوں کا کوئی اختیار نہیں ہے بلکہ اللہ نے اُن کو ہمارے لئے مسخّر کر دیا ہے، اسلئے اُن سے کام لینے میں شرک کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، ان چیزوں کی حیثیت تو ہمارے خادموں کی ہے اور ان سے کام لینا ایسا ہی ہے جیسا کہ ہم اپنے جانوروں گھوڑوں اور گدھوں سے کام لیتے ہیں۔

اسی طرح جن بندوں کو اللہ نے کوئی ایسی قابلیت دے دی ہے، جس سے وہ دوسروں کو بھی کوئی نفع یا امداد پہنچا سکتے ہیں، جیسے حکیم، ڈاکٹر، وکیل وغیرہ، تو ان کے متعلق ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ ان میں کوئی غیبی طاقت نہیں ہے اور ان کے اپنے قبضہ میں کچھ بھی نہیں ہے اور یہ بھی ہماری ہی طرح اللہ کے محتاج بندے ہیں، بس اتنی بات ہے کہ اللہ نے انھیں اس عالمِ اسباب میں اس قابل بنا دیا ہے کہ ہم ان سے فلاں کام میں مدد لے سکتے ہیں، اس بناء پر اُن سے کام لینے اور اعانت حاصل کرنے میں بھی شرک کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، شرک جب ہوتا ہے جب کسی ہستی کو اللہ کے قائم کئے ہوئے اس ظاہری سلسلۂ اسباب سے الگ غیبی طور پر اپنے ارادہ اور اختیار سے کارفرما اور متصرّف سمجھا جائے، اور اس اعتقاد کی بناء پر اس سے اپنی حاجتوں میں مدد مانگی جائے، اور اُسے راضی کرنے کے لئے اُس کی عبادت کی جائے۔

## عبادت کسے کہتے ہیں؟

دوسرا سوال عبادت کے متعلق تھا، کہ عبادت کسے کہتے ہیں؟ عبادت دین اور شریعت کی ایک خاص اصطلاح ہے، کسی ہستی کو غیبی طور پر نفع وضرر کا مختار، اور حاجت روا سمجھ کر اُسے راضی اور خوش کرنے کے لئے اور اُسے کا تقرب حاصل کرنے کے لئے جو تعبدی

اور تعظیمی کام کئے جاتے ہیں، جیسے سجدہ، طواف، نذر، قربانی، اور اُس کے نام کی وظیفہ خوانی وغیرہ وغیرہ، تو ایسے اعمال کو دین کی خاص اصطلاح میں عبادت کہتے ہیں، اور یہ عبادت صرف اللہ کا حق ہے[1] اور جو کوئی کسی غیر کے ساتھ ایسا معاملہ کرے وہ بلاشبہ مشرک ہے۔ اور پہلے تفصیل سے بتلایا جا چکا ہے کہ اکثر مشرک قوموں کا شرک یہی رہا ہے کہ انھوں نے اللہ کے سوا بھی کچھ ہستیوں کو نفع و ضرر کا مختار سمجھا، اور ان کے راضی کرنے کے لئے عبادت کی قسم کے کام کئے، اور یہ شرک وہ ظلم عظیم ہے جس کی ہرگز معافی نہیں۔

## بعض چھوٹے درجہ کے شرک

یہاں تک ہم نے جس شرک کا بیان کیا ہے یہ وہ حقیقی شرک ہے، جس کے متعلق قرآن مجید میں اعلان فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے یہاں اس جرم کی قطعاً معافی اور بخشش نہیں ہے اور جو لوگ اس شرک کی حالت میں دنیا سے جا چکے، یا جائیں گے، اُن کے لئے اُسی طرح جہنّم کا ابدی عذاب ہے جس طرح کہ اللہ و رسول کے منکروں کے لئے ہے۔

لیکن شریعت میں بعض ایسی چیزوں کو بھی شرک کہہ دیا جاتا ہے جن میں اس درجہ کا حقیقی شرک تو نہیں ہے لیکن اس کا کچھ رنگ اور شائبہ ہے یا اُن سے اس شرک حقیقی کا اندیشہ ہے جیسے کہ بعض حدیثوں میں غیر اللہ کی قسم کھانے کو شرک فرمایا گیا ہے یا ٹونے ٹوٹکے کی قسم کی چیزوں کو شرک بتلایا گیا ہے، یا رِیا کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ تو اس سے وہ حقیقی شرک مراد نہیں ہے، بلکہ یہ اس سے کم درجہ کے شرک ہیں، اسی لئے "شِرْکٌ دُوْنَ شِرْکٍ"۔ علماء کی

---

[1] واضح رہے کہ اصل عربی زبان میں عبادت کے ایک معنی اطاعت و فرمانبرداری کے بھی ہیں، اور ان دونوں معنوں میں ایک کھلا ہوا اور عام فہم فرق یہ ہے کہ اصطلاحی عبادت اللہ کے سوا کسی کی بھی جائز نہیں، بلکہ مطلقاً شرک ہے اور شرک عظیم ہے، لیکن اطاعت مخلوق کی بھی جائز ہے، بلکہ بعض اطاعتوں کا خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی حکم ہے، مثلاً رسول کی اطاعت کا حکم ہے، اور اولوالامر کی اطاعت کا حکم ہے، اسی طرح اولاد کو ماں باپ کی اور بیوی کو شوہر کی خدمت و اطاعت کا حکم ہے۔ پس جو لوگ اصطلاحی عبادت اور عبادت بمعنی اطاعت کے اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے، اور دونوں کو گڈمڈ کر دیتے ہیں، وہ دین کی تشریح میں بہت بڑی غلطی کرتے ہیں، اس سے توحید اور شرک کے معنی ہی بدل جاتے ہیں۔ انشاء اللہ آگے عبادات کے بیان میں عبادت کے مطلب و مقصد پر مزید روشنی ڈالی جائے گی۔

ایک خاص اصطلاح ہے، جس کا مطلب یہی ہے کہ بعض شرک اس بڑے اور حقیقی شرک سے کم درجہ کے بھی ہیں، یہاں تک کہ اہل اللہ جن کی توحید کامل ہوتی ہے وہ تو دنیا اور دنیا کی چیزوں کی محبّت کو بھی شرک کہتے ہیں، اُن کے نزدیک حُبِّ مال شرک ہے، حُبِّ جاہ شرک ہے، بیوی بچوں کی وہ محبّت جو اللہ کیساتھ بندہ کے تعلق پر اثر ڈالے اور اللہ کی طرف سے غفلت کا باعث ہو، اُن کے نزدیک شرک ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ان چیزوں کو بُت پرستی کی قسم کا شرک کہتے ہیں، بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ یہ چیزیں توحید کے اصل مقام کے منافی ہیں۔

## نئے زمانہ کے نئے بُت

توحید اور شرک کے سلسلہ میں ایک چیز اور بھی قابل ذکر ہے، ہمارے اس زمانہ میں یورپ کے اثرات نے پُرانے زمانہ کے شرک سے تو لوگوں کو بہت کچھ بیزار کر دیا ہے، کیونکہ اس کی بنیاد محض توہم پرستی اور جہالت پر تھی، اب ہر پڑھا لکھا آدمی اگر اس میں ذرا بھی شعور ہو، اور اُس نے پڑھ لکھ کر کچھ بھی سوچنا سیکھا ہو، وہ بتوں کی پوجا کو، ستاروں، درختوں اور دریاؤں کی پوجا کو، اسی طرح جانوروں کی پوجا کو، انتہائی درجہ کی حماقت اور بیوقوفی سمجھتا ہے، چاہے رسمی طور پر یا اپنے قومی کلچر کا جز سمجھتے ہوئے وہ خود بھی ان چیزوں کی پوجا کرتا ہو، لیکن اس کا دل ضرور اس سے منکر ہو چکا ہے۔ لیکن اسی یورپ کے اثرات نے ان پُرانے اور دقیانوسی بتوں کے بجائے کچھ نئے بُت تراش کے دنیا میں پھیلا دیئے ہیں، اور آجکل ان ہی کی پوجا کا زور ہے، اِن بتوں کے نام ہیں:۔

قوم  وطن  قومی مفاد  وطنی مفاد  پیٹ

دولت  حکومتی اقتدار، وغیرہ وغیرہ۔

واقعہ یہ ہے کہ اپنی قوم اور اپنے وطن کی بہی خواہی اور اس سے محبت ہرگز کوئی بُری بات نہیں ہے، بلکہ بالکل فطری چیز ہے، اور ایک درجہ میں اس کا حکم ہے، اسی طرح قومی مفاد اور وطنی مفاد کا لحاظ، اور معاش کی فکر، دنیا میں راحت اور عزّت سے زندگی گذارنے کی خواہش، اگر اس میں حلال وحرام کی تمیز اور دوسروں کے حقوق کی رعایت ہو تو، ہرگز بُری چیز نہیں ہے، ایسے ہی کسی اچھے مقصد کے لئے مثلاً عدل وانصاف قائم کرنے کے لئے یا خلق اللہ کی خدمت کے ارادہ سے

حکومتی اقتدار حاصل کرنے کی فکر اور اس کے لئے کوشش کرنا ہرگز غلط چیز نہیں ہے، اور انبیاء علیہم السّلام نے ان باتوں سے کبھی نہیں روکا ہے بلکہ ان امور کے بارہ میں احکام دیئے ہیں۔

لیکن ہمارے اس زمانہ میں ان چیزوں نے اپنی حدود سے بہت آگے بڑھ کر ایک درجہ کے معبودوں اور طاغوتوں کا درجہ حاصل کرلیا ہے، اب قوم اور وطن کی مصلحت اور قومی اور وطنی مفاد کی خاطر سب کچھ کرلینا ایک اصول اور عقیدہ بن گیا ہے، اگرچہ اس میں کیسی ہی بے انصافی ہو، اور دوسروں پر اس کا کچھ ہی اثر پڑتا ہو، اسی طرح پیٹ اور دولت اور حکومت کی خواہش کو بھی اللہ کے احکام سے آزاد سمجھ لیا گیا ہے، گویا پیٹ ایک معبود ہے، جس کی جس طرح بھی پوجا کی جائے صحیح ہے، اسی طرح دولت اور حکومت گویا ایک دیوی ہے جس پر دین واخلاق کے سارے اصول اور احکام قربان کئے جاسکتے ہیں۔

آج بہت سے انسانوں نے ان ہی چیزوں کو گویا اپنا معبود بنالیا ہے، اور دنیا اس رَو میں بہی جارہی ہے، یہ وطن پرستی، قوم پرستی، شکم پرستی، دولت اور حکومت پرستی اس زمانہ کے نئے شرک ہیں، اور اسلامی توحید میں اِن کی کوئی گنجائش نہیں۔

ہمیں سب نئے پُرانے مشرکوں کو سامنے رکھ کر امام توحید سیّدنا حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے الفاظ میں کہنا چاہئے:۔

"اِنَّا بُرَآؤُا مِنۡكُمۡ وَمِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ" (سورۃ ممتحنہ۔ ع۔۱)

ہمارا کوئی تعلق نہیں تم سے اور تمھارے ان خودساختہ معبودوں سے، جن کی پوجا تم نے اختیار کر رکھی ہے۔

اور ان سب غلط پرستشوں کی جڑ نفس پرستی ہے، یعنی اللہ کے احکام کی پابندی اور پیروی کے بجائے جو جی میں آئے، اور جو من کو بھائے وہ کرنا، یہی ہر شرک بلکہ ہر بُرائی اور ہر معصیت کی بنیاد ہے، گویا اس لحاظ سے سب بڑا بُت ہمارا نفس ہے۔

ہم نے اپنے زمانہ کے بعض خاص خدارسیدہ بزرگوں کو دیکھا ہے کہ وہ کلمہ شریف کی تشریح کرتے وقت زیادہ زور اسی پہلو پر دیتے تھے، ان کے نزدیک توحید کا اور لا الٰہ الا اللہ کا خاص تقاضا ہم سے یہ ہے کہ جو جی چاہے وہ نہیں کرنا، بلکہ ہر معاملہ میں اللہ کا جو حکم ہو وہ کرنا،

قرآن پاک میں بھی ایک جگہ خواہش نفس کو "اِلٰہ" کہا گیا ہے:۔

"اَرَأَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ"۔ (الفرقان۔ع۔۴)

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ کے احکام سے بے پروا ہو کر اپنے جی کی چاہت پر چلتا ہے وہ گویا اپنے نفس کا پجاری ہے اور اُس کا نفس اُس کا معبود ہو گیا ہے، رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث روایت کی جاتی ہے:۔

"اعدیٰ اعدائک نفسک التی بین جنبیک" (احیاء العلوم)

تمھارا سب سے بڑا دشمن تمھارا وہ نفس ہے، جو تمھارے پہلوؤں کے بیچ میں ہے۔

پس ہمیں لا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ کے ذریعہ ان سب چیزوں کی نفی کرنی چاہئے جن میں معبودیت اور طاغوتیت کا کوئی بھی شائبہ ہے، اور ہر قسم اور ہر درجہ کے شرک سے اپنی حفاظت اور اپنے اندر بیزاری پیدا کرنی چاہئے، اور ہر پہلو سے اپنی توحید کو کامل اور خالص بنانا چاہئے، جس طرح شرک اللہ تعالیٰ کو انتہائی مبغوض ہے اُسی طرح توحید اُس کو انتہائی محبوب ہے اور سارے دین کی روح اور جان ہے۔

## خاتم النبیینؐ کی تکمیل توحید

توحید اور شرک کے سلسلہ میں ایک خاص بات یہ بھی قابل ذکر اور یاد رکھنے کے لائق ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر چونکہ نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے اور اب کبھی کوئی پیغمبر آنے والا نہیں ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ توحید کی تعلیم کو اس قدر مکمل کر دیا ہے جس کے بعد شرک تو کیا، شائبۂ شرک کے لئے بھی کوئی گنجائش نہیں رہی، اور اُن سب راستوں کو بند کر دیا گیا جن سے شیطان شرک کو لا سکتا تھا۔

سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ جس طرح حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی اُمت کو شیطان نے ان کے بارے میں گمراہ کیا، کہ وہ ان کو خدا اور خدا کا بیٹا کہنے لگی، اسی طرح یہ اُمت شیطان کے فریب میں آ کر رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کوئی مشرکانہ عقیدہ قائم نہ کر بیٹھے، حضور ﷺ نے اس کا دروازہ بند کرنے کے لئے صاف صاف فرما دیا ہے:۔

"لَا تُطْرُوْنِی کَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ فَاِنَّمَا اَنَا عَبْدُہٗ فَقُوْلُوْا عَبْدُاللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ ۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

یعنی نصاریٰ نے جس طرح اپنے پیغمبر عیسیٰ بن مریم کو حد سے بڑھایا تم میرے ساتھ یہ معاملہ نہ کرو، میں بس، اللہ کا بندہ ہوں، اسلئے مجھے اُس کا بندہ اور رسول ہی کہو۔

بعض اگلی امتوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا تھا، آپ نے اُن کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی اُمّت کو آگاہی دی، اور فرمایا:۔

"اِنَّ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ کَانُوْا یَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ اَنبِیَا ئِہِمْ مَسَاجِدَ فَلَا تَتَّخِذُوْا لْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ اِنِّیْ اَنْھَاکُمْ عَنْ ذَالِکَ" (صحیح مسلم)

تم سے پہلی بعض امتوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا تھا، ایسا نہ کرنا، دیکھو خبردار! میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں!

اور اپنے آخری مرض میں اللہ سے دُعا فرمائی:۔

"اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا یُعْبَدُ" (مؤطا امام مالک)

یعنی اے اللہ! میری قبر کو بُت نہ بنانا، جس کی پوجا کی جائے۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ بعض صحابہ نے کسی ملک میں دیکھا کہ وہاں کے لوگ اپنے اکابر کو سجدہ کرتے ہیں تو انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت چاہی کہ ہم آپ کو سجدہ کریں، آپ نے پہلے اُن سے پوچھا کہ بتاؤ جب میں اس دنیا سے چلا جاؤں گا تو کیا تم میری قبر کو بھی سجدہ کروگے؟ اُن صحابی کو چونکہ قبر کے سجدے کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ اسلام کی توحید میں اس کی کوئی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی، اس لئے انھوں نے صاف کہا کہ حضرت میں حضور کی قبر کو تو سجدہ نہیں کروں گا، آپ نے ان سے فرمایا:۔

"فَلَا تَفْعَلُوْا" ——— (ابوداؤد)

یعنی جب تم جانتے ہو کہ میں ایک فانی ہستی ہوں، اور ایک دن مرکر قبر میں جانے والا ہوں، اور اس کے بعد تم بھی مجھے سجدہ کے قابل نہ

سمجھو گے، تو پھر ایسے شخص کے لئے سجدہ کی کیا گنجائش ہے۔

ایک دوسرے صحابی (سلمان فارسیؓ) نے جب آپ کو سجدہ کرنے کی خواہش ظاہر کی تو اُن سے بھی آپ نے ایسی ہی بات کہی، اور آخر میں فرمایا:۔

"فَلَا تَسْجُدْ لِيْ وَاسْجُدْ لِلْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ"۔ (ویلمی، کنز العمال)

پس تم مجھے سجدہ نہ کرو، بلکہ سجدہ اُسی اللہ کے لئے مخصوص رکھو، جو ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والا ہے اور جس کو کبھی فنا اور موت نہیں ہے۔

اور سجدہ تو سجدہ، حدیثوں میں ہے کہ آپ نے اپنے لئے صحابہ کو قیامِ تعظیمی سے بھی منع فرمایا۔ دراصل یہ سارے احکام اور یہ ساری احتیاطیں اسی لئے تھیں کہ شرک کے لئے کوئی گنجائش اور کوئی رستہ باقی نہ رہ جائے۔

آنحضرت ﷺ کی اس سلسلہ کی روک تھام اور راہ بندی کا اندازہ اس واقعہ سے خوب کیا جا سکتا ہے کہ حضورؐ کے شیر خوار صاحبزادے حضرت ابراہیم (علٰی ابیہ وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کی جس دن وفات ہوئی، اتفاق سے اُسی دن سورج کو گہن لگا۔ حضور ﷺ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں پرانے جاہلی اعتقادات اور خیالات کے مطابق لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ سورج کو یہ گہن میرے گھر کی اس غمی کی وجہ سے لگا ہے، اسلئے آپ نے اعلان کرا کے تمام مسلمانوں کو اُسی وقت مسجد میں جمع کیا، اور سورج گہن کی نماز پڑھنے کے بعد خطبہ دیا، جس میں اللہ کی حمد وثنا کے بعد ارشاد فرمایا:۔

"اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اٰيَتَانِ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ لَا يَنْكَسِفَانِ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَّلَا لِحَيٰوتِهٖ"۔۔۔۔۔۔

لوگو! حقیقت یہ ہے کہ سورج اور چاند اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، کسی کی موت وحیات سے ان کے گہن کا کوئی تعلق نہیں۔

یہ دراصل عقیدۂ توحید ہی کی حفاظت کے لئے حضورؐ نے فرمایا۔

آپ نے اِس کو بھی برداشت نہیں کیا کہ کسی کو سورج کے گہن میں آنے کے متعلق یہ خیال ہو کہ حضور ﷺ کے گھر کی غمی کی وجہ سے یہ ہوا ہے، اسی طرح شریعت کے احکام میں

بھی توحید کی حفاظت کا اور شرک کی روک تھام کا انتہائی لحاظ کیا گیا ہے۔

مثلاً سورج کے طلوع اور غروب کے وقت اور نصف النہار کے وقت نماز سے منع فرما دیا گیا، تاکہ آفتاب پرستوں سے ظاہری مشابہت بھی نہ ہو، اور کسی کو غلط فہمی نہ ہو۔

اسی کی دوسری مثال دیکھئے، ہر نماز میں رکوع و سجدہ ضروری ہے اور بغیر رکوع و سجدہ کے گویا نماز ہوتی ہی نہیں، لیکن جنازہ کی نماز میں سے رکوع و سجدہ نکال لیا گیا، تاکہ کسی دیکھنے والے کو بھی یہ شبہ نہ ہو کہ ہم اس میّت کے سامنے جھک رہے ہیں، یا سجدہ کر رہے ہیں۔

اللہ کی شان ہے اور شیطان کی کامیابی لائق صد رنج اور قابل عبرت ہے کہ جس دین میں شرک کے راستوں کو اس طرح بند کیا گیا تھا، اُسی کے نام لیواؤں میں شرک کی تمام وہ قسمیں آج موجود ہیں جن میں اگلی اُمتیں مبتلا ہو کر مشرک ہوئی تھیں۔

الحمدللہ توحید اور شرک کا بیان کافی تفصیل سے ہو گیا، ہم نے اپنے نزدیک اس کی کوشش کی کہ اس موضوع سے متعلق کوئی ضروری بات بیان سے رہ نہ جائے۔

**اَلحَمدلِلّٰہ الّذی بعَزتِہٖ وَجَلالِہٖ تَتِمُّ الصّٰلِحٰت**

• • • • • • • • • • • • • • •

# عقیدۂ آخرت

جن حقیقتوں پر ہمارے لئے ایمان لانا ضروری ہے، اُن میں سے ایک آخرت کا عقیدہ ہے۔ قرآن مجید میں اکثر مقامات پر "ایمان باللہ" کے ساتھ "ایمان بالیوم الآخر" کا ذکر کیا جاتا ہے، مثلاً کہیں فرمایا گیا ہے:۔

"مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ"

کہیں ارشاد ہوا:۔

"يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ"

## آخرت پر ایمان لانے کا مطلب کیا ہے؟

آخرت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بتلائی ہوئی اِس حقیقت کو تسلیم کیا جائے اور اِس پر یقین کیا جائے، کہ اِس دنیا کی زندگی کے بعد ایک اور زندگی اور ایک اور عالَم آنے والا ہے اور وہاں انسان کو اِس دنیا میں کئے ہوئے اُس کے بُرے اور بھلے اعمال کی جزا اور سزا ملے گی، یہ اس عقیدہ کا اجمال ہے، قرآن وحدیث میں اس کی پوری پوری تفصیل فرمائی گئی ہے۔

## آخرت عقلاً بھی ضروری ہے

آخرت کے بارے میں اتنی اجمالی بات تو ہر شخص کی سمجھ میں خود بھی آسکتی ہے کہ ہماری اس زندگی کے بعد کوئی اور ایسی زندگی ضرور ہونی چاہئے جس میں لوگوں کو اُن کے اعمال کی جزا اور سزا ملے، کیونکہ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ عمر بھر بڑی بڑی بُرائیاں کرتے ہیں، ڈاکے مارتے ہیں، غریبوں کا خون چوستے ہیں، رشوتیں لیتے ہیں کمزوروں پر ظلم کرتے ہیں، لوگوں کے حق مارتے اور زندگی بھر عیش اُڑاتے رہتے ہیں، اور

اِسی حال میں مرجاتے ہیں، اسی طرح بہت سے لوگوں کو دیکھا جاتا ہے وہ بیچارے بڑی نیکی کی زندگی گذارتے ہیں، کسی پر ظلم نہیں کرتے، کسی کے ساتھ دغا اور دھوکا نہیں کرتے، کسی کا حق نہیں مارتے، اللہ کی عبادت بھی کرتے ہیں، اس کی مخلوق کی خدمت بھی کرتے ہیں، اِس کے باوجود اُن کی ساری زندگی تنگی اور تکلیف سے گذرتی ہے۔ کبھی کوئی بیماری آزاری ہے کبھی کوئی تکلیف اور پریشانی ہے اور اسی حال میں اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

تو جب یہ دنیا خدا کی پیدا کی ہوئی دنیا ہے، اور وہ ہمارے سب اچھے بُرے اعمال کو دیکھتا ہے اور ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ یہاں اِس دنیا میں نہ نیکوں کو اُن کی نیکی کا صلہ اور انعام مل رہا ہے اور نہ مجرموں پاپیوں کو اُن کے پاپ اور ظلم کی کوئی سزا دی جارہی ہے تو خود بخود یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ پھر اللہ کی طرف سے یہ جزا اور سزا کسی دوسری زندگی میں ملنی چاہئے، یہ تو نہیں ہوسکتا کہ اللہ کے یہاں ایسا اندھیر ہو، کہ نہ نیکوں کی نیکی کی کوئی قدر ہو، اور نہ ظالموں اور بدکاروں کی بدمعاشی اور بدکاری اور اُن کے ظلم وستم پر کوئی بازپُرس ہو، اور سارے پارساؤں اور پرہیزگاروں اور چوروں ڈاکوؤں کے ساتھ اندھیر نگری والا ایک ہی برتاؤ ہو، اللہ تعالیٰ کی ہستی تو بہت بلند ہے، یہ طرزِ عمل تو کسی بھلے آدمی کے بھی شایانِ شان نہیں کہ وہ شریفوں اور شریروں اور ظالموں اور مظلوموں کے ساتھ ایک ہی سا برتاؤ کرے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔

"اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ کَالْمُجْرِمِیْنَ" ——— (سورۃ قلم۔ ع۔ ۲)

کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ ہم فرمانبرداروں اور نافرمانوں کیساتھ یکساں برتاؤ کریں۔

الغرض اِس دنیا میں جزا اور سزا کے نہ ہونے سے خود بخود یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اِس دنیوی زندگی کے بعد کوئی اور زندگی ایسی ہونی چاہئے جس میں لوگوں کو اُن کے کیے کی جزا اور سزا ملے۔

یہی بات ایک دوسرے عنوان سے اور دوسرے طریقے پر یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دِنیا کی ہر چیز کے کچھ خواص اور آثار ہیں، مثلاً آگ کی خاصیت جلانا ہے، پانی کی خاصیت بُجھانا اور صفائی کرنا ہے، اِسی طرح ہر جڑی بوٹی میں بھی کچھ خاصیتیں

ہیں، ایسے ہی انسان کے مادّی اعمال کے بھی خواص اور آثار ہیں جو لازماً ظاہر ہو کے رہتے ہیں، مثلاً وہ کھانا کھاتا ہے تو اُس سے اس کی بھوک مرتی ہے، آسودگی آتی ہے، اسی طرح پانی پینے سے پیاس بجھتی ہے، اور اگر کوئی سخت چیز کھالی جائے تو پیٹ میں درد ہو جاتا ہے، بہت زیادہ کھالیا جائے تو بدہضمی ہو جاتی ہے، زہر کھانے سے آدمی مر جاتا ہے، دوا استعمال کرنے سے مرض جاتا رہتا ہے، کوئی ٹانک اور مقوی دوا کھانے سے طاقت اور توانائی آجاتی ہے، اور ظاہر ہے کہ انسان کے اخلاقی اعمال خواہ وہ اچھے ہوں یا بُرے اُس کے مادّی اعمال سے زیادہ اہم اور اعلیٰ ہیں، اِس لئے ایسا نہیں ہوسکتا کہ اُس کے اخلاقی اعمال کا کوئی اثر، کوئی نتیجہ اور کوئی خاصیت ہی نہ ہو۔ مثلاً ایک شخص اپنا کھانا خود کھانے کے بجائے کسی دوسرے بھوکے کو کِھلا دیتا ہے اور خود بھوکا رہتا ہے، یا کسی پیاسے کو پانی پلاتا ہے اور خود پیاس کی تکلیف اُٹھاتا ہے، یا کسی لاوارث بیمار کی محض اللہ واسطے خدمت اور تیمارداری کرتا ہے، یا غریبوں یتیموں اور بیواؤں کی خبر گیری کرتا ہے، اور اپنی محنت سے کمایا ہوا مال اُن پر خرچ کرتا ہے، پھر اِس سب کے ساتھ اللہ کی عبادت اور بندگی بھی کرتا ہے تو انسانی عقل اور فطرت کا یہ کُھلا ہوا تقاضا اور فیصلہ ہے کہ اِن نیک اعمال کے بھی اثرات اور نتائج ظاہر ہونے چاہئیں، اور وہ مادّی اعمال کے نتائج و آثار سے بہت زیادہ اہم اور اعلیٰ ہونے چاہئیں۔

اسی طرح اگر ایک شخص ظلم کرتا ہے، زیردستوں اور کمزوروں کو ستاتا ہے، امانت میں خیانت اور معاملات میں دھوکہ بازی کرتا ہے، رشوت لیتا ہے، یا ڈاکے ڈالتا ہے، قزّاقی کرتا ہے، بے رحم ہے، بے درد ہے، جلّاد ہے، اللہ کے بیگناہ بندوں کا خون بہاتا ہے، خدا کو کبھی بھولے سے یاد نہیں کرتا، غرض اپنے وقت کا فرعون اور نمرود ہے، تو ہماری عقل کہتی ہے کہ اس کی اِن بداعمالیوں کے نتائج بھی نہایت سنگین ہونے چاہئیں اور سامنے آنے چاہئیں۔ آخر انسان جب اپنی معمولی سے معمولی ہر مادّی غلطی کا خمیازہ بھگتتا ہے تو اتنی بڑی بڑی اخلاقی غلط کاریوں کا نتیجہ کیوں نہ بھگتے گا۔

گندم از گندم بروید جوز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو

اسی کو قرآن مجید نے ایک جگہ فرمایا:۔

"اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَاۤءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَاۤءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ○ ——————— (جاثیہ۔ ع ۲)

جن لوگوں نے خوب پیٹ بھر کے بدکاریاں اور بدمعاشیاں کی ہیں، کیا وہ گمان کرتے ہیں، کہ ہم ان مجرموں کو اپنے اُن نیک بندوں کی طرح کردیں گے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے اور اُن کا انجام اور جینا مرنا برابر اور یکساں ہوگا، بہت نادرست اور بالکل بیہودہ ہے اُن کا یہ خیال۔

بہر حال جب ہم یہ بات کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں، کہ انسان کے مادّی اعمال کا نتیجہ اور اثر تو یہاں ظاہر ہوتا ہے لیکن اس کے اخلاقی اور روحانی اعمال کا کوئی اثر اور کوئی نتیجہ یہاں ظاہر نہیں ہوتا، تو ہماری عقل وفطرت اور ہماری سمجھ بوجھ ضروری قرار دیتی ہے کہ پھر اس دنیوی زندگی کے بعد کوئی اور زندگی ایسی ہونی چاہئے، جس میں ان اچھے یا بُرے اخلاقی اور روحانی اعمال کے آثار وخواص اور نتائج ظاہر ہوں، اور انسانوں کو اُن کی نیکوکاریوں اور بدکاریوں کی جزا اور سزا ملے۔

## جزا اور سزا اِس دنیا میں کیوں نہیں دی جاتی؟

اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر اسی دنیا میں ہر بُرائی اور بھلائی کی سزا اور جزا مل جایا کرتی، تو پھر یہ زندگی امتحانی زندگی نہ رہتی، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو امتحان کی دنیا بنایا ہے اور جزا وسزا کو یعنی عذاب وثواب کو غیب کے پردہ میں رکھ کر انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اعلان کرایا ہے کہ جو کوئی یہاں میرے احکام کی فرمانبرداری کرے گا، اور نیکی کی زندگی گذارے گا، میں اُس کو آئندہ زندگی میں یہ انعام دوں گا، اور جو کوئی سرکشی کرے گا، اور نافرمانی وبدکرداری کی زندگی گذارے گا، میں اُس کو ایسی ایسی سزائیں دوں گا۔ تو اگر بالفرض ہر بُرائی بھلائی کا بدلہ اسی دنیا میں ہاتھ کے ہاتھ اور نقد مل جایا کرتا، تو یہ امتحان نہیں ہوسکتا تھا، پھر تو ہر آدمی نافرمانی سے اسی طرح بچتا، جس طرح آگ میں کودنے سے ہر ایک بچتا ہے،

اور نیکی کرنے کے لئے ہر ایک اسی طرح مجبور ہوتا جس طرح کھانے پینے کیلئے مجبور ہوتا ہے اور پھر عذاب وثواب بے معنی ہوتا۔

اِس کے علاوہ ایک وجہ جزا اور سزا کو دوسرے عالم میں رکھنے کی یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فرمانبردار بندوں کو جو صلہ اور انعام دینا چاہتا ہے اور جیسی چین و آرام والی زندگی انھیں بخشنا چاہتا ہے، اس دنیا میں اس کا کوئی امکان ہی نہیں ہے، اور اسی طرح اپنے نافرمانوں کو وہ جو سخت ترین سزا اور عذاب دینا چاہتا ہے اُس کی برداشت کی بھی ہماری اس دنیا میں طاقت نہیں ہے، یعنی وہ اتنا سخت ہے کہ اگر وہ اس دنیا میں ظاہر ہو جائے تو یہاں کا سارا چین و آرام ختم ہو جائے اور یہ دنیا سوخت ہو کر رہ جائے، یہ دنیا تو بڑی کمزور اور بہت محدود طاقت رکھنے والی دنیا ہے، اور پھر اس کا نظام ایسا ہے کہ اس میں راحتیں اور تکلیفیں ملی جلی ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنے فرمانبردار بندوں کو ان کی روحانی اور اخلاقی نیکیوں کے صلہ میں جو چین و آرام کی زندگی دینا چاہتا ہے وہ کسی ایسی ہی جگہ اور ایسے ہی کسی عالم میں ممکن ہے جہاں کسی تکلیف کا گذر نہ ہو، اور وہاں صرف بہار ہی بہار ہو، اور اسی طرح اپنے مجرموں اور نافرمانوں کو ان کی اخلاقی اور روحانی بدکرداریوں کی جو سخت سزا اور جو دردناک عذاب وہ دینا چاہتا ہے وہ کسی ایسے ہی عالم میں ممکن ہے جہاں بس دکھ ہی دکھ اور تکلیف ہی تکلیف ہو۔

بہر حال اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ بندوں کے اچھے بُرے اعمال کی جزا اور سزا اس دنیوی زندگی کے بعد والی زندگی میں اور دوسرے عالم میں دے گا، بس وہی عالم آخرت کا عالَم ہے، اور اس کے دو حصے ہیں، ایک جنت اور ایک دوزخ، جنت میں اللہ کے انعام اور اس کے خاص فضل و کرم کا ظہور ہوگا، اور دوزخ میں اس کے صرف قہر و غضب کا ظہور ہوگا، اور یہ دونوں ظہور اعلیٰ پیمانہ پر ہوں گے، اور بس وہیں پوری خدائی شان ظاہر ہوگی۔

## خدائی شان اور اس کے جلال و جمال کے ظہور کیلئے بھی آخرت کی ضرورت ہے!

تو عالَمِ آخرت کی اور جنت و دوزخ کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ اللہ کے مہر و قہر،

اور جلال و جمال کا ظہور اعلیٰ پیمانہ پر ہو سکے، ہماری اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا اگرچہ ظہور ہے لیکن پورے ظہور کی اس دنیا میں برداشت نہ ہونے کی وجہ سے یہ ظہور بہت محدود ہے، یعنی یہاں اللہ کی جن جمالی صفات کا ظہور ہو رہا ہے وہ بھی محدود ہے، اور جن جلالی صفات کا ظہور ہو رہا ہے وہ بھی محدود ہے، پورے اور کامل ظہور کی ہماری یہ دنیا تاب ہی نہیں لاسکتی، بہر حال! اس لئے بھی ایک ایسے عالَم کی ضرورت ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی صفات جلال و جمال کا کامل ظہور ہو سکے۔

دراصل یہ ظہور ہی تو عالَم کی تخلیق کا خاص مقصد ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے دنیا کی یہ بساط اسی لئے بچھائی ہے کہ اس کی صفات کمال کا ظہور ہو، پس آخرت کو اگر نہ مانا جائے تو یہ مقصد کہاں پورا ہوگا، لہٰذا اس وجہ سے بھی اس دنیا کے خاتمہ کے بعد عالَمِ آخرت کا برپا ہونا ضروری اور ناگزیر ہے۔

## عقیدۂ آخرت کا اثر انسان کی زندگی پر

انسانی اعمال کی جزا سزا کے لئے اور اللہ تعالیٰ کے جلال و جمال اور قہر و مہر کے کامل ظہور کے لئے عالَمِ آخرت کا از روئے عقل ضروری ہونا تو معلوم ہو چکا، اس کے بعد اس پر بھی غور کیجئے کہ انسانی زندگی کے سدھار میں عقیدۂ آخرت کو کتنا دخل ہے، دنیا کی تاریخ سے واقفیت اور غور و فکر کی کچھ صلاحیت رکھنے والا کوئی آدمی بھی اِس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ برائیوں اور بداخلاقیوں سے انسانوں کو آخرت کا یقین و ایمان جس قدر بچاتا ہے اور بچاسکتا ہے کوئی دوسری چیز اور کوئی دوسرا انسانی انتظام اس قدر نہیں بچاسکتا۔

بے شک حکومت کا قانون اور تہذیبی ترقی یا بُرائی بھلائی کا احساس اور نفس کی شرافت بھی انسان کو برائیوں اور بداخلاقیوں سے بچانے والی چیزیں ہیں، لیکن یہ اتنی مؤثر اور کارگر نہیں ہوتیں جتنا کہ مرنے کے بعد کی جزا سزا کا یقین اور آخرت پر ایمان، بشرطیکہ زندہ یقین اور حقیقی ایمان ہو، صرف نام کا ایمان اور بے جان عقیدہ نہ ہو۔

یہ کوئی خالی منطق کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ برائیوں اور بداخلاقیوں کی گنجائش اُسی معاشرہ میں ہوتی ہے جو آخرت اور مرنے کے بعد کی خدا کے سامنے پیشی اور جزا و سزا کے یقین سے خالی ہو، ورنہ جن کے دلوں میں یقین و ایمان کا نور

موجود ہو، اُن کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ بُرے خیالات اور بُرے وسوسوں سے بھی گھبراتے ہیں، اور اپنے دل کو بُرائی کے خیال سے بھی پاک رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔

جو لوگ دنیا کی تاریخ سے کچھ واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اس دنیا میں سب سے زیادہ پاکیزہ، ستھری اور مہذّب و مُبارک زندگی اُن ہی بندگانِ خدا کی رہی ہے جو مرنے کے بعد کی پیشی، اور آخرت کی جزا سزا پر یقین رکھتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ یقین آدمی کو بُرائی کے ارادہ سے وہاں بھی روکتا ہے جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو، اور دنیا میں کسی قانونی پکڑ اور سزا کا خطرہ نہ ہو۔

الغرض اس دنیا کے خاتمہ کے بعد عالمِ آخرت کا برپا ہونا، اللہ کے پیغمبروں اور اُس کی کتابوں کی بتائی ہوئی ایک حقیقت بھی ہے اور خود ہماری عقل کا تقاضا بھی ہے، اور اس پر ایمان وعقیدہ ہماری ایک بہت بڑی مصلحت بھی ہے۔

## آخرت کی تفصیلات نبوت ہی کے راستہ سے معلوم ہو سکتی ہیں

لیکن جزا وسزا کے اُس عالَم کی تفصیلات نبوت ہی کے راستہ سے معلوم ہو سکتی ہیں، اور یہ بالکل یقینی بات ہے کہ اپنے اپنے وقت میں اللہ کے سب پیغمبروں نے اپنی اپنی امتوں کو آخرت کی اور جنت دوزخ کی ضروری تفصیلات بتلائی تھیں، لیکن ان امتوں نے پوری طرح ان کو محفوظ نہیں رکھا، اور اب محفوظ اور مستند بیان صرف اللہ کے آخری نبی سیّدنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا اور ان کی لائی ہوئی اللہ کی کتاب قرآن مجید کا ہے، جو جوں کا توں محفوظ ہے، اور اُس میں ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جس سے عقلِ انسانی انکار کر سکے اور وہ ناممکن اور محال ہو۔

## آخرت کی تفصیلات میں شبہ، علم وعقل کی نارسائی کی وجہ سے ہوتا ہے!

ہاں چونکہ عالم آخرت کی چیزیں ہماری دیکھی بھالی نہیں ہیں، اور ہم نے ان کا کبھی تجربہ اور مشاہدہ نہیں کیا ہے، اس لئے وہ ہمیں اچنبھے کی سی معلوم ہوتی ہیں، اور ان کا سمجھنا بعض لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے، لیکن یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی بچّے سے جو ابھی اپنی ماں کے پیٹ ہی میں ہو اگر کسی آلہ کے ذریعہ یہ کہا جائے کہ اے بچّے! تو عنقریب ایک ایسی دنیا میں

آنے والا ہے جہاں لاکھوں میل کی زمین ہے، اور اس سے بھی بڑے سمندر ہیں اور آسمان ہے، چاند، سورج اور لاکھوں ستارے ہیں، اور وہاں ہوائی جہاز اُڑتے ہیں، ریلیں دوڑتی ہیں، اور لڑائیاں ہوتی ہیں جن میں توپیں گرجتی ہیں، اور ایٹم بم چلتے ہیں، تو وہ بچہ اگر کسی طرح ان باتوں کو سمجھ بھی لے تو اس کے لئے ان باتوں کا یقین کرنا بڑا مشکل ہوگا کیونکہ وہ جس دنیا میں ہے اور جس کو دیکھتا اور جانتا ہے وہ تو بس اس کے ماں کے پیٹ کی ایک بالشت بھر کی دنیا ہے۔

بالکل ایسا ہی معاملہ آخرت کے بارے میں اس دنیا کے انسانوں کا ہے واقعہ یہ ہے کہ عالم آخرت اس دنیا کے مقابلہ میں اسی طرح بے حد وسیع اور بے انتہا ترقی یافتہ ہوگا، جس طرح ماں کے پیٹ کے مقابلہ میں ہماری یہ زمین و آسمان والی دنیا بے حد وسیع اور ترقی یافتہ ہے، اور جس طرح بچہ ماں کے پیٹ سے اس دنیا میں آنے کے بعد وہ سب کچھ دیکھ لیتا ہے جس کو وہ ماں کے پیٹ کے زمانہ میں سمجھ بھی نہیں سکتا تھا، اسی طرح آخرت کے عالم میں پہنچ کر سب انسان وہ سب کچھ دیکھ لیں گے جو اللہ کے پیغمبروں نے وہاں کے متعلق بتلایا ہے۔

بہر حال نبوت کے راستہ سے آخرت کے متعلق جو تفصیلات ہمیں معلوم ہوئی ہیں، وہ سب یقینی اور حق ہیں، اور ان میں کوئی چیز بھی ناممکن اور محال نہیں ہے، ہاں چونکہ یہاں ہمارا علم اور مشاہدہ بہت محدود اور ناقص ہے اس لئے بعض لوگوں کو وہ باتیں اچنبھے کی سی معلوم ہوتی ہیں، اور کم عقل لوگ اپنی نادانی سے ان میں شبہ کرتے ہیں، لیکن ایمان کا اور عقلِ سلیم کا فیصلہ یہ ہی ہے کہ اللہ نے اور اس کے صادق مصدوق رسول نے آخرت کے بارے میں اور وہاں کی جزا سزا کے متعلق جو کچھ بتلایا ہے اس سب کو حق مانا جائے اور اس پر یقین کیا جائے۔

یہ بالکل عقلی اور فطری بات ہے کہ جس چیز کو ہم نہیں جانتے اور ہم نے خود اُس کو نہیں دیکھا، اس کے متعلق ہم اُن سچے لوگوں کے بیان پر اعتماد کریں جن کو اس کا علم کسی مستند ذریعہ سے ہوگیا ہے، یا جنھوں نے اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور جن کی سچائی اور پاکبازی بھی ثابت ہو چکی ہے، پس مرنے کے بعد عالمِ برزخ اور قبر کے بارے میں اور پھر قیامت کے بارے میں اور حشر نشر اور حساب کے بارے میں اور جنت دوزخ کے بارہ میں جو کچھ قرآن پاک نے اور رسول اللہ ﷺ نے بتلایا ہے اس سب پر ہمارا ایمان ہے اور ہم کو یقین

ہے کہ وہ سب کچھ بالکل اسی طرح ہونے والا ہے جس طرح کہ بتلایا گیا ہے، بس یہی معنی ہیں آخرت پر ایمان لانے کے۔ اٰمَنّا بِاللّٰہِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔

## اللہ اور آخرت پر ایمان کا لازمی تقاضا

اس کے بعد یہ بتلانے کی ضرورت نہیں رہتی کہ اللہ اور آخرت پر ایمان لانے کے بعد آپ سے آپ ہم پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ ہم جانوروں کی سی من مانی زندگی نہ گذاریں، بلکہ اللہ کی بندگی اور فرمانبرداری والی زندگی گذاریں، تا کہ ہمارا خالق اور مالک جس کے قبضہ میں سب کچھ ہے وہ ہم سے راضی ہو، اور آخرت کی کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی میں ہم اس کے غضب اور عذاب سے بچ سکیں، اور وہ جنت اور وہ انعامات حاصل کر سکیں جن کا اُس نے اپنے فرمانبردار اور اطاعت شعار بندوں کے لئے وعدہ فرمایا ہے۔

...............

# رسالت

## رسالت کی ضرورت

جب اللہ کو اور آخرت کو ماننے کے بعد ہمارے لئے یہ ضروری ہوگیا کہ اس دنیا میں ہم اللہ کی بندگی اور فرمانبرداری والی زندگی گذاریں تو ہم اس کے محتاج ہو گئے کہ کسی طرح سے ہمیں یہ معلوم ہو کہ اللہ کے احکام ہمارے لئے کیا ہیں، اور اس کی طرف سے کن کاموں کی اجازت ہے اور کن کاموں اور کن باتوں کی ممانعت ہے؟ اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو براہ راست یہ باتیں بتلاتا نہیں، اور جو تھوڑی سی عقل اور سمجھ بوجھ انسانوں کو ملی ہوئی ہے وہ اس دنیا کی روزمرّہ کی ضرورتوں کے لئے تو کسی حد تک کافی ہے، لیکن یہ معلوم کرنا اس کے بس میں بالکل نہیں کہ اللہ ہم سے کیا چاہتا ہے اور وہ کن کاموں سے راضی اور کن سے ناراض ہوتا ہے، پس ہماری اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے رسالت اور پیغمبری کا سلسلہ قائم فرمایا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جس طرح ہماری ضرورت کے لئے سورج پیدا فرمایا جس سے ہم گرمی اور روشنی حاصِل کرتے ہیں، اور جس طرح اس نے ہمارے لئے غذا کی پیداوار کا نظام قائم کیا، اسی طرح اس نے ہماری اور صرف ہماری ضرورت کے لئے نبوت کا نظام قائم فرمایا، یعنی طے فرمایا کہ اپنے خاص اور منتخب نمائندوں کے ذریعہ عام بندوں تک وہ اپنی ہدایت اور اپنا قانون پہنچایا کرے گا۔ پس معلوم ہوا کہ نبوت وشریعت درحقیقت خود ہماری ضرورت ہے، اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت و ربوبیت کا تقاضا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کہ سورج اور ہوا پانی وغیرہ ہماری ضرورتیں ہیں، اور اللہ کی رحمت وربوبیت نے ہماری ضرورت کے لئے ان سب چیزوں کو پیدا کیا ہے۔

پس وہ لوگ بڑے جاہل اور حقیقت ناشناس ہیں جو دین اور شریعت کے متعلق سمجھتے

ہیں کہ یہ ایک بوجھ ہے جو اللہ کی طرف سے انسانوں پر لاد دیا گیا ہے، اور اس کا تعلق اللہ کی بس صفتِ حاکمیت اور مالکیت سے ہے۔

بہر حال نبوت اور شریعت ہماری ضرورت اور اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، کیونکہ بندے اسی کے راستہ سے اللہ کی رضا کے مقام تک اور جنت تک پہنچیں گے۔

## رسول کون ہونا چاہئے؟

اب ایک سوال یہ سامنے آتا ہے کہ نبی کون ہونا چاہئے؟ اس بارے میں بعض قوموں کو بڑے مغالطے لگے ہیں، بعضوں نے تو کہا ہے کہ خود خدا کسی روپ میں آکر انسانوں کو اپنا قانون بتاتا ہے، اِس کا مطلب یہ ہوا کہ بادشاہ اپنی رعیت کے پاس اپنا حکم نامہ بھیجنا چاہتا ہے اور خود ہی پوسٹ مین کی وردی پہن کر اور اس کا روپ بھر کر اپنا حکم نامہ گھر گھر بانٹتا پھرتا ہے۔

ایسی مہمل اور غلط بات اُن ہی لوگوں نے کہی، اور اُن ہی لوگوں نے قبول کی، جنھوں نے خدا کی شان کو بالکل نہیں سمجھا۔

سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ۝

## نبی فرشتہ نہیں، بلکہ انسان ہی ہوسکتا ہے

اور بعضوں نے خیال کیا کہ نبی فرشتہ ہونا چاہئے کیونکہ فرشتہ اللہ کی بڑی مقدس اور سراپا نورانی مخلوق ہے، لیکن ان لوگوں نے یہ نہیں سمجھا کہ نبی اور پیغمبر کے لئے مقدس ہونے کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کی ضرورت ہے کہ جن انسانوں کی ہدایت کا کام اس کو کرنا ہے وہ اُن کے رجحانات، اُن کے مزاج اور اُن کے احساسات اور جذبات سے واقف ہو، اور فرشتے بے شک مقدس اور نورانی تو ہیں، لیکن انسانی جذبات اور احساسات اور انسانی مزاج اور اس کی خواہشات سے وہ بیچارے نہ صرف یہ کہ ناواقف ہیں، بلکہ وہ تو ان کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ مثلاً بھوک، پیاس، غصّہ، حسد، نفسانی شہوت، ان چیزوں کی حقیقت کو فرشتہ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ یہ بات معمولی غور و فکر سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ انسان کی

زندگی میں بہت سی کیفیتیں ایسی ہیں جو اُسی وقت سمجھ میں آتی ہیں جب انسان اُن سے گذرتا ہے، مثلاً جس شخص میں شہوت کا مادّہ ہی نہ ہو یعنی وہ فطرتاً اس سے خالی ہو، وہ شہوت کی حقیقت کو سمجھنے سے بالکل قاصر رہے گا، اسی طرح جس شخص نے کبھی سوتے میں خواب نہ دیکھا ہو، اُس کو ہزار سمجھایا جائے وہ خواب کی اصل حقیقت کو کبھی نہیں سمجھ سکتا، اور ایک شہوت یا خواب ہی پر منحصر نہیں، اکثر انسانی احساسات کا حال یہی ہے۔ جس نے کبھی آم نہیں چکھا، اس کو کسی طرح آم کا ذائقہ نہیں سمجھایا جا سکتا، مادرزاد اندھے کو گلاب کے پھول کی رنگت اور اس کی حسین صورت دو گھنٹے کی تقریر سے بھی نہیں سمجھائی جا سکتی، بہر حال انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے یہ ضروری ہے کہ جو ہدایت کرنے والا ہو وہ انسان کے حالات سے اور اس کے رجحانات اور احساسات سے پوری طرح واقف ہو، اور یہ بات چونکہ انسان ہی کو حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے نبی ہمیشہ انسانوں ہی میں سے بھیجے، اور جو بے وقوف اور احمق یہ کہتے تھے کہ نبی فرشتہ ہونا چاہیے، قرآن مجید میں اُن سے کہا گیا کہ:۔

"قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا۔ (بنی اسرائیل ع ١١)

اِس کا مطلب یہی ہے کہ نبی اور رسول اُسی جنس میں سے ہونا چاہیے، جن کی طرف اور جن کی ہدایت کے لئے وہ بھیجا جائے، تو اگر زمین میں بجائے انسانوں کے فرشتے آباد ہوتے اور رسُول ان کی ہدایت کے لئے بھیجنا ہوتا تو ہم کسی فرشتہ ہی کو نبی بنا کر بھیجتے، لیکن جب زمین میں مستقل آبادی انسانوں ہی کی ہے، اور ان ہی کی ہدایت و رہنمائی کے لئے نبی کی ضرورت ہے تو یہ ضرورت تو انسان ہی سے پوری ہو سکتی ہے، کیونکہ وہی انسانوں کے مسائل اور احوال اور اُن کے طبعی تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔

## نبی اگر خدا یا خدا کا اوتار یا فرشتہ ہو تو نبوت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے

اس کے علاوہ، اگر نبی کو انسان نہ مانا جائے، بلکہ خدا، یا خدا کا بیٹا یا خدا کا اوتار یا فرشتہ سمجھا جائے تو نبوت و رسالت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے، کیونکہ پھر نبی اور رسول کی

زندگی اُن انسانوں کے لئے نمونہ اور مثال نہیں بن سکتی، جن کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے وہ بھیجا گیا تھا، انسان کسی انسان کی پیروی اور نقل تو کرسکتا ہے اور اُس سے اِس کا مطالبہ بھی کیا جاسکتا ہے، لیکن خدا کی یا فرشتہ کی نقل کرنا اُس بیچارے کے بس کی بات نہیں، اور نہ اُس سے اس کا مطالبہ ہی کیا جاسکتا ہے۔

## نبیوں کو خدا کا اوتار یا فرشتہ ماننے کے بعد اُن کی زندگیوں میں کوئی کمال بھی نہیں رہتا

علاوہ ازیں نبیوں اور رسولوں کو خدا یا خدا کا اوتار یا فرشتہ قرار دینے کے بعد اُن کی زندگی میں کوئی خاص کمال بھی نہیں رہتا۔ مثال کے طور پر غور کیجئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اگر انسان مانا جائے تو ان کی زندگی ایک نہایت کامل اور بلند ترین انسان کی زندگی نظر آئے گی، جن میں ظلم کے مقابلہ میں صبر ہے، حلم ہے، زہد ہے، توکّل ہے، علم و حکمت ہے، محبت و ہمدردی ہے، دلسوزی و غمخواری ہے، اور اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے عطا کئے ہوئے معجزات ہیں جو گویا اُن کی سچائی کی سند اور نشانی ہیں، لیکن اگر اُن کو خدا یا خدا کا بیٹا یا خدا کا اوتار یا فرشتہ مانا جائے تو اس معیار سے ہماری عقل ان کی زندگی میں حسرتناک نقائص اور کمزوریاں محسوس کرے گی، پھر ان کا کھانا پینا، مریمؑ کے پیٹ سے پیدا ہونا، یہودیوں کا ان کو طرح طرح سے ستا سکنا اور اُن کی بے انتہا توہین و تذلیل کرنا (اور انجیلوں کے بیان کے مطابق) اُن کا سولی پر چڑھایا جانا۔ یہ سب باتیں بجائے کمال کے نقائص نظر آئیں گی، جن کی کوئی توجیہ بھی نہ کی جاسکے گی، بلکہ پھر تو اُن کے معجزات میں بھی کوئی ندرت اور خصوصیت نہیں رہے گی، کیونکہ خدا کی قدرت کے تو ان معجزوں سے بھی بڑے بڑے نمونے دنیا کے اس کارخانہ میں ہم ہر وقت دیکھتے رہتے ہیں۔

الغرض اس مسئلہ پر جو شخص کچھ بھی غور کرے وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ انسانوں کی ہدایت کے لئے آنے والے نبی اور رسول اُن ہی کی جنس سے ہونے چاہئیں، اور نبیوں اور رسولوں کو خدا یا خدا کا اوتار یا فرشتہ قرار دینا ایک جاہلانہ اور احمقانہ گمراہی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اسی لئے قرآن مجید میں جابجا اس حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لئے جتنے بھی پیغمبر اس دنیا میں بھیجے وہ سب انسان ہی تھے۔

## قرآن مجید کا اعلان کہ سارے پیغمبر انسان ہی تھے

مَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡهِمۡ۔ (یوسف۔ع ۱۲)

اے رسول! ہم نے تم سے پہلے بھی جو پیغمبر بھیجے وہ سب آدمی ہی تھے،

جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے!

اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بار بار اس کا اعلان کرایا کہ میں تو بس انسانوں میں سے ایک انسان ہوں، اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنا پیغمبر بنایا ہے:۔

"هَلۡ کُنۡتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوۡلًا" ـــــــ (بنی اسرائیل۔ع ۱۰)

میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان ہوں اور اللہ کا پیغمبر ـــــــــــ

"قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ" ـــــــ (الکھف۔ع ۱۲)

آپ اعلان کر دیجئے کہ میں تو بس تم جیسا ایک انسان ہی ہوں۔

قرآن مجید نے اس مسئلہ کو اتنا روشن کیا ہے کہ سارے نبیوں کا انسان اور بشر ہونا مسلمانوں کے ایمان کا جزو ہو گیا ہے۔ اسلامی عقائد کی کتابوں میں نبی کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ انسان ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنی ہدایت اور اپنا پیغام لے کر اپنے بندوں کی طرف بھیجتا ہے، اور پیغمبرانہ ذمہ داریاں اُس کے سپرد کرتا ہے۔

یہاں تک کی گفتگو سے یہ معلوم ہو گیا کہ (۱) نبوت و رسالت ہماری زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، اور (۲) یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نبی اور رسول انسانوں ہی میں سے ہونا چاہئے، نیز (۳) یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسلامی عقیدہ اور قرآن مجید کی تعلیم بھی یہی ہے۔

## دنیا میں انبیاءؑ برابر آتے رہے ہیں

اس کے بعد آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ جو بڑا رحیم و کریم ہے اور جس نے انسان کے لئے وہ سب چیزیں پیدا کی ہیں جن کی انسان کو اپنی زندگی میں ضرورت ہے، اُس نے انسان کی اس سب سے بڑی ضرورت کو بھی ہمیشہ پورا کیا ہے۔ یعنی جب سے اس دنیا میں انسانوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے اُسی وقت سے نبوت کا سلسلہ بھی جاری ہے، اور

ضرورت وقت کے مطابق مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں اور علاقوں میں اُس کے پیغمبر آتے رہے ہیں، ہم یہ تو نہیں بتلا سکتے ہیں کہ کُل پیغمبر کتنے آئے، قرآن مجید میں ان کی تعداد نہیں بتلائی گئی اور نہ اِس کی ضرورت تھی، لیکن یہ صاف صاف فرمایا گیا ہے کہ کوئی ملک اور کوئی مقام ایسا نہیں جہاں ہم نے رسول نہ بھیجا ہو۔

ایک جگہ فرمایا گیا ہے:۔

"وَلِکُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلٌ ــــــــ (یونس۔ع ۵)

یعنی ہر قوم کے واسطے پیغمبر آئے ہیں ــــــــ

دوسری جگہ فرمایا گیا:۔

"وَاِنْ مِّنْ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ" ــــــــ (فاطر۔ع ۳)

یعنی کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس ہمارا رسول نہ پہنچا ہو ــــــــ

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا گیا:۔

"وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلًا" ــــــــ (نحل۔ع ۵)

یعنی ہم نے ہر قوم میں اپنے پیغمبر بھیجے ہیں ــــــــ

ان پیغمبروں میں سے چند خاص پیغمبروں کے نام اور اُن کے کچھ احوال بھی قرآن مجید میں بیان فرمائے گئے ہیں، اور باقیوں کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا، لیکن ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان سب پر ایمان لائیں اور ان سب کو یکساں طور پر اللہ کے راست باز اور پاک باز بندے سمجھیں، اور ان سب کا ادب کریں، اس کے بغیر ہم مومن نہیں ہو سکتے۔

قرآن مجید میں ایمان والوں کا اصول اور عقیدہ یہ بیان کیا گیا ہے:۔

"لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ" ــــــــ (بقرہ۔ع ۴۰)

کہ ہم اللہ کے پیغمبروں میں کوئی تفریق نہیں کرتے، بلکہ سب کو مانتے ہیں۔

## ایمان سب نبیوں پر اور پیروی صرف نبیِ وقت کی

بہر حال مومن ہونے کے لئے سب پیغمبروں پر ایمان لانا ضروری ہے، ہاں اطاعت اور پیروی صرف نبیِ وقت کی کیجاتی ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی جو احکام لاتا ہے

وہ اس کے اپنے احکام نہیں ہوتے، بلکہ خدا کے احکام ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا منشا یہی ہوتا ہے کہ جس زمانہ کے لئے وہ جو احکام بھیجے، ان ہی کا اتباع کیا جائے، نئے احکام آنے کے بعد پہلے احکام منسوخ ہو جاتے ہیں۔

## پہلی شریعتوں کی منسوخی کی ایک عام فہم مثال

اس کو آپ مثال سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ فرض کیجئے ایک ملک ہے اُس کے رہنے والے بہت کمزور اور پست حالت میں ہیں، غربت بھی ہے، جہالت بھی ہے، صحتیں بھی خراب ہیں، تو حکومت ان کے لئے بہت ہلکے قوانین مقرر کرتی ہے، اور بہت سی رعایتیں اور سہولتیں دیتی ہے، لیکن جب کچھ عرصہ کے بعد مُلک ترقی کر جاتا ہے اور لوگوں کی حالت کچھ اچھی ہو جاتی ہے تو پھر اس حالت کے مطابق نیا قانون بنا دیا جاتا ہے، اب اس نئے قانون کے بعد اگر کوئی انسان اُسی پہلے قانون پر چلے اور نئے قانون کو نہ مانے، تو وہ مجرم اور سزا کے قابل ہوگا، کیونکہ وہ حکومت کی نافرمانی کرتا ہے اور حکومت کے امتیازی اختیارات خود استعمال کرنا چاہتا ہے۔

بس انبیاء علیہم السّلام کی لائی ہوئی شریعتوں کا حال بھی ایسا ہی سمجھ لیجئے، اللہ تعالیٰ نے کسی قوم اور کسی زمانہ کے لوگوں کی حالت کے مطابق اپنے کسی پیغمبر کے ذریعہ ایک قانون بھیجا، پھر ایک مدت کے بعد جب حالات کچھ بدل گئے، اور دوسرے پیغمبر کو بھیجا گیا، تو قانون میں بھی کچھ تبدیلی کر دی گئی، تو اُس وقت بندوں کا فرض ہوگا کہ ایمان تو پہلے پیغمبروں پر بھی لائیں، اور احترام سب کے لائے ہوئے قوانین کا کریں (کیونکہ سب اللہ ہی کے قوانین ہیں) لیکن ہر زمانہ میں پابندی اُسی قانون کی کی جائے گی جو اُس وقت کے نبی کے ذریعہ اس زمانہ کے لئے اللہ کی طرف سے آیا ہوا ہوگا، حتیٰ کہ اگر پہلے کوئی پیغمبر بھی اپنی قبر سے اُٹھ کر بعد والے زمانہ میں آجائیں تو ان کو بھی اسی بعد والے قانون کی اور بعد والی شریعت کی پیروی اور پابندی کرنی پڑے گی، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

"لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا مَا وَسِعَهٗ اِلَّا اتِّبَاعِيْ"۔

مسند احمد و شعب الایمان للبیھقی (مشکوٰۃ)

یعنی اللہ کے جلیل القدر پیغمبر موسیٰ علیہ السلام بھی اگر آج زندہ ہوتے
تو ان کو بھی میری ہی شریعت کی پیروی کرنی ہوتی۔

اور یہی وجہ ہے کہ آخر زمانہ میں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام صحیح حدیثوں کی اطلاع کے مطابق اس دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے تو ان کا عمل شریعت محمدیؐ ہی پر ہوگا کیونکہ اس زمانہ اور اس دور کے لئے حکم خداوندی یہی ہے، اور پہلی شریعتوں اور پہلے الٰہی قوانین کو خود اللہ تعالیٰ نے منسوخ قرار دے دیا ہے، اور اب ان پر چلنا گویا خدا کی نافرمانی ہے۔

بہر حال یہ ایک ایمانی اصول ہے کہ ایمان تو بلا تفریق اللہ کے سب پیغمبروں پر لایا جائے اور سب کا ادب واحترام یکساں طور پر کیا جائے، چاہے وہ کسی قوم اور کسی ملک میں اور کسی زمانہ میں آئے ہوں، اور چاہے ان کی زبان کوئی رہی ہو، لیکن پیروی ہر زمانہ میں صرف اُس پیغمبر کی شریعت کی جائے جو اُس دور اور اُس زمانہ کا پیغمبر ہو۔

## انبیاء شریعت ساز نہیں بلکہ شریعت رساں ہوتے ہیں

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا اُس سے ایک بات آپ کو یہ بھی معلوم ہوگئی کہ انبیاء علیہم السلام شریعت ساز نہیں ہوتے بلکہ شریعت رساں ہوتے ہیں، یعنی اُن کا منصب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی طرف سے عقائد یا احکام تجویز کریں، بلکہ وہ اللہ کی طرف سے صرف لانے والے اور پہنچانے والے ہوتے ہیں، اور اپنی جانب سے وہ اس میں کوئی کمی بیشی اور کسی قسم کا تغیر وتبدل بھی نہیں کرسکتے۔

قرآن مجید میں کئی جگہ یہ مضمون ہے کہ کفار مکہ رسول اللہ ﷺ سے کبھی کبھی کہتے تھے کہ آپ جو کچھ ہمیں سناتے اور بتلاتے ہیں اس میں سے بعض باتیں ہمیں پسند نہیں، اگر آپ ان میں ہمارے حسب منشا کچھ ترمیم وتبدیلی کردیں، تو ہم بھی آپ کے ساتھ ہوجائیں گے۔ تو رسول اللہ ﷺ اس کا جواب دیتے تھے کہ میرا کام تو صرف اللہ کی بات کو جوں کا توں پہنچانا ہے، مجھے کسی ترمیم وتبدیلی کا بالکل اختیار نہیں۔ چنانچہ اس بارے میں ایک جگہ ارشاد ہے:۔

"قُلْ مَا يَكُونُ لِيٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِيْ ج اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ" ——— (یونس۔ ع۔۲)

یعنی میں اپنی طرف سے ذرا بھی ردّ و بدل نہیں کر سکتا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ مجھے وحی کی جاتی ہے اور جو حکم بھیجا جاتا ہے میں تو بالکل اسی کی پیروی کرتا ہوں۔

ایک دوسرے موقع پر قرآن مجید میں فرمایا گیا:۔

"وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○ "۔(النجم۔ع ۱)

یعنی ہمارے یہ رسول دین کی جو تعلیم دیتے ہیں تو یہ ان کے اپنے جی کی باتیں نہیں ہیں، بلکہ یہ وحی ہے جو ہماری طرف سے ان کی طرف بھیجی جاتی ہے[1]

الغرض انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جو احکام وہ لاتے ہیں وہ اُن کے اپنے تجویز کیے ہوئے احکام نہیں ہوتے بلکہ اللہ کے احکام ہوتے ہیں، اور وہ اُن کے صرف لانے والے اور پہنچانے والے ہوتے ہیں۔

## انبیاءؑ کے اجتہاد کی حیثیت

ہاں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی معاملہ پیش آ گیا اور اس بارے میں وحی کے ذریعہ

---

[1] بعض لوگوں کی گفتگوؤں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس آیت کا مطلب شاید یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جو کچھ کلام فرماتے تھے وہ سب وحی ہوتا تھا، اور وحی کے سوا آپ کوئی لفظ بولتے ہی نہ تھے۔ یہ بات اس طرح صحیح نہیں ہے۔ بلکہ آیت کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپ پیغمبرانہ حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کلام فرماتے ہیں اور جو احکام پہنچاتے ہیں وہ سب وحی ہے، اس میں ایک بات بھی ایسی نہیں ہوتی جو آپ اپنی طرف سے اور اپنی طبیعت سے فرماتے ہوں، الغرض اس آیت کا تعلق اُن ہی باتوں سے ہے جو آپ اللہ تعالیٰ کے حکم اور پیغام کی حیثیت سے پہنچاتے تھے، ورنہ اپنے اہل خانہ سے اور اپنے خدام اور اصحابِ کرامؓ سے آپ جو نجی گفتگوئیں فرماتے تھے، ظاہر بات ہے کہ وہ وحی الٰہی نہیں ہوتی تھی۔

کوئی واضح حکم ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں آیا ہوا ہے، تو اس صورت میں وہ اجتہاد بھی کرتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام ان کے پاس پہلے آ چکے ہیں، اور جو علم پہلے مل چکا ہے وہ اس کی روشنی میں غور و خوض کر کے اس معاملہ کا حکم بیان فرماتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ وہ اپنی طبیعت سے اور اپنی ذاتی رائے سے جو چاہیں فیصلہ فرمادیں اور حکم دے دیں، بلکہ پہلے آئے ہوئے اللہ کے احکام ہی سے جو کچھ ان کی سمجھ میں آتا ہے اسی کو وہ شریعت کے حکم کی حیثیت سے بیان فرمادیتے ہیں۔ اور انبیاء علیہم السّلام کے ایسے اجتہادات عموماً صحیح ہی ہوتے ہیں، اور اگر کبھی لغزش ہوتی ہے تو فوراً وحی کے ذریعہ اُن کو اطلاع دے دی جاتی، اور اس کی تصحیح کر دی جاتی ہے، اور جب وحی کے ذریعہ کوئی تصحیح نہ کی جائے تو یہ متعین ہو جاتا ہے کہ حکمِ الٰہی وہی ہے جو نبی نے اپنے اجتہاد سے سمجھا، اور پھر وہ مسئلہ اجتہادی نہیں رہتا، بلکہ "مُلْحَقْ با لوحی" ہو جاتا ہے، یعنی اس کا ذریعہ وہی ہوتا ہے جو وحی کے ذریعہ آنے والے احکام کا ہوتا ہے۔

## آئمہ مجتہدین کا اجتہاد

جب اجتہاد کا ذکر آ گیا ہے تو یہیں آئمہ کے اجتہاد کی نوعیت اور حیثیت کو بھی سمجھ لیا جائے۔

کچھ مسائل تو وہ ہیں جو قرآن مجید میں یا رسول اللہ ﷺ کی سنّت میں صاف طور سے بیان کر دیئے گئے ہیں، ان کے بارہ میں تو اجتہاد کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، لیکن ان کے علاوہ بہت سے ایسے حوادث اور واقعات پیش آتے ہیں جن کا حکم قرآن پاک میں، یا احادیث نبوی میں نہیں ملتا، تو ان کے بارے میں مجتہدین کو اجتہاد سے کام لینا پڑتا ہے، یعنی ان حضرات نے قرآن و حدیث سے تشریع اور قانون سازی کے جو اصول اور اس کی جو بنیادیں سمجھی ہیں وہ ان سے ان حوادث اور واقعات کا حکم نکالتے ہیں۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی اور والی بنا کر بھیجا تو اُن سے دریافت کیا کہ:۔

"تمھارے سامنے جو مقدمات اور مسائل آئیں گے اُن کا فیصلہ تم

کس طرح کیا کرو گے؟"۔

انھوں نے عرض کیا، کہ:۔

"پہلے تو میں کتاب اللہ کی طرف اور اس کے بعد آپ کی سنّت کی طرف یعنی آپ کے طرزِ عمل اور آپ کے ارشادات اور فیصلوں کی طرف رجوع کروں گا اور اگر دونوں جگہ سے مجھے اُس معاملہ کا حکم نہیں ملے گا تو پھر میں اجتہاد کروں گا"۔

آنحضرت ﷺ اُن کے اِس جواب سے بہت خوش ہوئے، اور ان کو شاباش دی، اور اللہ کی حمد کی، اور اُس کا شکر ادا کیا [۱]۔ یہ حدیث گویا مجتہدین کے اجتہاد کی بنیاد ہے۔

## امت کے مجتہدین

جن صحابہ کرام کو رسول اللہ ﷺ کی تعلیم و تربیت میں فقاہت کا مقام حاصل ہو گیا تھا وہ سب حسبِ ضرورت اجتہاد فرماتے تھے، پھر پہلی صدی ہجری کے آخر میں اور دوسری صدی اور اس کے بعد بھی ایسی بہت سی شخصیتیں پیدا ہوئیں جنھوں نے اپنی زندگی کا سرمایہ اس کام پر لگا دیا اور انھوں نے دین کی یہی خاص خدمت کی کہ قرآن و حدیث میں اور فقہاء صحابہ کے طرزِ عمل میں غور کر کے تشریع کے اصول نکالے اور پھر اُن کی روشنی میں ان مسائل کا حکم دریافت کرنے کی کوشش کی جن کا قرآن و حدیث میں واضح بیان ہم کو نہیں ملتا، اور اس طرح شریعت اسلامی کا فقہ مرتب اور مدوّن ہوا۔ دین کی یہ خدمت اور کوشش بہت سے مجتہدین نے کی تھی، لیکن ان میں سے آئمہ اربعہ کا فقہ غالباً زیادہ مرتب اور جامع ہونے کی وجہ سے زیادہ مقبول ہوا۔

## اجتہاد کا حق کس کو ہے؟

اجتہاد کے سلسلہ میں ایک یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ یہ ہر ایک کا کام نہیں ہے، جن بزرگوں نے یہ کام کیا، ان کا کتاب و سنت کا علم نہایت ہی وسیع تھا، انھوں نے ان لوگوں کو دیکھا تھا، بلکہ ان ہی سے علم دین حاصل کیا تھا جنھوں نے دینی تعلیم و تربیت براہِ راست

---

[۱] ترمذی وابوداؤد (مشکوٰۃ)

صحابۂ کرامؓ سے یا اُن کے خاص شاگردوں سے حاصل کی تھی، پھر اس مستند اور وسیع علم اور اس تعلیم و تربیت کے علاوہ ان میں تعلق باللہ اور تقویٰ اعلیٰ درجہ کا تھا، دراصل یہ کام اُنھیں کا تھا جن سے اللہ تعالیٰ نے اس کو لیا۔

## نئی روشنی کے بے علم مجتہد

لیکن آج اجتہاد کو ایسی معمولی بات سمجھ لیا گیا ہے کہ بعض لوگ دین سے متعلق اردو کے صرف چند رسالے پڑھ کے یا زیادہ سے زیادہ قرآن و حدیث کے چھپے ہوئے ترجمے دیکھ کے اپنے کو اجتہاد کا حق دار سمجھنے لگتے ہیں اور مسائل میں بالکل مجتہدانہ انداز میں رائے زنی کرتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں حدیث شریف آیا ہے، کہ:۔

"ضَلُّوا وَاَضَلُّوا" ـــــــ صحیح بخاری و صحیح مسلم (مشکوٰۃ)

وہ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

اجتہاد اور مجتہدین کا یہ ذکر تو انبیاء علیہم السّلام کے اجتہاد کے تذکرہ کے ساتھ جملہ معترضہ کے طور پر یہاں آ گیا، ورنہ اس وقت موضوع بحث تو نبوت و رسالت ہے، اور اسی سے متعلق کچھ ضروری باتیں ابھی مجھے اور عرض کرنی ہیں۔

## نبوت وہبی ہے، کسبی نہیں

نبوت کے متعلق ایک بات یہ بھی سمجھنے اور جاننے کی ہے کہ وہ وہبی ہے کسبی نہیں، اِس کو آپ یوں سمجھئے کہ اس دنیا میں کچھ چیزیں تو ایسی ہیں جن کو کسب اور کوشش سے حاصل کیا جاتا ہے (یعنی اگرچہ وہ ملتی تو ہیں اللہ تعالیٰ ہی کے حکم اور اس کی عطا سے، لیکن ان کے حاصل ہونے میں انسان کی سعی اور کوشش کو بھی کچھ دخل ہوتا ہے) مثلاً کوئی خاص علم اور فن حاصل کرنا، یا کھیتی کے ذریعہ غلّہ حاصل کرنا، یا صنعت و تجارت کے ذریعہ دولت پیدا کرنا، تو ایسی تمام چیزوں کو کسبی کہا جاتا ہے، اور کچھ چیزیں وہ ہیں جو محض اللہ کی عطا سے حاصل ہوتی ہیں اور کسی کی کوشش اور جدوجہد کو اُن کے حاصل کرنے میں کوئی دخل نہیں ہوتا، جیسا کہ مثلاً پیدائشی

خوبصورتی، فطری ذہانت اور دانشمندی، تو اس قسم کی چیزوں کو وہبی کہا جاتا ہے، اور نبوّت اسی قسم کی چیز ہے، یعنی وہ سعی اور کوشش سے حاصل نہیں کی جاتی، بلکہ وہ محض اللہ تعالیٰ کی عطا سے کسی کو ملتی ہے۔

## معجزات

نبوت کے سلسلہ میں معجزات کو بھی سمجھ لینا چاہئے، کبھی کبھی انبیاء علیہم السّلام کے ہاتھوں پر ایسے غیر معمولی واقعات ظاہر ہوتے ہیں جو ان کی اپنی حیثیت اور طاقت سے بالاتر ہوتے ہیں، یعنی ان جیسا دوسرا انسان ان کو کر کے نہیں دکھا سکتا، ایسے واقعات کو معجزات کہتے ہیں۔

## معجزہ نبی کا نہیں، بلکہ اللہ کا فِعل ہوتا ہے

اور یہ معجزات اُس نبی کا ذاتی فعل نہیں ہوتے بلکہ درحقیقت اللہ کا فِعل ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اِن کے ذریعہ اپنے اُس پیغمبر کی سچائی ظاہر فرماتا ہے۔ ہماری عقائد کی کتابوں میں معجزہ کی تعریف عام طور سے یہی کی گئی ہے کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فِعل ہوتا ہے، جو اُس کے بھیجے ہوئے نبی کی سچائی اور صداقت ظاہر کرنے کے لئے اُس نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے، بہر حال معجزہ کا وجود اور ظہور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور وہ براہ راست اُسی کا فِعل ہوتا ہے، اور نبی صرف اُس کے مظہر ہوتے ہیں۔

## معجزہ بھی انسانوں کی ضرورت ہے

انسانوں میں بعض طبیعتیں ایسی غبی اور اس درجہ کم فہم ہوتی ہیں، جو کسی پیغمبر کی پیغمبری کی جب ہی قائل ہوتی ہیں جب اس کے ہاتھوں پر بعض ایسے غیر معمولی واقعات ظاہر ہوں، تو اللہ تعالیٰ ایسے غبیوں کے لئے اپنے نبیوں کو معجزات بھی دیتے ہیں، اور جو لوگ ذکی اور سلیم الفطرت ہوتے ہیں اُن کو پیغمبر کی تصدیق کے لئے کسی معجزہ کی بالکل ضرورت نہیں ہوتی، اُن کے لئے پیغمبر کی زندگی اور اس کا پیغام ہی معجزہ ہوتا ہے، اکابر صحابہ میں غالبًا ایک بھی ایسے نہیں ہیں جن کو ایمان لانے کے لئے معجزہ دیکھنے کی ضرورت ہوئی ہو۔ بہر حال معجزہ پیغمبر کی یا پیغمبری کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ غبی انسانوں کی ضرورت ہے، اسی لئے یہ

ممکن ہے کہ کسی پیغمبر کے ہاتھ پر کوئی بھی معجزہ ظاہر نہ ہو، اور اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ کے ایک رسول جن کا درجہ بڑا اور بلند ہو اُن کو معجزے کم دیئے جائیں، اور جن کا درجہ اتنا بلند نہ ہو، اُن کی قوم میں غبیوں اور بیوقوفوں کی کثرت کی وجہ سے معجزے زیادہ دے دیئے جائیں۔

الغرض معجزہ نہ تو نبی کا فعل ہے نہ نبوت کی شرط ہے، اور نہ فضیلت کا معیار ہے، بلکہ جیسا کہ عرض کیا گیا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبیوں کی سچائی کی شہادت اور نشانی کے طور پر حسب ضرورت ظاہر کیا جاتا ہے، اور جب اللہ چاہتا ہے جب ہی ظاہر ہوتا ہے، اسی سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ معجزہ دکھانا نبی کے اپنے اختیار میں بھی نہیں ہے، کہ نبی جب چاہے معجزہ دکھادے، بلکہ وہ صرف اللہ ہی کے قبضہ اور اختیار میں ہے۔

## قرآن مجید کا بیان کہ معجزے اللہ ہی کے اختیار میں ہیں

قرآن مجید میں اس کا جابجا ذکر ہے کہ مکہ کے شریر اور معاند کافر رسول اللہ ﷺ سے کہتے تھے کہ اگر آپ سچے نبی ہیں تو فلاں معجزہ دکھایئے، فلاں معجزہ دکھایئے! اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہی فرماتے تھے کہ معجزے دکھانا میرے اختیار میں نہیں ہے، نہ میں اسکا دعویٰ کرتا ہوں، میرا کام تو صرف اللہ کا پیغام پہنچانا ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں تفصیل سے بیان فرمایا گیا ہے کہ کافروں نے آپ سے کیا کیا معجزے دکھانے کی فرمائش کی، اور آخر میں آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہے:۔

"قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا" (بنی اسرائیل۔ع ۱۰)

آپ ان جاہلوں سے کہہ دیجئے کہ میں تو بس اللہ کا پیغام پہنچانے والا ایک انسان ہوں، ہاں میرے بھیجنے والے پروردگار کے قبضہ میں سب کچھ ہے، اور وہ ہر نقص اور کمزوری سے پاک ہے۔

مطلب یہ ہے کہ میں نے کب دعویٰ کیا ہے کہ ایسے معجزے دکھانا بھی میرے قبضہ میں ہے جو تم مجھ سے ایسی لغو فرمائشیں کرتے ہو۔ اسی طرح ایک دوسرے موقع پر آپ کو حکم دیا گیا:۔

"قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ" ——— (عنکبوت۔ع ۵)

یعنی آپ ان جاہلوں سے کہہ دیجئے کہ جو نشانیاں اور معجزے تم چاہتے ہو وہ اللہ

ہی کے پاس اور اُسی کے قبضہ میں ہیں، وہ جب چاہے دکھائے یا نہ دکھائے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں میرے اختیار سے باہر ہیں، اس لئے تمھارا مجھ سے یہ فرمائشیں کرنا غلط ہے۔

معجزہ ہی کے ساتھ کرامت اور استدراج کو بھی سمجھ لینا چاہئے:۔

## کرامت

جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی سچائی ظاہر کرنے کے لئے اس کے ہاتھ پر ایسے غیر معمولی اور خارق عادت واقعات ظاہر کرتا ہے جو اُس جیسے دوسرے انسانوں سے نہیں ہو سکتے، اور ان کے ظہور سے غبی سے غبی انسان بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ درحقیقت یہ اللہ کا نبی ہے اور اللہ کی تائید اس کے ساتھ ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے کسی سچے نبی کے بعض نیک اور مقبول اُمتیوں کے ہاتھ پر بھی کبھی کبھی ان کی مقبولیت کی نشانی کے طور پر ایسے خارق عادت واقعات ظاہر فرما دیتا ہے، بس ان ہی واقعات کو کرامت کہتے ہیں، اور جس طرح معجزہ نبی کا ذاتی اور اختیاری فعل نہیں ہوتا بلکہ اللہ کا فعل ہوتا ہے، اسی طرح کرامت بھی ولی کا فعل نہیں ہوتا بلکہ اللہ کا فعل ہوتا ہے، اور اللہ ہی کے ارادہ اور اختیار سے اُس کے مقبول بندہ کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے، اور وہ صرف اُس کا مظہر ہوتا ہے۔ عقائد اور تصوّف کی کتابوں میں کرامت کی تعریف ہی یہ کی جاتی ہے، کہ:۔

"هُوَ فِعْلُ اللّٰهِ تَعَالٰى خَارِقٌ لِلْعَادَةِ يَظْهَرُ عَلٰى يَدِ عَبْدٍ ظَاهِرِ صَلَاحُهُ وَتَقْوَاهُ"

جس کا مطلب یہ ہوا کہ کرامت اللہ کا وہ غیر معمولی اور خارق عادت فعل ہے جو اُس کے کسی ایسے بندہ کے ہاتھ پر ظاہر ہو جس کی زندگی بالکل علانیہ طور پر صلاح وتقوے کی زندگی ہو۔

## ولی کون ہوتا ہے؟

اسلامی شریعت اور قرآن وحدیث کی اصطلاح میں ایسے ہی شخص کو ولی کہا جاتا ہے، اور اس کے ہاتھ پر جو غیر معمولی واقعات ظاہر ہوں بس اُن کو کرامت کہا جاتا ہے، بغیر صلاح

وتقویٰ اور بغیر اتباعِ شریعت کے ولایت اور کرامت کا کوئی امکان نہیں ہے، قرآن مجید میں صاف ارشاد ہے:۔

"اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ o
اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ o ـــــــــــ (یونس۔ع۷)

اللہ کے ولیوں کو نہ خوف ہوگا نہ غم، وہ ولی وہ لوگ ہیں جو صاحبِ ایمان اور صاحب تقویٰ ہیں، یعنی پیغمبرِ وقت پر جو ایمان لائے ہوئے ہیں اور خدا سے ڈرتے اور اُس کی شریعت پر چلتے ہیں۔

تو ایسے بندگانِ خدا کے ہاتھ پر اگر کوئی غیر معمولی اور خارقِ عادت چیز ظاہر ہو تو وہ کرامت کہلاتی ہے، اور وہ ان کی ولایت اور مقبولیت کی نشانی ہوتی ہے۔

## استدراج

اور جن لوگوں کی زندگی میں تقویٰ اور اتباعِ شریعت علانیہ طور سے نہ ہو، اور اس کے باوجود اُن سے ایسی چیزیں ظاہر ہوں، تو اگر وہ جادو اور شعبدے کے قسم کی کوئی فنی چیز اور کوئی کرتب نہیں ہے تو پھر بندوں کے ابتلاء اور امتحان کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے استدراج ہے، جیسا کہ حدیثوں میں دجّال کے متعلق آتا ہے کہ وہ اپنے حکم سے بارش برسا کے اور مُردے زندہ کر کے دکھلائے گا۔ تصوف کی کتابوں میں حضرت بایزید بسطامیؒ سے نقل کیا گیا ہے آپ فرماتے تھے:۔

"لو نظرتم الیٰ رجل اعطی من الکرامات حتّٰی یرتقی فی الهواء فلا تغتروا به حتّٰی تنظرونه کیف تجدونه عند الامر والنهی وحفظ الحدود واداء الشریعة"۔

(فتوحاتِ مکیہ (تعلیم الدین)

اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ اُس کے ہاتھ پر کرامتیں یعنی خارقِ عادت امور ظاہر ہوتے ہیں یہاں تک کہ وہ ہوا میں اُڑتا ہے تو دھوکا نہ کھانا (اور صرف ان باتوں کو دیکھ کر اُس کو ولی اور اللہ کا مقبول بندہ نہ سمجھ لینا)

جب تک یہ نہ دیکھ لو کہ اللہ کے احکام، اوامر ونواہی اور اللہ کے مقرر کئے ہوئے حدود کے بارے میں اُس کا طرزِ عمل کیا ہے، اور شریعت پر ٹھیک ٹھیک چلتا ہے یا نہیں۔

## کرامت ولایت کی شرط نہیں ہے

کرامت کے متعلق ایک بات یہ بھی یاد رکھنی چاہئے کہ ہر ولی سے کرامت کا ظہور بالکل ضروری نہیں، بلکہ اکثر اولیاء اللہ وہی ہوتے ہیں جن سے مدّت العمر میں کوئی کرامت بھی ظاہر نہیں ہوتی، بلکہ ہوسکتا ہے کہ ایسا ولی جس سے کوئی کرامت ظاہر نہ ہوئی ہو درجہ میں اُس دوسرے ولی سے بڑا ہو جس سے بہت سی کرامتیں ظاہر ہوئی ہوں، فضیلت کا معیار بس تقویٰ ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقَاکُمْ۔

## اولیاءُ اللہ سے عناد کا نتیجہ، خدا دشمنی ہے

اِسی جگہ ایک بات یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ کسی ولی کو ولی ماننا شرطِ ایمان تو نہیں ہے، لیکن جو واقعی اولیاءُ اللہ ہیں خواہ وہ اس دنیا سے جا چکے ہوں یا موجود ہوں، اُن سے عداوت اور بغض وعناد رکھنا سخت محرومی اور بڑا وبال ہے، صحیح حدیث قدسی ہے:۔

"مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ" ——— (صحیح بخاری)

(یعنی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے) "جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی تو میری طرف سے اُس کو اعلانِ جنگ ہے"۔

اس لئے اولیاءُ اللہ کے ساتھ ہمارا روّیہ ہمیشہ ادب اور عظمت کا ہونا چاہئے، ہاں اس کی گنجائش ہے ادب اور عظمت کے باوجود کسی خاص معاملہ میں ہمیں اُن کی رائے سے اختلاف ہو، کیونکہ وہ پیغمبروں کی طرح معصوم اور واجب الاطاعت نہیں ہیں۔

یہاں ولایت وکرامت کا یہ تذکرہ تو ضمناً آگیا تھا، اور بیان معجزہ کا ہو رہا تھا۔ معجزہ کی حقیقت اور نوعیت تو آپ سمجھ چکے، اب آگے رسول اللہ ﷺ کے معجزات کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔

## رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات

تاریخ اور سیرت کی روایات کے علاوہ صحیح احادیث میں بھی رسول اللہ ﷺ کے بہت سے روشن معجزات کا ذکر ہے، اور وہ چیزیں اتنی مشہور ہیں کہ آپ حضرات اُن کو یقیناً جانتے ہوں گے، اس لئے یہاں میں اُن کے ذکر کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا، وہ سب اَب تاریخی باتیں ہیں، اور اس وقت کی دنیا کے سامنے نہیں ہیں۔ میں یہاں حضور ﷺ کے صرف اُس زندۂ جاوید معجزے کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں جو اس وقت بھی اپنی اُسی اعجازی شان کے ساتھ زندہ ہے اور حضورؐ کی نبوت کی دلیل دے رہا ہے جس شان کے ساتھ وہ اَب سے قریباً ساڑھے تیرہ پونے چودہ سو برس پہلے ظاہر ہوا تھا، یعنی ''قرآن مجید''۔

## قرآن مجید بحیثیتِ معجزہ

اگرچہ اتنی بات اجمالی طور پر ہر مسلمان جانتا ہے اور اُس پر عقیدہ رکھتا ہے کہ قرآن شریف حضورؐ کا معجزہ ہے، لیکن میں اس وقت آپ کے سامنے اس کی کچھ تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔

## اعجاز قرآن کے چند عام فہم پہلو

قرآن پاک بہت سے پہلوؤں سے معجزہ ہے، لیکن میں اس وقت صرف اُن پہلوؤں کو بیان کرنا چاہتا ہوں جن کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے اور جن پر غور کر کے ہر منصف مزاج آنحضرت ﷺ کی صداقت کا یقین آج بھی حاصل کر سکتا ہے۔

## قرآن پاک کی معجزانہ محفوظیت

میں سب سے پہلے قرآن مجید کی محفوظیت کو لیتا ہوں، یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ قرآن مجید کے زیادہ تر مضامین وہ ہیں جن سے اُس دور کے اہلِ عرب ناواقف اور نامانوس تھے، پھر اُس کی زبان اگرچہ عربی ہے، لیکن اُن کی بول چال والی عربی اور ان کی شاعری اور خطابت کی زبان سے بھی بہت زیادہ ممتاز اور نرالی ہے، یہاں تک کہ جاننے والے اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ حدیث کی، یعنی خود رسول اللہ ﷺ کی زبان

اور قرآن مجید کی زبان اور طرزِ بیان میں بھی بہت بڑا فرق ہے، اِن وجوہ سے قرآن مجید کا حفظ کرنا اہلِ عرب کے لئے بھی زیادہ آسان نہ تھا، پھر قرآن، لکھے ہوئے صحیفہ کی شکل میں نازل نہیں ہوا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے رسول اللہ ﷺ کے قلبِ مبارک پر نازل کیا گیا، پھر چونکہ عرب میں اس وقت لکھنے پڑھنے کا عام رواج نہ تھا، اسلئے ایسا بھی نہیں ہوا کہ اس کے متعدد نسخے ساتھ ساتھ تیار ہوتے رہے ہوں، انتہا یہ ہے کہ خود حضورؐ لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے تھے، اس لئے آپ نے کبھی قرآن مجید کی ایک آیت بھی قلمبند نہیں کی۔ اور اگر کبھی کسی دوسرے نے کوئی آیت یا سورت لکھی، تو آپ خود اُس کو ملاحظہ فرما کے اس کی تصحیح نہیں فرما سکتے تھے، پھر وہ دو چار ورق کا کوئی چھوٹا سا صحیفہ نہیں بلکہ اچھی خاصی ضخیم کتاب ہے، ان سب تاریخی حقیقتوں کو سامنے رکھ کر سوچا جائے کہ جس کتاب کی یہ تاریخ اور یہ سرگذشت ہو اُس کا چودہ سو برس تک اِس طرح محفوظ رہنا کہ مشرق و مغرب، عرب و عجم، یورپ و ایشیاء، افریقہ و امریکہ، ہر جگہ کے مسلمانوں کے پاس ایک ہی قرآن ہے، جس میں اوّل سے آخر تک، ایک آیت بلکہ ایک حرف کا بھی فرق نہیں ہے، تو انصاف پسندوں کے لئے سوچنے کی بات ہے کہ کیا یہ اس بات کی روشن دلیل نہیں ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتاب ہے، اور صرف اللہ کی قدرت نے اس کو اس طرح محفوظ رکھا، ورنہ اس عالم میں جو ہر قسم کے انقلابات اور تغیرات کی آماجگاہ رہا ہے اس کو اس طرح محفوظ نہ رہنا چاہئے تھا، اِسی لئے قرآن کے سوا کسی اور کتاب کا کوئی نام نہیں بتا سکتا جس کی ایسی تاریخ اور سرگذشت ہو اور پھر وہ ایسی محفوظ ہو۔

## اس کی معجزانہ علمی شان

قرآن مجید کے اعجاز کا دوسرا پہلو اُس کی معجزانہ علمی شان ہے، آپ اس پر یوں غور کیجئے کہ قرآن پاک کو خدا کی کتاب بتلاتے ہوئے ایک ایسے شخص نے دنیا کے سامنے پیش کیا جو زندگی کے کسی ایک دن میں بھی کسی مدرسہ کا طالب علم نہیں رہا، بلکہ ایک ایسی بستی میں پیدا ہوا جس میں کوئی مدرسہ اور مکتب نہ تھا، نہ علمی چرچے تھے، نہ علمی صحبتیں تھیں، نہ تحصیل علم کے لئے وہ کہیں باہر گیا، وہ اپنی عمر کے چالیسویں سال تک علوم و معارف سے اسی طرح بیگانہ، اپنی سادہ فطرت پر ایک نہایت شریف اور سچا انسان تھا، عمر کے چالیس سال پورے ہونے پر

اچانک اُس کی زندگی اور اُس کے طرزِ عمل میں ایک غیر معمولی تبدیلی ہوئی، اور اس نے بتایا کہ اللہ نے اُس کو نبوت سے سرفراز کیا ہے، اور اُس پر وحی آتی ہے، اَب اُس نے اپنی بستی والوں کو قرآن مجید سنانا شروع کیا اور کہا کہ یہ میرا کلام نہیں بلکہ اللہ کا کلام ہے، وہی کلام قرآن مجید کے نام سے ہمارے سامنے موجود ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ اس میں اللہ کی توحید اور ذات وصفات کے متعلق جو کچھ دنیا کو بتایا گیا ہے وہ بلا شبہ علم و معرفت کا آخری نقطہ ہے، اور اس بارے میں ہم پوری علمی دنیا کو چیلنج کر سکتے ہیں، پھر اس میں مشکل سے مشکل مسائل کو مثلاً آخرت اور حشر نشر کو جس طرح سمجھایا گیا ہے وہ تفہیم واستدلال کا عجیب وغریب نمونہ ہے، اسی طرح اس میں جو اخلاقی نصیحتیں ہیں، کسی بڑے سے بڑے حکیم اور معلّم اخلاق کی نصیحتیں اس سے بہتر بلکہ اس درجہ کی بھی نہیں دکھلائی جاسکتیں، پھر اس میں جو قانون ہے، انسانوں کے لئے اس سے بہتر قانون نہ آج تک وضع ہوا ہے، نہ وضع ہوسکتا ہے، ہم اس مسئلہ پر بھی دنیا کو چیلنج کر سکتے ہیں کہ انسانوں کی فطرت کے لئے کوئی قانون بھی قرآن کے پیش کردہ قانون سے بہتر وضع نہیں کیا جاسکتا۔

اسی طرح عبادات کا جو نظام قرآن مجید میں انسانوں کے لئے پیش کیا گیا ہے اگر دنیا بھر کے سوچنے والے بھی سوچیں تو ہرگز اس سے بہتر نہیں سوچ سکتے، صرف نماز ہی پر غور کیا جائے اور اس کی ترتیب اور اس کے اذکار میں تفکر اور تدبر کیا جائے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے اور اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ یہ نسخہ کیمیا ہرگز ایک اُمّی انسان کا تصنیف کیا ہوا نہیں ہوسکتا۔ بہرحال قرآن مجید کے اعجاز کا یہ ایک نہایت عام فہم پہلو ہے کہ اس میں جو علوم ومعارف اور جو نصائح اور قوانین ہیں اور انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق جو تعلیمات اور ہدایات ہیں اُن کو ہرگز عرب کے ایک ایسے اُمّی کی دماغی محنت اور سوچ فکر کا نتیجہ نہیں کہا جاسکتا جس نے نہ کبھی کوئی کتاب پڑھی نہ کسی لکھے پڑھے آدمی کی کبھی اُسے صحبت ملی۔ ایک ایسے سادہ فطرت اُمّی کے ہاتھوں سے قرآن پاک جیسے علمی شاہکار کا ملنا علمی دنیا کی نگاہ میں مُردوں کو جلانے اور اندھوں کو سہانکا کرنے سے بھی بڑا معجزہ ہے، اور آپ کو یہ زندۂ جاوید علمی معجزہ اسی لئے دیا گیا کہ آپ کا دور علمی روشنی کا دور ہے پہلی دنیا عجیب باتوں اور

محیر العقول کرشموں سے زیادہ متاثر ہونے والی تھی، اور ہماری یہ دنیا، خاص طور سے ہمارا یہ دورعلوم وفنون کا دور ہے، اوراس زمانہ میں علوم کی قیمت اور وقعت عملی کرشموں سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔

## قرآن پاک کی معجزانہ فصاحت وبلاغت

قرآن پاک کے اعجاز کا ایک مشہور عام پہلو یہ بھی ہے کہ فصاحت اور بلاغت میں وہ آپ ہی اپنی نظیر ہے، اوراُس جیسا فصیح و بلیغ کلام پیش کرنے سے دنیا ہمیشہ عاجز رہی ہے اور عاجز رہے گی۔ یہ بات صرف خوش عقیدگی کی نہیں ہے، بلکہ یہ بالکل سچی حقیقت ہے، عربی زبان وادب کے بے شمار قدیم وجدید نمونے دنیا میں موجود ہیں، مصنفوں کی تصنیفیں ہیں، خطیبوں کے خطبے ہیں، شاعروں کے قصیدے اوراُن کے دیوان ہیں۔ اسی طرح اخلاق پر، تاریخ وسیر پر، قانون پر اور دوسرے موضوعات پر مختلف زمانوں کی لکھی ہوئی عربی کتابیں کتب خانوں میں بھری پڑی ہیں، خود رسول اللہ ﷺ کے چھوٹے بڑے ہزاروں ارشادات اور آپ کے ممتاز صحابۂ کرام کے خطبات اور ملفوظات، احادیث وآثار کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ قرآن مجید کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کو ان سب نمونوں کے ساتھ رکھ کر دیکھا جائے، ہر عربی داں کو بالکل بدیہی طور پر محسوس ہوگا کہ قرآن کا اسلوبِ بیان ان سب سے الگ، سب سے ممتاز اور سب سے بالاتر ہے۔

میں آپ کے سامنے اسی زمانہ کے ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہوں، اس سے انشاءاللہ آپ حضرات بھی قرآن مجید کے اس اعجازی پہلو کو کسی حد تک سمجھ سکیں گے۔ شاید آپ نے علامہ طنطاوی جوہری کا نام سنا ہو، یہ ہمارے اسی زمانہ کے ایک مصری عالم ہیں، ''جواہر القرآن'' کے نام سے ان کی ایک تفسیر ابھی چند برس ہوئے مصر سے شائع ہوئی ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید مغربی علوم خصوصاً سائنس اور فلسفہ پر اُن کی بڑی نظر ہے، اور طبیعات کے تو معلوم ہوتا ہے وہ بڑے ہی ماہر ہیں، انھوں نے خود اپنا یہ واقعہ لکھا ہے کہ میں جرمنی میں تھا، ایک دن وہاں کے چند مستشرق دوستوں کے ساتھ (یعنی عربی زبان اور عربی علوم سے دلچسپی رکھنے والے چند جرمنی فضلاء کے ساتھ) بیٹھا ہوا تھا، ان میں سے ایک ممتاز فاضل نے مجھ سے

پوچھا کہ کیا آپ بھی عام مسلمانوں کی طرح قرآن کے بارے میں یہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ عربیت اور فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے بھی معجزہ ہے؟ میں نے کہا ہاں میں اس پر یقین رکھتا ہوں، اُس نے بڑی حیرت کا اظہار کیا اور کہا میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم جیسا صاحبِ علم اور روشن خیال آدمی بھی ایسا عامیانہ خیال رکھتا ہوگا۔ میں نے کہا اس میں تعجب کی کیا بات ہے یہ تو ایک علمی مسئلہ ہے، اور ابھی اس کا امتحان ہوسکتا ہے، میں ایک بات کہتا ہوں، آپ سب حضرات خوب غور وفکر کر کے اس کو فصیح وبلیغ عربی میں ادا کریں۔ لیجئے وہ بات یہ ہے کہ "جہنم بے حد وسیع ہے" ان سب نے دیر تک غور وفکر کر کے چند جملے بنائے:

"اِنَّ جَهَنَّمَ لَوَسِيْعَةٌ" ـــــــــ "اِنَّ جَهَنَّمَ لَفَسِيْحَةٌ"

اور اس سے ملتے چند اور جملے۔ اور میرے سامنے رکھ دیئے۔ میں نے کہا کہ اور محنت کر لیجئے، اور جتنا جی چاہے وقت لے لیجئے، لیکن انھوں نے کہا کہ ہم اپنی محنت اور غور وفکر ختم کر چکے۔

اس کے بعد میں نے کہا کہ اب ذرا دیکھئے کہ قرآن مجید نے اسی مضمون کو کس طرح ادا کیا ہے۔ ارشاد ہے:۔

"يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَئْتِ وَتَقُوْلُ هَل مِنْ مَزِيْد."

اور اُس دن جبکہ ہم جہنّم سے کہیں گے کہ کیا تو بھر گئی؟ اور وہ کہے گی کیا اور کچھ بھی ہے؟

علّامہ طنطاوی لکھتے ہیں کہ جیسے ہی میں نے سورۂ قٓ کی یہ آیت پڑھی، چونکہ وہ عربی داں اور سخن شناس تھے اُچھل پڑے، اور انھوں نے اپنی رانیں پیٹ ڈالیں، اور اقرار کیا کہ بیشک ہم عاجز رہے۔

بہرحال کسی منصف مزاج عربی داں کو اس میں قطعاً شک نہیں ہوسکتا کہ قرآن مجید اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے بھی معجزہ ہے، اور وہ ہرگز محمد رسول اللہ ﷺ جیسے کسی ایسے امّی انسان کی تصنیف نہیں ہوسکتا جس کو فن شعر وخطابت سے کبھی کوئی تعلق نہ رہا ہو۔

## ان سب پہلوؤں سے قرآن پاک آج بھی معجزہ ہے

قرآن پاک ان سب پہلوؤں سے جس طرح اَب سے پونے چودہ سو برس پہلے کی

دنیا کے لئے معجزہ تھا، بالکل اسی طرح وہ آج کی دنیا کے لئے بھی معجزہ ہے، اور ہم اس کو ہاتھ میں لے کر ساری دنیا کو پکار کر کہتے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت ورسالت چونکہ قیامت تک کے لئے ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس معجزہ کو بھی قیامت تک باقی اور روشن رکھنے کا فیصلہ کیا ہے، اور ختم دنیا تک پیدا ہونے والے سب انسانوں کے لئے یہ اللہ کی حجت ہے، جس کو کوئی شک وشبہ ہو وہ ذرا سے غور وفکر سے کام لے کر اطمینان حاصل کر سکتا ہے اور صداقت اور سچائی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے، اس کے بعد بھی جو لوگ سوچنا اور دیکھنا نہیں چاہتے، وہ وہی ہیں جنھیں اپنے اللہ کو راضی کرنے کی اور اپنے انجام کی کوئی فکر نہیں ہے، اس لئے اُن کا انجام جہنّم کے ابدی عذاب کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

## آنحضرتؐ کا ایک دوسرا زندہ تاریخی معجزہ

رسول اللہ ﷺ کا اسی طرح کا ایک اور عام فہم اور زندہ تاریخی معجزہ وہ محیّر العقول روحانی اور ایمانی انقلاب ہے، جو آپ کے ذریعہ دنیا میں بر پا ہوا تھا، اور تاریخ نے اس کو بعد والوں کے لئے ہمیشہ کے واسطے پوری طرح محفوظ کر دیا ہے۔ اسلام کی اور عرب کی تاریخ جاننے والے دوست دشمن سب جانتے ہیں کہ رسول االلہ ﷺ کی بعثت کے وقت عربوں کی دینی، اخلاقی اور تہذیبی حالت کیا تھی، وہ اللہ سے کتنے بے تعلق اور مرنے کے بعد والی زندگی سے کتنے بے فکر تھے، اُن میں کس درجہ وحشت اور جہالت تھی، لڑائی بھڑائی، لوٹ مار، قتل وغارت، بے حیائی اور بے شرمی، قمار وشراب، ظلم وجفا، اور اسی طرح کے دوسرے فواحش ومنکرات اُن میں کس قدر عام تھے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کی صرف چند سال کی دعوت وتبلیغ اور تعلیم وتربیت نے ان کی کیسی کایا پلٹی، وہ کیسے خدا پرست بن گئے، ان پر فکر آخرت کا کتنا غلبہ ہو گیا، وہ کیسے مہذّب اور حُسنِ اخلاق کا کتنا اعلیٰ نمونہ بن گئے، انصاف اور رحمدلی میں وہ دنیا سے کتنے ممتاز ہو گئے۔ اور اُس وقت کی دنیا کی سب سے بڑی دو شہنشاہیوں روم اور فارس کو زیر کر کے ان کے تخت وتاج کا وارث بن جانے کے بعد بھی وہ کیسے خدا پرست اور خدا ترس بنے رہے۔

تاریخ نے عرب کے اس روحانی اور ایمانی انقلاب کی پوری تفصیلات کو محفوظ رکھا ہے

اور اسلام کا کوئی متعصب سے متعصب دشمن اس تاریخی حقیقت سے انکار کی جرأت نہیں کرسکتا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت سے عربوں کی زندگی میں یہ انقلاب برپا ہوا تھا۔

اور اس کے بعد میں کہتا ہوں کہ یہ بلاشبہ آپ کا معجزہ تھا، اور جس کو اس کے معجزہ ہونے سے انکار ہو وہ اپنے سارے علمی اور عقلی اور روحانی اور مادّی ذرائع کو استعمال کر کے اس سے چھوٹے ہی پیمانے پر ایسا انقلاب سو برس میں برپا کر کے دکھائے۔

## ایک بڑا دلچسپ اور بصیرت افروز مکالمہ

اس سلسلہ میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ میرے علم میں ہے اور اس لائق ہے کہ میں یہاں اُس کا ذکر کروں، اُمید ہے کہ انشاء اللہ اس سے آپ رسُول اللہ ﷺ کے اس معجزے کو بڑی صفائی کے ساتھ سمجھ سکیں گے۔

میرے ایک چچا تھے، حقیقی چچا (اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے) ابھی چند سال ہوئے اُن کا انتقال ہوا ہے، بڑے ذہین اور حاضر دماغ تھے، عالم فاضِل تھے اور فطری مناظر تھے اور طبیب بھی کامیاب تھے، خود انھوں نے مجھے یہ واقعہ سنایا کہ وہ سفر میں تھے اور لکھنؤ کے اسٹیشن پر انھیں کسی ٹرین کے انتظار میں دو تین گھنٹے ٹھہرنا تھا، انھوں نے سوچا کہ یہ وقت کسی کام میں لگنا چاہئے، اور غور کرنے کے بعد یہ طے کیا کہ رسالہ "نگار" کا دفتر تلاش کر کے نیاز فتحپوری صاحب سے کچھ باتیں کی جائیں، چنانچہ تانگہ کرایہ پر کیا اور "نگار" کے دفتر پہونچ گئے، نیاز صاحب موجود تھے، چچا صاحب نے اُن سے کہا کہ میں آپ سے ایک نہایت اہم مسئلہ پر بات کرنا چاہتا ہوں، اور اس کے لئے آپ کا ایک گھنٹہ لینا چاہتا ہوں، نیاز صاحب نے (شاید اُن کی مولویانہ صورت دیکھ کر) پہلے تو اتنا وقت دینے سے انکار کیا، لیکن بالآخر اُن کے اصرار اور اُن کی منطق نے انھیں مجبور کر دیا، اور وہ متوجہ ہو کر بیٹھ گئے۔ چچا صاحب نے اُن سے کہا کہ میں کبھی کبھی آپ کا رسالہ "نگار" دیکھتا ہوں اس لئے آپ کی ذہانت اور آپ کے زورِ قلم اور آپ کی علمی خصوصیات سے واقف ہوں، میں اس وقت آپ

کے پاس اِس لئے آیا ہوں کہ اس صلاحیت اور قابلیت کو ایک بڑے اور بہت مفید کام میں لگانے کی آپ سے درخواست کروں، آپ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں بُرائیاں اور بداخلاقیاں کتنی بڑھ گئی ہیں، اور ساری دنیا کو چھوڑیئے اپنے اسی شہر لکھنؤ کو دیکھئے، خالص انسانی اور اخلاقی نقطۂ نگاہ سے بھی یہاں کے عام باشندے بیچارے کس قدر پست حالت میں ہیں، کتنی بڑی تعداد ہے جو جاہل ہے، اُجڈ ہے، تنگ نظر ہے، گندگی پسند ہے، پھر ہر کام اور ہر پیشہ میں جھوٹ ہے، دھوکہ ہے، خود غرضی ہے، بے ایمانی ہے، غرض جو چیزیں انسانوں میں نہیں ہونی چاہئیں وہ سب موجود ہیں، اور جو اچھی باتیں ہونی چاہئیں وہ بالکل نہیں ہیں، تہذیب نہیں ہے، شرافت نہیں ہے، امانت نہیں ہے، سچائی نہیں ہے، انصاف نہیں ہے، ایسی حالت میں آپ جیسی اعلیٰ قابلیت رکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ سب کام چھوڑ کے اس بگڑی ہوئی انسانیت کو درست کرنے پر اپنی ساری قوتیں لگادیں، آپ جیسے حضرات اگر اس کام کے لئے کھڑے ہو جائیں اور جس طرح منصوبے بنا کر قوموں اور ملکوں میں بڑے بڑے کام کئے جاتے ہیں، اس طرح اس کام کو آپ کریں تو بہت جلد ہی دنیا کی کایا پلٹ جائے گی، اور سب سے پہلے اسی لکھنؤ سے شروع کیجئے، اس کام کے لئے میں اپنی پوری خدمات آپ کے حوالے کرتا ہوں، ہمیں اُمید ہے کہ بس سال دو سال میں ہم لکھنؤ کو تو ایک نیا اور ساری دنیا کے لئے نمونہ کا لکھنؤ بنا دیں گے، ہمیں اس مہم میں ہر شریف اور معقول آدمی کی ہمدردی اور اس کا تعاون حاصل ہوگا، اور پھر تھوڑے عرصہ میں ساری دنیا کو ہم ایک اچھی شریف دنیا بنا سکیں گے۔

نیاز صاحب نے یہ سُنکر کہا، مولانا! آپ کس خواب و خیال میں ہیں، آپ بڑے سیدھے آدمی معلوم ہوتے ہیں، میرے اور آپ کے جیسے اگر سینکڑوں آدمی بھی ہوں تو یہ کام پھر بھی نہیں ہوسکتا۔

چچا صاحب نے کہا کیوں نہیں ہوسکتا؟ آپ بہترین لکھنے والے ہیں، آپ کے ہاتھ میں پریس کی طاقت ہے، اور غالباً آپ تقریر بھی بہترین کرتے ہوں گے، اور مجھے بھی کچھ ٹوٹا پھوٹا لکھنا بولنا آتا ہے، اور جس دن ہم یہ کام شروع کریں گے ہمیں یقین رکھنا چاہئے

کہ سارے اخبارات اور رسائل ہمارا ساتھ دیں گے، اور سیکڑوں ہزاروں لکھنے اور بولنے والے ہمارے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوں گے، اور آپ دیکھیں گے کہ چند دنوں میں فضا بالکل پلٹ جائے گی، اور دنیا میں ایک نئی بہار آجائے گی، اگر ہم ساری دنیا کو نہیں بدل سکے، تو کم از کم اپنے ملک کو یا اپنے صوبہ کو تو بدل ہی ڈالیں گے، آپ ہمت کیجئے اور پھر دیکھئے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ سب ہو جائے گا۔

نیاز صاحب نے پھر کہا، کہ مولانا! آپ بہت ہی سیدھے آدمی معلوم ہوتے ہیں، اور اس دنیا کو شاید آپ بالکل نہیں جانتے، اس دنیا کا بدلنا ہمارے آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔

چچا صاحب نے کہا، اچھا میں ایک بات پوچھتا ہوں، مجھے اندازہ ہے کہ تاریخ پر آپ کی خوب نظر ہے، اور آپ یقیناً اس سے واقف ہوں گے، کہ اب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عرب میں ایک دفعہ ایسا کام ہوا تھا، اور اُس قوم میں ہوا تھا جو تعلیم وتہذیب میں بالکل کوری تھی، اور جہالت اور اُجڈپن میں اور تمام برائیوں اور بداخلاقیوں میں ہماری اس دنیا کے جاہلوں اور غنڈوں سے بہت بڑھی ہوئی تھی، اور ایک ایسی شخصیت کے ذریعہ ہوا تھا، جو نوشت وخواند سے بالکل ناآشنا تھی، نہ اُس کے ہاتھ میں پریس تھا، نہ کوئی اخبار یا رسالہ اُس کی آواز کو بلند کرنے والا تھا، نہ اُس کے ساتھ مقرروں کی کوئی ٹیم تھی، نہ اُس کے پیغام کو قوم میں پھیلانے والے شاعر اُس کے ساتھ تھے، تو جب اس بے سروسامانی کی حالت میں ایک اکیلے اُمّی انسان نے ایک پوری قوم کو بدل دیا، تو ہم اور آپ جیسے پڑھے لکھے آدمی جن کے ہاتھ میں قلم اور پریس کی طاقت بھی ہے، اور ہزاروں ہم جیسے اور آدمی بھی ہمارا ساتھ دینے کو دنیا میں موجود ہیں، اور حکومتیں بھی ہمارے اس کام میں یقیناً ہم سے پورا تعاون کریں گی، تو پھر آپ کیوں مایوس ہیں، میں تو کہتا ہوں کہ اگر عرب میں وہ انقلاب ۲۰ سال میں ہوا تھا، تو ہم اپنے اِن وسائل کی وجہ سے ایک سال میں وہ انقلاب برپا کرسکیں گے، بس اس کی ضرورت ہے، کہ ہم آپ ہمت کر کے فیصلہ کریں، اور دوسرے سارے کام چھوڑ کے اپنی ساری قوتوں کو اس پر لگادیں۔

نیاز صاحب نے کہا، مولانا! میں آپ کو سمجھا نہیں سکتا، لیکن بات یہی ہے کہ یہ کام

ہمارے اور آپ کے بس کا نہیں ہے، اور آپ میرے اور اپنے متعلق اور اس دنیا کے متعلق بڑی غلط قسم کی خوش فہمیوں میں مبتلا ہیں۔

چچا صاحب نے کہا، اچھا تو بتایئے کہ آپ ایک تاریخ واں کی حیثیت سے اس تاریخی واقعہ کو بھی تسلیم کرتے ہیں یا نہیں، کہ اب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عرب میں ایسا انقلاب ہو چکا ہے۔

نیاز صاحب نے کہا، ہاں! یہ ایک مسلّم واقعہ ہے، اور اس سے کون انکار کرسکتا ہے۔

چچا صاحب نے کہا، مجھے آپ سے بس یہی جواب لینا تھا۔ کچھ عرصہ ہوا میں نے معجزات کے انکار پر آپ کا ایک مضمون پڑھا تھا، یہ وقت میں نے آپ سے اسی لئے لیا تھا، کہ آپ کو معجزے حقیقت سمجھادوں، اور آپ کو بتادوں کہ آپ بھی معجزہ کے قائل ہیں، اللہ کے پیغمبر کے ذریعہ جو ایسی چیز ظاہر ہو، جس کے کرنے سے اُس جیسے دوسرے انسان عاجز ہوں بس وہی معجزہ ہے، آپ نے اس وقت بار بار اقرار کیا ہے، کہ اللہ کے ایک اُمّی پیغمبر (حضرت محمد ﷺ) کے ذریعہ عرب میں جو اصلاحی انقلاب ہوا تھا، آپ ہر طرح کے بہتر سے بہتر وسائل رکھنے کے باوجود اپنے کو اس سے عاجز سمجھتے ہیں کہ صرف شہر لکھنو میں بھی ایسا انقلاب برپا کرسکیں۔

چچا صاحب فرماتے تھے کہ اس بات کے ختم ہونے کے ساتھ میری وقت کی گنجائش بھی ختم ہوگئی، اور اگرچہ نیاز صاحب (شاید اپنے ابتدائی رویہ کی تلافی کے لئے) اور کچھ دیر بیٹھنے پر اصرار کرتے رہے، لیکن وقت میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے میں فوراً اسٹیشن آگیا۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت اور تعلیم و تربیت سے جو روحانی اور ایمانی انقلاب عرب میں برپا ہوا وہ بھی قرآن مجید ہی کی طرح آپ کا ایک زندہ تاریخی معجزہ ہے، مگر افسوس ہم مسلمانوں کی موجودہ حالت نے اس پر بہت ہی غلیظ پردے ڈال دیئے ہیں، اور دنیا کے لئے اس کا سمجھنا مشکل بنا دیا ہے۔

## ایک اور زندہ معجزہ

میں معجزات کے سلسلے میں آپ کے ایک اور علمی معجزہ کا ذکر کرتا ہوں، وہ بھی الحمدللہ

محفوظ اور زندہ ہے، اور جس کا جی چاہے آج بھی اس میں ذرا غور کر کے آنحضرت ﷺ کی صداقت اور آپ کی نبوت و رسالت کا یقین حاصل کر سکتا ہے، اور خود میرا حال یہ ہے کہ الحمد للہ میں زیادہ تر اسی میں غور کر کے اپنے ایمان کو تازہ کیا کرتا ہوں، اور وہ ہیں حضور ﷺ کی دعائیں۔ اللہ تعالیٰ حضرات محدثین کو بہتر سے بہتر جزا دے، اور اُن کی قبروں کو اپنے انوارِ رحمت سے بھر دے، انھوں نے حضورؐ کے دوسرے اقوال و افعال کی طرح آپ کی مختلف اوقات اور مختلف حالات کی دعاؤں کو بھی ہمارے لئے اپنی کتابوں میں محفوظ کر دیا، پھر بعد میں اللہ کے بعض بندوں نے ان دعاؤں کو الگ کتابی شکل میں بھی مرتب کر دیا، اور اَب چھوٹی بڑی بیسوں کتابیں ایسی موجود ہیں جن میں صرف حضورؐ کی دعاؤں ہی کو کسی خاص ترتیب سے جمع کیا گیا ہے [۱]۔

جس شخص میں خدا پرستی اور روحانیت کا کوئی ذرہ بھی موجود ہو یا اُس کو ان چیزوں کی ذرا بھی حِس ہو، وہ اگر اِن دعاؤں پر یا اِن کے ترجموں ہی پر غور کرے تو اس کو اس میں شک نہیں رہ سکتا کہ یہ دعائیں صرف اُسی منور قلب سے نِکل سکتی ہیں جس کو انسانیت بلکہ ساری کائنات کا بھی زیادہ سے زیادہ عرفان حاصِل ہو، اور اللہ کی معرفت میں بھی اُس کا مقام بلند سے بلند تر ہو، اور اُس کے دل میں ذرّہ برابر بھی کھوٹ نہ ہو۔ الحمد للہ ثمّ الحمد للہ اس عاجز کو تو حضورؐ کی ہر دعا سے یہ نورِ یقین نصیب ہوتا ہے، اور میں صاف کہتا ہوں کہ شاید میری اُفتادِ طبع کی وجہ سے میرا ذوق و وجدان حضورؐ کی نبوت و رسالت کے بارے میں دوسری تمام چیزوں سے زیادہ تسکین اور یقین آپ کی دعاؤں سے حاصِل کرتا ہے۔ بہر حال حضورؐ کی محفوظ دعائیں بھی آپ کا نہایت روشن اور زندۂ جاوید معجزہ ہیں، بلکہ سچّی بات یہ ہے کہ اللہ نے کِسی کے دل کو ذرا بھی روشنی دی ہو، تو اُس کے لئے حضورؐ کی زندگی کا ہر پہلو بلکہ اس کی ہر اَدا معجزہ ہے۔

معجزات کے سلسلے میں میری گفتگو بہت طویل ہوگئی، لیکن الحمد للہ بعض باتیں ایسی ذکر میں آگئیں جن سے انشاء اللہ ہم سب کے ایمان و یقین میں تازگی پیدا ہوئی ہوگی، اور

---

[۱] حضورؐ کی دعاؤں کا ایک مکمل مجموعہ "حصن حصین" ہے، جو اُردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکا ہے، یہ کتاب خاصی ضخیم ہے، اور ایک مختصر مگر جامع اور کافی وافی مجموعہ "مناجاتِ مقبول" ہے، جو مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے ترجمہ اور تشریحی نوٹوں کیساتھ بھی شائع ہوا، اور تعلیمیافتہ حضرات کیلئے اس کا مطالعہ زیادہ مفید ہے۔ ۱۲

آئندہ بھی ان کو یاد کر کے بوقتِ ضرورت یہ تازگی پیدا کی جاسکے گی، اور جو انسان اپنی بدقسمتی سے رسُول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں رکھتے ہیں، انشاء اللہ یہی چند باتیں بوقتِ ضرورت اور موقع پر آپ اُن کے سامنے بھی رکھ سکیں گے، اور اُن کو غور و فکر کی دعوت دے سکیں گے۔

اب میں نبوت و رسالت ہی کے متعلق ایک آخری بات اور کہنا چاہتا ہوں۔

## مقامِ نبوت، اور کسی کو نبی ماننے کا مطلب

جب آپ نے نبوت و رسالت کی حقیقت سمجھ لی، تو یہ بات بھی آپ پر واضح ہوگئی ہوگی کہ کسی کو نبی اور رسُول ماننا ایسی بات نہیں ہے جیسے کہ کسی کو شاعر مان لینا، یا کسی کو قوم کا لیڈر مان لینا، یا کسی کو حکیم یا ڈاکٹر مان لینا، کسی کو شاعر یا لیڈر یا حکیم یا ڈاکٹر ماننے کے بعد ہمارے لئے یہ ضروری نہیں ہوجاتا کہ ہم اُس کے فن میں بھی اُس کی ہر بات کو قبول کریں، لیکن کسی کو نبی و رسُول ماننے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم نے اس حقیقت کو تسلیم کرلیا کہ یہ غیبی حقیقتوں کے بارے میں جو کچھ ہمیں بتلاتا ہے اور ہم کو جو ہدایات دیتا ہے سب اللہ کی طرف سے دیتا ہے، اور اس کی یہ ساری باتیں گویا اللہ کی باتیں ہیں، اس لئے یہ سب حق ہی حق ہیں، اور ان میں کسی کو چون و چرا اور شک وشبہ کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔ اس واسطے ہر انسان کا فرض ہے کہ کسی ہستی کو نبی و رسول ماننے کے بارے میں تو ہرگز سہل انگاری سے کام نہ لے، بلکہ خوب دیکھ بھال کے اور جانچ پرکھ کے کسی کو اللہ کا نبی یا رسول مانے، لیکن جب دل اور دماغ کسی ہستی کو نبی اور رسول مان لیں، اور ان کی نبوت و رسالت پر آدمی ایمان لے آئے تو پھر عقل کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ اُن کی ہر بات کی تصدیق کی جائے، اور اُن کی ہر اطلاع پر آمنّا وصدّقنا کہا جائے اور اُن کے ہر حکم کو اللہ کا حکم سمجھ کر اُس کی اطاعت کی جائے۔

آپ خالص عقل کی روشنی میں غور کیجئے، جب کسی ہستی کے متعلق یہ تسلیم کرلیا گیا کہ وہ اللہ کا پیغمبر ہے تو اُسی کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرلیا گیا کہ وہ جھوٹا نہیں ہے، مکّار نہیں ہے، کسی بیماری یا دھوکہ میں مبتلا نہیں ہے، اس پر اللہ کی وحی آتی ہے، اور جو غیبی حقیقتیں ہمارے مشاہدہ اور ادراک کی دسترس سے باہر ہیں اُن کے بارے میں وہ جو کچھ بتلاتا ہے اور جو احکام ہم کو دیتا ہے اُن سب کا علم اللہ کی وحی سے اُس کو حاصل ہوتا ہے، اب آپ ہی سوچئے

کہ یہ سب کچھ مان لینے کے بعد، پیغمبر کی کسی دی ہوئی اطلاع میں اس بنیاد پر شک کرنا کہ وہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی، یا کسی حکم کے بارے میں اس لئے مُتردّد اور مُذبذب ہونا کہ اس کی حکمت اور فلاسفی کو ہم نہیں سمجھتے، کس قدر جاہلانہ اور احمقانہ بات ہے، لیکن آج کل کے بہت سے پڑھے لکھے مدعیانِ عقل جب دین ومذہب کے موضوع پر بات کرتے ہیں، تو اسی حماقت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ میرے نزدیک تو یہ بات صریح کفر سے یعنی پیغمبر کا صاف انکار کرنے سے بھی زیادہ غیر منطقی ہے۔

## اطمینانِ قلبی کیلئے دلیل یا حکمت دریافت کرنے میں مضائقہ نہیں

ہاں اس میں مضائقہ نہیں کہ ایک شخص پیغمبر پر ایمان لانے کے بعد اور اصولی طور پر اس کو قبول کر لینے کے بعد کہ یہ اللہ کے نبی ہیں، اور جن باتوں کی خبر دیتے ہیں اور جو احکام سناتے ہیں وہ سب حق ہیں، اور اللہ کی طرف سے ہیں، اور میں نے ان سب کو قبول کر لیا، اور مان لیا (تو اس اصولی اور قطعی ایمان کے بعد اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ) وہ شخص مزید اطمینان اور قلبی انشراح حاصل کرنے کے لئے دین کی ہر بات کو سمجھنے اور ہر حکم کی حکمت جاننے کی کوشش کرے، اور اس کے لئے خود غور وفکر کرے، یا اس قسم کی کتابیں دیکھے، یا ایسے لوگوں سے استفادہ کرے جو اس کے اہل ہوں۔

الحمدللہ ہمیں اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ اللہ کے پیغمبروں نے جو کچھ بتلایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ صحیح اور مستند طریقہ سے ہم تک پہونچا ہے وہ بالکل عقل وفطرت کے مطابق ہے، اور اس میں ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جو عقل وحکمت کے معیار پر پوری نہ اُترتی ہو، لیکن کیا ہر شخص کے پاس معیاری عقل وحکمت موجود ہے؟

## ہماری عقلوں کی پرواز

ہماری عقلوں کا حال تو یہ ہے کہ جب تک وہ خوردبین ایجاد نہیں ہوئی تھی جس سے پانی کے جراثیم دیکھے جاتے ہیں، اگر اُس وقت کوئی ہم سے کہتا کہ پانی کے ایک ایک قطرے میں ہزاروں زندہ کیڑے ہوتے ہیں تو ہم اس کو گپ سمجھتے، اسی طرح اب سے سو دو سو سال

پہلے اگر کوئی کہتا کہ ایک ایسی غیر جاندار سواری بھی ہوتی ہے جو سیکڑوں آدمیوں کو سوار کر کے پانچ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آسمانی فضا میں اُڑتی ہے تو سننے والے اس کو نرا جھوٹ سمجھتے، لیکن آج یہ دونوں چیزیں واقعہ بن کر ہمارے سامنے آچکی ہیں۔

پس جن بیچاری عقلوں کا حال یہ ہے کہ چند دنوں بعد جو چیزیں اس دنیا میں سامنے آنے والی ہیں اُن کو بھی وہ نہیں سمجھ سکتیں، اُن غریب عقلوں کو انبیاء علیہم السلام کی باتوں کے لئے میزان اور معیار بنانا یقیناً حماقت ہے۔

الغرض صحیح اور دانشمندانہ طرزِ عمل یہ ہے، کہ آدمی کسی کو اللہ کا پیغمبر تو خوب دیکھ بھال کے اور جانچ پرکھ کے مانے، لیکن مان لینے کے بعد آنکھ بند کر کے اُس کی ہر بات کی تصدیق کرے، اور اُس کے ہر حکم کو واجب الاطاعت جانے، یہی عقل کا تقاضا ہے، اور یہی انبیاء علیہم السلام کی تعلیم ہے۔

## پیغمبر کی بعض باتوں کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا بھی کفر ہے

اسی لئے وہ شخص مومن نہیں جو اللہ کے پیغمبر کی بعض باتوں کو مانے، اور بعض کو نہ مانے، پیغمبر کے ہر فیصلہ کا ماننا قرآن شریف میں شرط ایمان قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:۔

"فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا" ـــــــــــــــ (نساء۔ ع ۹)

اے پیغمبر! تمھارے رب کی قسم یہ لوگ مومن نہیں جب تک کہ اپنے اختلاف میں تم کو حَکَم نہ مانیں، اور پھر جب تم کوئی فیصلہ دے دو تو اپنے دلوں میں اس سے کوئی تنگی اور ناگواری نہ پائیں اور اس کو بالکل تسلیم کرلیں۔

اور ایک دوسرے موقع پر فرمایا گیا ہے:۔

"وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَی اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ" ـــــــــــــــ (احزاب۔ ع ۵)

اور کسی ایمان والے مرد یا ایمان والی عورت کو جب اللہ و رسول کسی بات کا

حکم دے دیں تو اُن کو اپنے اس معاملہ میں کوئی اختیار اور حق نہیں رہتا (بلکہ اُن کا کام صرف ماننا اور تسلیم کرنا ہے)۔

بہر حال اس بات کو قرآن پاک میں بھی بار بار بیان کیا گیا ہے، اور عقلی طور پر بھی یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ کسی کو اللہ کا پیغمبر مان لینے کے بعد اس کے ہر حکم اور اس کی ہر دینی بات کا ماننا ضروری ہے۔ اور اُس کی کسی بات کا انکار بھی اُس کی پیغمبری کا انکار ہے۔

## منکرین حدیث کی گمراہی

اس موقع پر اس زمانہ کے بعض لوگوں کی ایک گمراہی کا ذکر کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، آپ نے سنا ہوگا کہ کچھ لوگ اس کے قائل ہیں کہ رسُول اللہ ﷺ کی حدیث دین میں حجت نہیں، یعنی اس کا ماننا اور اس پر عمل کرنا ضروری نہیں صرف قرآن کا ماننا ضروری ہے، اور بس وہی دینی حجت ہے، دراصل یہ گمراہی نبوت کا مقام نہ سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے، ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو بس ایک چٹھی رساں کی طرح سمجھا ہے، جس کا کام صرف خط پہنچا دینا ہے، ان ظالموں کا خیال ہے کہ دین میں رسول اللہ ﷺ کا کام بس اتنا ہی تھا کہ قرآن اُن پر نازل ہوا اور انھوں نے اس کو پہنچا دیا۔ حالانکہ نبی دین کے اصول واحکام بیان کرنے میں بھی اللہ تعالیٰ کا نائب ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ کا جس طرح یہ ایک کام تھا کہ قرآن مجید کو انھوں نے اللہ کے بندوں تک پہنچایا اسی طرح یہ بھی ایک کام تھا کہ قرآنِ پاک میں جس ایمانی زندگی کے صرف اصول بیان کئے گئے ہیں، ان کی تفصیلات اور ان کی عملی صورتیں آپ نے لوگوں کو بتائیں، مثلاً قرآن پاک میں نماز کا حکم تو سیکڑوں جگہ دیا گیا، لیکن اس کے پڑھنے کا طریقہ اور اس کے تفصیلی احکام ایک جگہ بھی نہیں بیان کئے گئے، اسی طرح کھانے پینے میں کیا چیزیں حلال ہیں اور کیا حرام، اس کا بھی قرآن پاک میں بہت مجمل اور مختصر بیان فرمایا گیا ہے، مثلاً کُتّا کھانا جائز ہے یا ناجائز، زمین کے کیڑے مکوڑوں کا کھانا حلال ہے یا حرام، قرآن پاک میں اس بارے میں کوئی صاف اور واضح حکم موجود نہیں ہے بلکہ مجملاً بس یہ فرمایا گیا ہے، کہ:۔

"يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ"

ہمارے یہ رسول ان لوگوں کے لئے پاکیزہ چیزوں کا حلال ہونا اور
گندی چیزوں کا حرام ہونا بیان کرتے ہیں!

بہر حال اس قسم کی ساری چیزوں کی تفصیل بیان کرنے میں رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے مامور اور نائب ہیں، اور آپ نے اِس قسم کے جو تفصیلی احکام اُمّت کو دیئے، وہ سب اللہ کی وحی سے اور اس کے بخشے ہوئے علم سے دیئے، اور آپ کے ان ہی احکام سے اسلامی زندگی کا نقشہ تیار ہوتا ہے۔

خود قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کا ایک کام جس طرح "یَتلُوْ عَلَیْھِمْ آیَاتِہٖ" بتایا گیا، (جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں، اور اللہ کی باتیں اللہ ہی کے الفاظ میں ان لوگوں سناتے اور پہنچاتے ہیں)۔ اسی طرح دوسرا کام "یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ" اور تیسرا کام "یُزَکِّیْھِمْ" بھی بتلایا گیا ہے، (جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے یہ رسول ہماری کتاب کی اور حکمت کی تعلیم بھی دیں گے، اور لوگوں کے تزکیہ کا کام بھی کریں گے)۔

اسی طرح ایک دوسری جگہ قرآن مجید ہی میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے، کہ:۔ "لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْھِمْ" یعنی آپ کو یہ کام بھی کرنا ہے کہ جو کتاب ہماری طرف سے لوگوں پر نازل کی گئی ہے آپ اُن کے سامنے اُس کی تبیین کریں، یعنی اس میں جو چیزیں مجمل چھوڑی گئی ہیں آپ اُن کی تفصیل بیان کریں۔

پس جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ کا کام بس قرآن پہنچادینا تھا، اور دینی حجت بس وہی ہے جو قرآن میں ہے، اُس کے سوا اپنے دین کے لئے ہمیں کسی اور چیز کی یعنی حدیث وسنّت کی ضرورت نہیں، وہ دراصل اللہ کی بات "یُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ" اور "لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ" سے انکار کرتے ہیں۔

حدیث وسنّت کا سارا مستند ذخیرہ دراصل ان ہی آیات کی تفسیر ہے، اور ہم اس ذخیرے کے ذریعہ حضور ﷺ کے اس پیغمبرانہ کام یعنی کتاب وحکمت کی تعلیم اور تزکیہ اور تبیین سے قریب قریب اسی طرح استفادہ کرسکتے ہیں جس طرح سے صحابۂ کرامؓ نے کیا تھا۔

علاوہ ازیں اگر اللہ تعالیٰ صرف قرآن ہی بھیجنا چاہتا تھا تو اس کی تو زیادہ بہتر شکل یہ ہوتی کہ آسمان سے ایک صحیفہ آتا اور کعبہ کی چھت پر اُتار دیا جاتا، یا کعبہ کی دیواروں سے وہ کلام اہلِ مکہ کو سنوا دیا جاتا، جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک درخت سے سنوایا گیا تھا، بلکہ اس سے اہل مکہ زیادہ متاثر ہوتے، رسالت کیلئے انسانوں کا انتخاب تو اسی لئے ہوتا ہے کہ ''انسان پیغمبر'' ہی اللہ کے پیغام کی مراد واضح کر سکتا ہے، اور اُس زندگی کی تفصیلات بتا سکتا ہے جو اللہ اپنے بندوں سے چاہتا ہے، اور وہی اپنی زندگی سے اُس کا نمونہ پیش کر سکتا ہے۔

الغرض حدیث وسنّت کا انکار کرنے والا طبقہ جو قرآن پاک کا مقدس نام لے کر امت کو دھوکا دیتا ہے، یہ اگر چہ رسُول اللہ ﷺ کی نبوت پر ایمان لانے کا مدعی ہے لیکن درحقیقت اس نے مقامِ نبوت کو سمجھا نہیں ہے، اور اس کی بات ایسے لوگوں کو بڑی اچھی اور بڑی آسان معلوم ہوتی ہے، جو مسلمان رہنا بھی چاہتے ہیں، مگر شریعت کی پابندیوں سے بھاگتے ہیں، انکارِ حدیث کے اصول کو مان لینے کے بعد ان کے لئے ہر آوارگی اور ہر نفس پرستی کے جائز ہونے کا راستہ نکل آتا ہے، کیونکہ قرآن مجید ایمان اور عملِ صالح والی اور تقوے والی جس زندگی کا مطالبہ کرتا ہے اس کی تفصیلات جو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی تھیں، وہ حدیث وسنّت ہی سے معلوم ہوتی ہیں، قرآن پاک میں تو نماز کی بھی تفصیل نہیں بتلائی گئی ہے۔ دراصل یہ فتنہ بڑا اسلام سوز اور دین کُش فتنہ ہے۔

## وحدتِ ادیان کے مبلغین اور حدیث کے منکرین کی مشترک غلطی

آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ ہمارے ملک کے بعض اچھے پڑھے لکھے اور مذہبی خیالات رکھنے والے ہندو صاحبان ''وحدتِ ادیان'' کے نظریے کے قائل ہیں، اور وہ اپنے اس عقیدے کی تبلیغ بھی کرتے ہیں کہ نجات کے لئے کسی خاص دین پر چلنا ضروری نہیں، بلکہ تمام مذاہب یکساں طور پر سچے ہیں، اور اس لئے ہر مذہب پر چلنے سے نجات حاصل ہو سکتی ہے، پنڈت سندر لال جی الہ آبادی اُن لوگوں میں خاص شہرت اور امتیاز رکھتے ہیں،

اور میں ان کو ذاتی طور پر بھی کچھ جانتا ہوں، دلوں کا بھید تو اللہ ہی جانتا ہے، لیکن میں اپنی دانست میں ان کو نیک نیت اور نیک دل سمجھتا ہوں، اُن کا یہ خاص مشن ہے، وہ مسلمانوں کو خصوصیت سے اس کی تبلیغ کرتے ہیں، وہ خود ہندو ہوتے ہوئے اور ہندو مذہب کے پابند ہوتے ہوئے بھی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ حضرت محمد ﷺ کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں، اور قرآن پاک کو خدا کی کتاب سمجھتے ہیں [۱]۔ مسلمانوں سے جو چند باتیں وہ خاص طور پر کہا کرتے ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس شریعت کو وہ ''اسلامی شریعت'' کہتے ہیں۔ (جو مسلمانوں کو دوسرے اہلِ مذاہب سے جدا کرتی ہے)۔ وہ قرآن میں نہیں ہے، حتیٰ کہ جو نماز مسلمان پڑھتے ہیں وہ بھی قرآنی نہیں ہے، بلکہ غیر قرآنی نہیں ہے، قرآن میں صرف ''صلوٰۃ'' کا حکم ہے، اور اگر کوئی مندر میں بیٹھ کر ایشور کا دھیان کرتا ہے یا پرارتھنا کرتا ہے وہ بھی صلوٰۃ کے قرآنی حکم پر عمل کرنے والا ہے۔ عجیب زمانہ ہے حضرت محمد ﷺ کی بتلائی اور سکھلائی ہوئی نماز اور آپ کی لائی ہوئی شریعت سے مسلمانوں کو توڑنے کے لئے اب محمد ﷺ کے لائے ہوئے قرآن ہی کو استعمال کیا جاتا ہے۔

دراصل مسلمانوں میں منکرین حدیث وسنّت اور ہندوؤں میں پنڈت سندرلال جی جیسے حضرات کی غلطی کی بنیاد ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ یہ دونوں گروہ مقامِ نبوت سے ناآشنا ہیں، اور دونوں کی بات ماننے کا نتیجہ یہی ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے قرآنِ پاک کے اصولی مطالبوں کے ادا کرنے کی جو تفصیلی شکل اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُمّت کو بتلائی ہے، (جو حدیث وسنّت ہی سے معلوم ہوتی ہے، اور جس سے اسلامی زندگی کی عمارت مکمل ہوتی ہے) اس سے خدانخواستہ مسلمان ہٹ جائیں۔

---

[۱] بظاہر یہ بات بڑی عجیب سی ہے، لیکن جو شخص نبوت اور پیغمبری کی حقیقت نہ جانتا ہو اُس سے کچھ مستبعد نہیں، گاندھی جی جیسے بڑے آدمی بھی اس غلطی میں اسی وجہ سے مبتلا تھے کہ وہ اپنی ساری مہاتمائی بلندیوں کے باوجود نبوت کی حقیقت اور مقامِ نبوت سے آشنا نہیں تھے، اُن کے نزدیک حضرت محمد ﷺ کو دل سے رسول ماننے میں اور ہندو مذہب کے مطابق زندگی گذارنے میں کوئی تضاد نہیں تھا، وہ نبی کی لائی ہوئی شریعت کا اتباع ضروری نہیں سمجھتے تھے، بہرحال مقامِ نبوت نہ جاننے ہی کا یہ نتیجہ تھا۔ ۱۲

اس وقت کی گفتگو کا موضوع دراصل یہ فتنے اور یہ مسئلے نہیں تھے، بلکہ عقائد اور ایمانیات کے سلسلہ میں نبوت اور رسالت کے متعلق بات ہو رہی تھی، اور عرض یہ کیا جارہا تھا کہ کسی کو نبی ماننے کے بعد اُس کی ہر اُس بات کا تسلیم کرنا از روئے ایمان اور از روئے عقل بھی ضروری ہو جاتا ہے، جو وہ اللہ کے دیئے ہوئے خاص علم سے ہم کو بتلائے۔ اس سلسلہ میں منکرین حدیث کا اور پھر ان کی وجہ سے "وحدت ادیان" والوں کا یہ تذکرہ درمیان میں آگیا، اور اچھا ہوا کہ آگیا، اس کی بھی ضرورت تھی۔ اب پھر اصل موضوع پر آجایئے! اب تک جن تین عقیدوں پر گفتگو کی گئی ہے، یعنی (۱) توحید (۲) آخرت (۳) رسالت۔ یہ "اُمہات العقائد" (یعنی بنیادی عقیدے) کہلاتے ہیں۔

## اُمہات العقائد کی خصوصیت

اگرچہ ان کے علاوہ اور بھی چند ایسے اہم عقیدے ہیں جن پر ایمان لانا اور یقین کرنا مسلمان ہونے کی شرط ہے، لیکن ان تین عقیدوں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جس زندگی کا پیغام اللہ تعالیٰ کی طرف سے لاتے ہیں، اس کا پورا نظام ان ہی تین بنیادوں پر قائم ہوتا ہے، اور وہی شخص اس زندگی کو اپنا سکتا ہے، جو اِن تین بنیادی باتوں کو تسلیم کرلے، گویا اسلامی نظامِ زندگی کی یہ تین فکری اور اعتقادی بنیادیں ہیں، اسی لئے دین میں ان کی خاص اہمیت ہے، اور اسی واسطے ان کو "اُمہات العقائد" کہتے ہیں، الحمدللہ ان تینوں کا بیان اچھی خاصی تفصیل سے ہوگیا۔

## باقی عقائد

اب ان کے علاوہ باقی عقائد کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے:۔

اوپر پوری تفصیل سے یہ بات ذکر کی جاچکی ہے کہ کسی کو نبی ورسول ماننے کے بعد یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اُس کی ہر اُس بات پر ایمان لایا جائے جو وہ اللہ کی طرف سے بتلائے اور اُس کی کسی ایک بات کا انکار بھی اُس کی نبوت کا انکار اور کفر ہے، اس لئے ہر اُس حقیقت پر یقین کرنا اور اُس پر عقیدہ رکھنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے جس کی اطلاع

رسول اللہ ﷺ نے دی۔ البتہ جن مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کا مبارک زمانہ نہیں پایا، اور آپ کی دینی تعلیم اُن کو بالواسطہ پہنچی (جیسا کہ ہمارا حال ہے) اُن کے لئے یہ حیثیت صرف اُن ہی تعلیمات اور اُن ہی عقائد کی ہے جو رسول اللہ ﷺ سے ایسے قطعی اور یقینی طریقے سے ثابت ہیں جس میں کسی شک وشبہ کی اور کسی تاویل کی گنجائش نہیں، اور ہر دَور میں ان کی شہرت بھی اتنی عام رہی ہے کہ دین سے معمولی واقفیت رکھنے والے عوام بھی ان سے واقف رہے ہیں۔ اور جن چیزوں کی قطعیت اور شہرت اس درجے کی نہیں ہے (اگرچہ ان کا ثبوت ہمارے لئے قابل اطمینان ہو) تو ان کی حیثیت اور ان کا حکم یہ نہیں ہے، یعنی ان کا انکار کرنا بھی اگرچہ ایک درجہ کی گمراہی ہے، لیکن کفر نہیں ہے۔

## عقائد کی دو قسمیں

جب یہ اصولی بات آپ نے سمجھ لی، تو خود بخود یہ بھی آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ عقائد دو قسم کے ہیں، یا یوں کہئے کہ دو درجے کے ہیں۔

ایک وہ جن کا ثبوت رسول اللہ ﷺ سے ایسا قطعی اور یقینی ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، اور ہر دَور میں ان کو ایسا تواتر اور ایسی عام شہرت حاصل رہی ہے کہ اس کی وجہ سے ان میں کسی تاویل کی بھی گنجائش نہیں۔

دوسرے وہ جن کا ثبوت اگرچہ قابل اطمینان اور پکّا ہے، لیکن اس درجہ کی قطعیت اور ایسا تواتر اُن کو حاصل نہیں ہے جس کے بعد کسی احتمال اور تاویل کی بھی گنجائش نہیں رہتی۔

"امہات العقائد" یعنی توحید، رسالت، قیامت وآخرت پہلی قسم کے عقیدے ہیں، ان کے علاوہ قرآن مجید کا کتاب اللہ ہونا، آخرت میں جنّت اور دوزخ کا ہونا، فرشتوں کا ایک مستقل مخلوق ہونا، اسی طرح رسول اللہ ﷺ سے پہلے دنیا میں بہت سے نبیوں کا آنا، اور آپ کا خاتم النبیین یعنی سب سے آخری نبی ہونا، اور سلسلۂ نبوت کا آپ پر ختم ہو جانا، یہ سب بھی اسی درجہ کے عقیدے ہیں کہ ان کا ثبوت بھی رسول اللہ ﷺ سے ایسا ہی یقینی اور قطعی ہے، جیسا کہ توحید، رسالت، اور قیامت کا، اور ان کو اُسی درجہ کا تواتر اور ہر دَور میں اسی قسم کی عام شہرت اُمت میں

حاصل رہی ہے، اس لئے ان سب باتوں کا حکم بھی یہی ہے کہ ان میں سے کسی ایک بات کا انکار کر کے بھی آدمی مسلمان نہیں رہ سکتا، اگرچہ اس کا یہ انکار کسی تاویل کی آڑ لے کر ہو۔

## ضروریاتِ دین

جن چیزوں کا ثبوت رسول اللہ ﷺ سے اس درجہ کا ہو، اہل علم کی خاص اصطلاح میں ان کو "ضروریاتِ دین" کہتے ہیں۔ یعنی وہ دینی باتیں اور دینی حقیقتیں جن کا تعلیم رسول ہونا بالکل یقینی اور قطعی ہو، اور ان کو ہر دور میں ایسا تواتر اور ایسی عام شہرت حاصل رہی ہو کہ ان میں کسی تاویل کی بھی گنجائش نہ ہو۔

## دوسرے درجہ کے عقائد

دوسرے درجہ کے عقائد کی مثال میں عذابِ قبر، اور قیامت اور آخرت کی بعض تفصیلات مثلاً میزان، صراط، شفاعت، رویتِ باری تعالیٰ وغیرہ کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ قیامت سے پہلے دجّال کے ظہور اور حضرت مسیحؑ کے نزول، اور اسی طرح بعض اور علاماتِ قیامت کا درجہ بھی یہی ہے، یعنی ان کا ثبوت رسول اللہ ﷺ سے اگرچہ قابل اطمینان اور پکا ہے، لیکن "ضروریاتِ دین" کے معیار کا نہیں، اس لئے کسی شبہ یا کسی تاویل کی بنیاد پر ان میں سے کسی چیز کا انکار کرنا اگرچہ سخت درجہ کی گمراہی ہے، لیکن اس کو کفر یا ارتداد نہیں کہا جا سکتا۔

بیانِ عقائد ہی کے سلسلہ میں ایک بات اور بھی یہاں سمجھ لینی چاہئے!۔

## اُمت میں اختلافِ عقائد کا آغاز

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان عقائد میں کوئی اختلاف نہیں تھا، لیکن اُن ہی کے زمانہ میں مختلف قوموں اور مختلف ملکوں کے جو بے شمار لوگ اسلام میں داخل ہوئے وہ اپنے ساتھ اپنے پُرانے خیالات اور اپنا طرزِ فکر بھی لے کر آئے، اور ان سب کے خیالات کی پوری اصلاح اور تصحیح نہیں ہو سکی (اور اس عالمِ اسباب میں یہ ممکن بھی نہیں تھا) بس اُن ہی سے عقائد کا اور طرزِ فکر کا وہ اصولی اختلاف شروع ہوا جس نے امت میں بہت سے فرقے پیدا کئے، فروع میں اور غیر اہم مسائل میں رائے اور تحقیق کا اختلاف ایسی چیز نہیں ہے جس سے فرقہ بندی پیدا ہو، بلکہ

یہ تو ناگزیر اور قدرتی ہے۔فرقے جس اختلاف سے بنتے ہیں وہ عقائد اور اصول کا اختلاف ہے، اور جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ صحابۂ کرام میں بالکل نہیں تھا، اپنے عقائد اور اپنے طرزِ فکر کے لحاظ سے وہ سب ایک جماعت تھے، پھر بعد میں جو فرقے پیدا ہوئے اگرچہ وہ بے گنتی ہیں لیکن اصولی طور پر ہم ان کو ''اہل السنۃ والجماعۃ'' اور ''غیر اہل السنۃ والجماعۃ'' کہہ سکتے ہیں۔

## اہل السنۃ والجماعۃ کا اصول

''اہل السنۃ والجماعۃ'' کا امتیاز یہ ہے کہ وہ قرآن مجید کو دین کی اصل واساس ماننے کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی سنت یعنی آپ کے ارشادات اور آپ کے طرزِ عمل کو اس کی شرح اور اس کے اجمال کی تفصیل سمجھتے ہیں، اور جو چیزیں قرآن مجید میں بیان نہیں کی گئی ہیں، اور سنت میں اُن کا بیان ہے، ان کے نزدیک وہ بھی واجب الاتباع اور جزو دین ہیں۔ اور کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ ﷺ کی یہ حیثیت تسلیم کرنے کے ساتھ وہ جماعت صحابہ کی یہ حیثیت بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کتاب وسنت کا جو منشا انھوں نے سمجھا، اور جن امور پر ان کا اجماع ہو گیا وہ بھی واجب الاتباع ہیں، اور کسی مسلمان کو حق نہیں ہے کہ ان کے اجتماعی مسلک اور اجماعی فیصلوں کے خلاف اپنی کوئی رائے رکھے۔ دین کی کسی حقیقت اور کسی مسئلہ پر صحابۂ کرام کے اجماع واتفاق کے معنی اہلسنّت کے نزدیک یہ ہیں کہ یہ مسئلہ بالکل قطعی ہے، اور اس سے اختلاف کرنا ضلالت ہے، کیونکہ دین جس ماحول اور جس فضا اور جن حالات میں آیا اور جس زبان میں آیا صحابۂ کرام یقیناً اس کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے، پھر انھوں نے دین براہِ راست رسول اللہ ﷺ سے حاصل کیا، اور آپ کی صحبت اور تربیت سے مستفیض ہوئے، اس لئے کوئی بھی ان سے زیادہ دین کا عارف اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کی رُوح اور منشا کو سمجھنے والا نہیں ہو سکتا، پس دین وہی ہے جو انھوں نے سمجھا۔

الغرض ''اہل السنۃ والجماعۃ'' دین کی کسی حقیقت اور کسی مسئلہ پر صحابۂ کرامؓ کے اجماع اور اتفاق کو فیصلہ کُن چیز سمجھتے ہیں جس سے اختلاف کرنے کی ان کے نزدیک کسی کو گنجائش نہیں۔

بس یہ ہے اصولی مسلک ''اہل السنۃ والجماعۃ'' کا، بلکہ اُن کو ''اہل السنۃ والجماعۃ''

اِسی لئے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے کتاب اللہ کے بعد سنّت اور جماعتِ صحابہ کی دین میں اتنی اہمیت تسلیم کی ہے، اور اپنے کو ان کا اتنا پابند بنا دیا ہے۔

## دوسرے فرقے

باقی دوسرے فرقوں کا حال یہ ہے کہ وہ سنّت کو اور جماعتِ صحابہؓ کو اتنی اہمیت نہیں دیتے۔ ان فرقوں میں سب سے پہلے پیدا ہونے والے دو فرقے خوارج اور شیعہ ہیں۔ شیعوں کی اگرچہ بہت سے شاخیں ہیں، لیکن اتنی بات قریبًا سب میں مشترک ہے کہ دین کے معاملہ میں صحابۂ کرام اُن کے نزدیک قطعًا قابلِ اعتماد نہیں، بلکہ ان کے اکثر فرقے جمہورِ صحابہ کو معاذ اللہ منافق اور مخرّبِ دین سمجھتے ہیں، اور جو مقام سنّت کا ہونا چاہئے وہ اُن کے نزدیک ان کے آئمہ کے اقوال وافعال کا ہے، بلکہ واقعۃً ان کے سارے مذہب کی بنیاد اُن کے آئمہ کی روایات ہی پر ہے، ان کے بعض فرقوں کے نزدیک تو قرآن مجید بھی مشکوک اور ناقابل اعتماد ہے، اس لئے اُن کے نزدیک دین کا ماخذ اُن کے آئمہ کی روایات ہی ہیں۔

اور خوارج کا حال یہ ہے کہ وہ قرآن مجید کو تو دین کا بالکل محفوظ اور قطعی ماخذ مانتے ہیں، اور سنّت کی اہمیت بھی اُن کے نزدیک قریب قریب ویسی ہی ہے جیسی کہ اہل السنّۃ کے نزدیک ہے، لیکن صحابۂ کرام کے اجتماعی مسلک اور اجماعی فیصلوں کا اتباع جس طرح اہل السنّۃ ضروری سمجھتے ہیں وہ نہیں سمجھتے، گویا اُن کے نزدیک یہ ہوسکتا ہے کہ دین کی کسی حقیقت کو اور قرآن وسنّت کی کسی بات کو سمجھنے میں صحابۂ کرام کی پوری جماعت یا اُن کی بڑی تعداد غلطی کر جائے، اور بعد والے اُس کو صحیح سمجھیں، لیکن اہل سنّت اس خیال کو گمراہی بلکہ سیکڑوں گمراہیوں کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔

شیعہ اور خوارج کے بعد اسلام کے اُسی ابتدائی دور میں اور بھی بہت سے فرقے پیدا ہوئے، مثلاً معتزلہ، جہمیہ، مرجیہ، قدریہ، جبریہ وغیرہ۔ میں نے جہاں تک سمجھا ہے، اہل السنّۃ والجماعت کے اوران کے تمام اختلافات کی اصل بلیاد یہی ہے، کہ اہل السنّۃ ظاہرِ کتاب وسنّت کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں، اور نصوص کو اپنی ناقص عقل اور رائے کے مطابق کرنے کے لئے اُن میں تاویلیں نہیں کرتے، اور صحابۂ کرام کے اجتماع اور اتفاق کو دین کے بارے میں

قطعی سند اور واجب الاتباع مانتے ہیں۔ اور یہ دوسرے فرقے اپنی عقل و رائے کو اور اپنی صوابدید کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اس کی وجہ سے کتاب وسنّت کے نصوص میں بھی تاویلیں کرتے ہیں، اور صحابۂ کرام کے اجتماعی مسلک سے اختلاف کرنے میں بھی انھیں کوئی دریغ نہیں ہوتا۔ گویا ان دوسرے فرقوں کے مقابلہ میں اہل السنۃ کا امتیاز اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے "ما انا علیه واصحابی"۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کی سنّت اور صحابۂ کرام کے طریقے کو مضبوطی سے پکڑا ہے، وہ اس کے مقابلہ میں اپنی عقل اور رائے کی دنیا کے قیل وقال کی پروا نہیں کرتے۔ بہر حال اہل السنۃ والجماعت اور ان دوسرے فرقوں کے درمیان عقائد اور خیالات میں جتنے بھی اختلافات ہیں وہ سب طرز فکر کے اسی بنیادی فرق کا نتیجہ ہیں۔

میں مثال کے طور پر اہل السنۃ کے اور ان فرقوں کے بعض اختلافی مسائل کا بھی ذکر کرتا ہوں اس سے طرزِ فکر کا یہ بنیادی فرق انشاء اللہ اور زیادہ کھل کر آپ کے سامنے آجائے گا۔

## مرتکبِ کبیرہ کے بارے میں اختلاف اور اُس کی بنیاد

خوارج کا مشہور مسئلہ ہے کہ گناہِ کبیرہ کے ارتکاب سے آدمی کافر، قطعی کافر ہو جاتا ہے، اور آخرت میں اس کا انجام بالکل وہی ہوگا جو کافروں کا ہونے والا ہے، ان کے اس مسئلہ کی بنیاد کتاب اور سنّت کے بعض اُن نصوص پر ہے جن میں بعض کبیرہ گناہوں پر کفر کا اطلاق کیا گیا ہے، یا "لَا اِيمَانَ" [1] یا "لَيْسَ مِنَّا" [2] یا "لَا سَهْمَ فِي الْإِسْلَامِ" [3] جیسے الفاظ فرمائے گئے، یا لعنت یا عذابِ نار کی وعید وارد ہوئی ہے۔

ان کے مقابلہ میں دوسرا فرقہ مُرجیہ ہے جو کہتا ہے کہ آخرت کے عذاب سے بچنے کے لئے صرف ایمان کافی ہے، ایمان لانے کے بعد اگر کوئی شخص عمر بھر کبیرہ گناہ کرتا رہے تو دوزخ میں نہیں جائے گا، بس اتنا ہی ہوگا کہ گناہ نہ کرنے والے اہلِ ایمان کے مقابلہ میں اس کا مقام اور درجہ کچھ کم ہوگا۔ یہ لوگ اُن نصوص سے استدلال کرتے ہیں جن میں صرف ایمان پر جنّت کی بشارت دی گئی ہے، اور ان کے خلاف جو نصوص ہیں اُن سب کی تاویل کرتے ہیں، اسی طرح خوارج اُن نصوص کی تاویل کرتے ہیں جو اُن کے مسلک کے خلاف ہیں،

---

[1] اُس میں ایمان نہیں۔ [2] وہ ہم میں سے اور ہماری جماعت میں سے نہیں۔ [3] اس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔

اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہِ کبیرہ کرنے سے آدمی کافر نہیں ہو جاتا۔

لیکن اصل بات یہ ہے کہ ان دونوں فرقوں کے جو پیشرو تھے، جن سے ان کا سلسلہ شروع ہوا ہے، اس مسئلہ میں اُن کا اپنا اپنا ایک خیال اور رُجحان تھا، مسلکِ خروج کے بانیوں اور ابتدائی داعیوں کا رجحان بعض خاص تاریخی اسباب کی بناء پر اس طرف تھا کہ گناہِ کبیرہ کے ارتکاب کو کفر قرار دیا جائے، اور مرتکبین کبائر کو کافروں میں شمار کیا جائے، اور مُرجیہ کے پیشرؤوں کا رجحان یہ تھا کہ ایمان کے بعد گناہ کو (اگرچہ وہ کبیرہ ہی کیوں نہ ہو) بہت ہلکی اور معمولی بات سمجھا جائے۔ پس جو نصوص جس فرقہ کو اپنے رجحان اور اپنے خیال کے مطابق نظر آئے اُن کو تو انھوں نے اپنی سند بنالیا، اور جو خلاف نظر پڑے اُن کا یا تو کسی بنیاد پر انکار کر دیا یا اُن میں تاویل کر ڈالی۔

اور اہلسنت نے بجائے یہ طرز اختیار کرنے کے اپنے اصول کے مطابق یہ دیکھا کہ صحابہ کرام نے اس مسئلہ کو کس طرح سمجھا، اور اُن کا مسلک اس بارے میں کیا تھا؟ بس اُسی کو انھوں نے اختیار کر لیا، اور وہ یہ تھا کہ کبائر کا ارتکاب نہ تو بالکل کفر ہے جس کی وجہ سے آدمی اسلام سے بالکل نکل جاتا ہو، جیسا کہ خوارج کہتے ہیں، اور نہ ایسی ہلکی اور معمولی بات ہے جیسا کہ مُرجیہ کا خیال ہے، بلکہ وہ موجب عذاب اور موجبِ لعنت ہے، لیکن اگر اللہ چاہے تو معاف ہو سکتا ہے، بس اسی کو اہل السنۃ والجماعت نے اختیار کر لیا، اور اس باب کے تمام نصوص کا مطلب وہی قرار دیا جو صحابہ کرام نے سمجھا تھا۔

## مسئلہ رویت باری تعالیٰ

دوسرا مسئلہ جس کا میں بطور مثال ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رویت کا مسئلہ ہے، صحیح احادیث میں اس کا صاف صاف ذکر آیا ہے، اور حضور ﷺ نے ایمان والوں کو بشارت سنائی ہے کہ جنت میں اُن کو دوسری نعمتوں کے علاوہ حق تعالیٰ کا دیدار بھی نصیب ہوگا، اور اہلِ ایمان کے لئے یہ نعمت جنّت کی باقی سب نعمتوں سے زیادہ خوش کن اور لذّت بخش ہوگی۔ قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے:۔

"وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ" (سورہ قیمٰہ۔ ع ۱)

یعنی اُس دن کچھ چہرے تروتازہ اور بارونق اور اپنے رب کی طرف
دیکھنے والے ہوں گے۔

جس کا ظاہر مطلب یہی ہے کہ آخرت میں اللہ کے اطاعت شعار بندوں کے چہرے روشن اور چمکتے ہوئے ہوں گے اور ان کو جمالِ حق کے نظارہ کی دولت نصیب ہوگی۔

## معتزلہ کے انکار کی بنیاد

معتزلہ جن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دین کے بارے میں عقل پر اس سے زیادہ بوجھ ڈالتے ہیں جتنا کہ وہ بیچاری اُٹھا سکتی ہے، اور جو ہر دینی حقیقت کو اپنی عقل سے سمجھ لینے کے بعد ماننا چاہتے ہیں، چونکہ رویت باری کا مسئلہ اُن کی سمجھ میں نہیں آسکا اور اُن کی عقلوں نے اس سے انکار کیا، اس لئے وہ اس کے منکر ہو گئے، اُن کے انکار کی اصل بنیاد دراصل اُن کا یہ عقلی شبہ ہے کہ آنکھوں سے تو جسم اور رنگ اور سطح رکھنے والی کسی مادّی چیز ہی کو دیکھا جا سکتا ہے، اور اس کو بھی جب دیکھا جا سکتا ہے جب کہ وہ آنکھ کے سامنے کی جانب ہو، اور اتنے فاصلے پر ہو کہ وہاں تک ہماری نگاہ کام کر سکے، حق تعالیٰ جو مادّہ سے اور مادّہ کے تمام خواص سے منزّہ ہے، اور کسی مکان اور کسی سمت میں نہیں ہے، بلکہ لامکاں اور وراء الوراء ہے اُس کو آنکھ سے کیونکر دیکھا جا سکتا۔ بہرحال معتزلہ نے رویت باری کے مسئلہ کو عقل سے نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے اس کا انکار کر دیا، اور نصوص کی تاویلیں کیں اور ان کے مختلف جوابات دیئے، اور یہی راہ حضرات شیعہ نے اختیار کی، وہ بھی اس مسئلہ میں معتزلہ ہی کے ہم خیال ہیں۔

## اہلسنّت کے اثبات کی بنیاد

لیکن اہلِ سنّت نے جب دیکھا کہ رسُول اللہ ﷺ نے احادیث صحیحہ میں اس کی صاف صاف بشارت دی ہے، اور صحابۂ کرامؓ نے اُن نصوص سے یہی سمجھا ہے کہ اہلِ ایمان کو جنت میں حق تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا، اور یہی اُن حضرات کا عام عقیدہ ہے تو اہلِ سنّت نے اسی کو اختیار کر لیا، اور معتزلہ جیسے عقل پرستوں کے عقلی شبہات کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ بس یہی ہے اہلِ سنّۃ والجماعت اور دوسرے فرقوں کے طرزِ فکر کا بنیادی فرق۔

اس سے آپ کو یہ شبہ نہ ہو کہ اہلِ السنّۃ کا مذہب خلافِ عقل ہے، واقعہ یہ ہے کہ اہلِ السنّۃ والجماعت کا ایک عقیدہ اور ایک مسئلہ بھی عقل کے خلاف نہیں ہے، الحمد للہ متکلمین اہلِ سنّت نے اسی شبہ کے دور کرنے کے لئے ایک ایک مسئلہ کی معقولیت بھی نہایت روشن دلائل سے ثابت کر کے دکھادی ہے۔

اسی رویت باری کے مسئلہ کو دیکھئے، اہلِ سنّت نے اُس کے منکرین اہلِ اعتزال اور اہلِ تشیع کے عقلی شبہات کے ایسے نفیس جوابات دیئے ہیں کہ عقل سلیم بالکل مطمئن ہو جاتی ہے، اگر کسی کو اس مسئلہ کی تفصیلی بحث دیکھنی ہو تو وہ ردّ شیعہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی مشہور کتاب ''تحفۂ اثناعشریہ'' میں دیکھ لی جائے، یا مولانا عبدالحق صاحب حقانی دہلویؒ کی کتاب ''عقائدالاسلام'' کا مطالعہ کرلیا جائے۔

اس سلسلہ میں ایک مختصر سی بات میں یہاں بھی ذکر کئے دیتا ہوں تا کہ آپ میں سے کسی کے دل میں اگر کوئی خلجان ہو تو اس کا اِزالہ ہو جائے۔

## معتزلہ کے عقلی شبہ کا جواب

معتزلہ کے عقلی شبہ کی بنیاد اِس چیز پر ہے کہ اِس دنیا میں کسی چیز کو دیکھنے کا جو طریقہ اور جو قانون ہے اور اس کے جو شرائط ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ کسی چیز کو دیکھنا ان کے بغیر ممکن ہی نہیں، حالانکہ یہ بنیاد ہی سرے سے غلط ہے، خود معتزلہ بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے، کہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوقات کو دیکھتے ہیں، مادّی کو بھی اور غیر مادّی کو بھی اور چونکہ اللہ تعالیٰ وراء الورا ہے، اس لئے کسی مخلوق کے متعلق بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محاذاۃ میں یعنی اس کے سامنے اور اس کی سیدھ میں ہے، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ سب کو دیکھتے ہیں، پس معلوم ہوا کہ معتزلہ رویت کے جس قانون کو قانونِ کُلی سمجھتے ہیں وہ دراصل کُلی نہیں ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جو محدود قوتِ بینائی اس دنیا میں ہماری آنکھوں کو دی گئی ہے، اُس کا یہ حال ہے کہ وہ عام طور سے صرف مادّی چیزوں کو دیکھتی ہے، اور وہ بھی جبکہ وہ ہمارے سامنے ہوں، اور ایک محدود فاصلہ پر ہوں۔ پس اس بنیاد پر آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رویت کا انکار کرنا ہرگز صحیح نہیں ہے، کیونکہ وہاں اہلِ جنّت کی تمام قوتوں میں ہزاروں لاکھوں گنا اضافہ ہوگا، پس

وہاں قوتِ بینائی بھی وہ بخشی جائے گی جو حق تعالیٰ کے دیدار کی بھی لذّت لے سکے۔

اسی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض تدبیروں سے اور خوردبین اور دوربین جیسے آلات کی مدد سے اَب وہ چیزیں دیکھ لی جاتی ہیں جن کو دیکھنے کا لوگ پہلے تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، پس اس میں کچھ بھی استبعاد نہیں کہ اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کو وہ قوتِ بینائی نصیب فرما دیں جس سے حق تعالیٰ کی بھی رویت ہو سکے۔

بہرحال معتزلہ وغیرہ نے جس عقلی شبہ کی بناء پر رویت باری کے مسئلہ سے انکار کیا تھا اس میں پہلے بھی کوئی جان نہیں تھی، اور اب اس زمانہ کی نئی ایجادوں اور نئے انکشافات نے تو اس قسم کے تمام احمقانہ شبہات کا خاتمہ کر دیا ہے، آج ایسی ہزاروں چیزیں بازاروں میں دُکان دُکان بک رہی ہیں جن کا اگر کوئی شخص اب سے پانچ سو برس پہلے ذکر کرتا تو لوگ بالکل ناممکن سمجھتے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اب اس زمانہ میں کسی دینی حقیقت کے متعلق کسی کا یہ کہنا کہ یہ ہماری عقل میں نہیں آتی اس لئے ہم اس کو نہیں مانتے، اپنی انتہائی بے عقلی کا اعلان کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا تھا:۔

"سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ" (حٰم سجدہ۔ع۔۶)

ہم اُن کو آفاق میں اور خود اُن کے اندر اپنی نشانیاں دکھائیں گے۔

ہمارے اس زمانہ کی ایجادات نے سیکڑوں اُن مسئلوں کا سمجھنا لوگوں کے لئے آسان کر دیا ہے جن کو لوگ اپنی حماقت سے خلافِ عقل سمجھا کرتے تھے۔

بات اپنی جگہ سے بہت دور چلی گئی، میں آپ حضرات کو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ معتزلہ وغیرہ نے رویت باری کا انکار صرف اس لئے کیا کہ ان کی عقل اس کے سمجھنے سے قاصر رہی، اور اہلِ سنّت نے صرف یہ دیکھ کر اس کو مان لیا، اور بطور عقیدہ کے قبول کر لیا کہ ظاہر نصوص سے انھوں نے یہی سمجھا، اور صحابۂ کرام کو انھوں نے اسی عقیدہ پر پایا۔

## مسئلہ جبر وقدر

اسی طرح قدریہ اور جبریہ نے جبر وقدر کے مسئلہ میں اپنے رجحانات اور اپنے عقلی قیاسات کی بناء پر قدر یا جبر کا مسلک اختیار کیا، اور جن نصوص کو انھوں نے اپنے خیال اور

اپنے رجحان کے کچھ موافق سمجھا، ان کو اپنے اس عقیدہ کی سند بنایا، اور جو نصوص صراحۃً ان کے خلاف تھے، اُن کا یا تو کسی حیلہ سے انھوں نے انکار کیا، یا اُن میں تاویلیں کیں، لیکن اہلِ سنّت نے ظواہر نصوص اور صحابۂ کرام کے مسلک کی تقلید کی، انھوں نے دیکھا کہ صحابۂ کرامؓ دنیا کی ہر چیز کو اور بندوں کے بھی تمام احوال اور اعمال کو اللہ کی قضا و قدر سے مانتے ہیں، اور بندہ کو اپنے اعمال میں صاحب ارادہ ماننے کے باوجود مختار مطلق نہیں مانتے جیسا کہ قدریہ کہتے ہیں اور نہ اس کو جمادات اور نباتات کی طرح مجبور محض مانتے ہیں جیسا کہ جبریہ کا خیال ہے، پس اسی کو انھوں نے اپنا مسلک اور اپنا عقیدہ بنالیا، اور اس سلسلہ کے تمام نصوص کا مطلب وہی قرار دیا جو صحابۂ کرامؓ نے سمجھا تھا، اور وہی ظاہر مطلب بھی تھا۔

الغرض دوسرے تمام فرقوں کے مقابلہ میں اہلِ السنّۃ والجماعت کا امتیاز اور ان کا شعار یہی ہے کہ وہ صحابۂ کرامؓ کے اجتماعی مسلک کو واجب الاتباع سمجھتے ہیں اور اُن کا بنیادی اُصول یہی ہے کہ دین کی حقیقت کو اور کتاب سنّت کی جس بات کو صحابۂ کرامؓ کی جماعت نے جس طرح سمجھا اور مانا اور ان کے درمیان اس میں اختلافِ رائے نہیں ہوا، اس کو اُسی طرح سمجھنا اور ماننا ضروری ہے، اور کسی کے لئے اس میں اختلافِ رائے کی اور نئے سرے سے اُس پر غور کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

## حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ایک مکتوب میں طریقۂ اہلِ سنّت کی وضاحت

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک مکتوب میں جس کو محدثین نے سند کے ساتھ روایت کیا ہے، اہلِ سنّت کے اس مسلک کی بڑی واضح ترجمانی کی ہے، کسی شخص نے اسی قضا و قدر کے مسئلہ کے متعلق اُن سے سوال کیا تھا۔ آپ نے جواب میں پہلے تو تقویٰ اور اللہ و رسول کی اطاعت اور سنّت کے اتباع و التزام کی تاکید فرمائی اور اس کے بعد تحریر فرمایا:۔

"فَارْضَ لِنَفْسِکَ مَارَضِیَ بِهٖ الْقَوْمُ لِاَنْفُسِهِمْ فَاِنَّهُمْ عَلٰی عِلْمٍ وَقَفُوْا وبصرنا فذ کُفُوْا وَلَهُمْ عَلٰی کشف الا مور کانوا اقویٰ وبِفَضْلِ مَاکَانُوْا فیه اولٰی فَاِنْ کَانَ الْهُدیٰ

مَاانتم عَلَیہِ لَقَدْ سَبقتمُوْھُمْ اِلَیْہِ"

"مطلب یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ کی جماعت نے اپنے لئے جو خیال اور عقیدہ پسند کیا اور جس کو انھوں نے اپنایا تم بھی اُسی کو اپنے لئے پسند کرو، اور اُس کو اپنا مسلک بناؤ، کیونکہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم لائے تھے، صحابۂ کرامؓ اُس سے پوری طرح واقف تھے، اور دین کے بارے میں انھیں وہ گہری بصیرت حاصل تھی جس سے ہر مسئلہ کی تہہ تک پہنچتے تھے، اور دینی حقیقتوں کے سمجھنے پر وہ ہم تم سے زیادہ قادر تھے، اور دین کے علم وفہم میں وہ دوسروں سے بہت زیادہ فضیلت رکھتے تھے۔ پھر بھی اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ (اپنے اس خیال میں جو تم نے صحابۂ کرامؓ کے خلاف قائم کیا ہے) تم راہِ راست پر ہو تو گویا اس کے مدعی ہو کہ تم دین میں صحابۂ کرامؓ کی پوری جماعت سے آگے بڑھ گئے ہو، ظاہر ہے کہ یہ کس قدر احمقانہ اور گمراہانہ بات ہے۔

اس کے بعد چند سطروں میں نفس مسئلہ کو بیان فرمایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بہت سی حدیثوں میں مسئلہ تقدیر کو بیان فرمایا ہے، اور صحابۂ کرامؓ نے آپ ہی سے اس عقیدے کو لیا، اور آپ کی حیات میں آپ کے سامنے اور آپ کی وفات کے بعد یہی اُن کا عقیدہ اور اُن کا یقین رہا، اور وہ اِسی کو دوسروں کے سامنے بیان کرتے رہے، اور کتابُ اللہ سے بھی انھوں نے یہی سمجھا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اور ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ سب پہلے سے اللہ کے علم میں ہے، اور لوحِ محفوظ میں مکتوب ہے، اور تقدیرِ الٰہی اس کا فیصلہ کر چکی ہے۔ یہ سب لکھنے کے بعد آخر میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ولئن قلتم لم انزل اللّٰہ ایۃ کذا ولم قال کذا؟ لقد قرأوا منہ ماقرأتم وَعَلِمُوْامِنْ تاوِیْلِہٖ مَاجَھِلْتُمْ وَقَالُوْا بعد ذالک کلّہٖ بکتاب وقدر [1]

مطلب یہ ہے کہ اگر تم قرآنِ مجید کی بعض آیات کو اس کے خلاف

---

[1] ابوداؤد کتاب السنۃ باب فی لزوم السنۃ ۱۲

پا رہے ہو، اور اپنی دانست میں تم ان آیتوں کو مسئلہ تقدیر کے خلاف سمجھتے ہو، تو یہ تو سوچو کہ یہ سب آیتیں قرآن مجید میں صحابۂ کرامؓ نے بھی پڑھی تھیں، اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیم و تربیت اور آپ کے فیضِ صحبت سے وہ قرآن کو تم سے بہتر سمجھنے والے تھے، اس کے باوجود وہ اس مسئلہ تقدیر کے قائل ہوئے پس اس سے تمھیں خود سمجھ لینا چاہئے کہ تم ان آیتوں کا مطلب سمجھنے میں غلطی کھا رہے ہو:۔

پس اہلِ السنۃ والجماعت کا مسلک اور ان کا بنیادی اصول بالکل یہی ہے، جو حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اپنے اس مکتوب میں بیان فرمایا ہے، یعنی دین کے بارے میں جماعت صحابہ پر پورا اعتماد کرنا اور ان کے مقابلہ میں اپنے علم و فہم کو ناقص اور نارسا سمجھتے ہوئے ان کے اجتماعی مسلک اور اجماعی فیصلوں کی پوری پوری تقلید کرنا۔ اس طریقے میں بڑی سلامتی اور بڑی حفاظت ہے، اور جمہور اُمت کا مسلک یہی رہا ہے، اور یہی وہ صحیح مسلک ہے جس کو حدیث شریف میں "ما انا علیه و اصحابی" فرمایا گیا ہے۔

## سلف صالحین کے اتباع ہی میں فتنوں سے حفاظت ہے

دراصل بعد والوں کے لئے خیریت اسی میں ہے کہ وہ اپنے سلف صالحین کا اتباع کریں، جب آدمی اس سے آزاد ہو جاتا ہے تو شیطان اُس کو آسانی سے کسی گمراہی اور فتنہ میں مبتلا کر سکتا ہے، جن لوگوں نے سلف صالحین کا دامن مضبوطی سے تھام لیا، وہ ہر قسم کے فتنوں سے محفوظ رہے، اور جنھوں نے اپنی عقل اور اپنے فہم و علم پر زیادہ بھروسہ کیا، اور سلف کے اجماعی فیصلوں کی بھی پابندی ضروری نہ سمجھی، وہ شیطان کا شکار ہو گئے۔ جتنے گمراہانہ خیالات اور گمراہ فرقے پہلے پیدا ہوئے، یا اب ہمارے زمانے میں پیدا ہو رہے ہیں، وہ سب سلف صالحین کے مقابلہ میں اپنے علم و فہم پر زیادہ اعتماد کرنے اور ان کے اتباع سے اپنے کو آزاد سمجھنے ہی کا نتیجہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے بزرگانِ اہلِ سنّت کو جزائے خیر دے، انھوں نے اس راز کو خوب سمجھا، اور صحابہ کرام اور ان کے طریقے پر چلنے والے سلف صالحین کے اتباع کو اتنی اہمیت دے کر جمہور اُمت کو شیطان کے جال میں پھنسنے سے بچا لیا۔

## اس زمانہ میں سلفِ صالحین کا اتباع ہمیشہ سے زیادہ ضروری ہے

خاص کر ہمارے اس زمانہ میں جبکہ آزاد خیالی کی وبا عام ہے اور بہت سے لوگ صرف اُردو کے رسالے پڑھ پڑھ کر دین کے بارے میں بالکل مجتہدانہ بلکہ آزادانہ طور پر غور کرنے کا اپنے کو حقدار سمجھنے لگتے ہیں تو اس وقت تو ہمیشہ سے زیادہ اتباع سلف کے اس اصول پر مضبوطی سے جمنے کی اور دوسروں کو جمانے کی ضرورت ہے، ہر فتنہ اور ہر گمراہی سے اس میں حفاظت ہے اور اس میں سلامتی ہے۔

## ایک گمراہ کن مغالطہ

اس جگہ ایک مغالطہ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔

بعض لوگ جن کی نظر میں سلف کے اتباع کی اتنی اہمیت نہیں ہے، وہ کہا کرتے ہیں کہ اصل چیز بس قرآن وحدیث ہے، اور دین میں قرآن وحدیث کے سوا کسی چیز کو سند نہیں مانتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ فقرہ بہت چست اور بہت چلتا ہوا ہے، اور فی نفسہٖ صحیح بھی ہے، لیکن یہ لوگ اس کو بہت غلط معنیٰ میں استعمال کرتے ہیں، گویا اب یہ "کَلِمَۃُ حَقٍّ اُرِیْدَ بِہِ الْبَاطِلُ" کے قبیل سے ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ سب ایمان والوں کے نزدیک دین کا اصل ماخذ کتاب وسنّت ہی ہیں، لیکن کتاب وسنّت کوئی بولتے ہوئے انسان تو ہیں نہیں کہ ہم جا کے اُن سے کوئی سوال کریں اور وہ ہم کو ہماری زبان میں فوراً جواب دیدیں، بلکہ کتاب وسنت سے کسی چیز کو معلوم کرنے کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ کوئی شخص جو کتاب وسنّت کی زبان اور اُن کے اسلوب بیان سے پوری واقفیت رکھتا ہو، دین کے مقصد ومزاج اور تشریع کے اصول کا بھی پورا واقف اور ماہر ہو، وہ غور کرے اور کتاب وسنّت کے مقصد ومنشاء کو سمجھے، اب ہم لوگ جو دین کے فہم میں بھی سلف صالحین کی برتری کے قائل ہیں، اور اس لئے ان کے اتباع میں سلامتی سمجھتے ہیں، ہمارا اصول اور طریقہ کار تو یہ ہے کہ جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ سلف صالحین نے اس بارہ میں کتاب

وسنّت کا مقصد و منشا یہ سمجھا ہے اور ان سب کا یا جمہور سلف کا یہ متفقہ مسلک ہے تو ہم صرف اسی کو صحیح سمجھتے ہیں اور اسی کا اتباع ضروری جانتے ہیں اور اس کے خلاف ہر نئی رائے کو تسویل شیطانی سمجھتے ہیں۔ اور جو لوگ سلفِ صالحین کا اتباع نہیں چاہتے اور جن کو ان کے علم و فہم سے زیادہ اپنے علم و فہم پر اعتماد ہے وہ اپنی رائے اور اپنی سمجھ کا اتباع کرتے ہیں، اور کتاب وسنّت کا نام لے کر دوسروں کو بھی اسی کے اتباع کی دعوت دیتے ہیں۔ پس ہمارے اور ان کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل میں فرق یہ نہیں ہے کہ وہ دین میں اصل سند کتاب وسنّت کو قرار دیتے ہیں اور ہم سلفِ صالحین کو بلکہ یہ ہے کہ ہم کتاب وسنّت کا منشاء متعین کرنے کے بارے میں سلفِ صالحین کے فہم و فکر کو زیادہ قابلِ اعتماد سمجھتے ہیں، اور وہ اپنے خیالات اور اپنے فہم پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی بجائے سلف کے ان کی تقلید کریں۔

## خوارج کا قرآنی نعرہ اور حضرت علیؓ کا جواب

گویا بالکل وہی معاملہ ہے جو خوارج اور سیّدنا حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ کے درمیان پیش آیا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دَورِ خلافت کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک جگہ خوارج کا مجمع تھا، امیر المومنین حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ ان کو سمجھانے کے لئے تشریف لے گئے، خوارج نے شور مچایا کہ ہم بس کتابُ اللہ کی مانیں گے، ہم سے جو کچھ منوانا ہو قرآن سے منواؤ ہم قرآن کے سوا کچھ نہیں سننا چاہتے (جیسا کہ آج کل کے بھی بہت سے گمراہ فرقے ایسے ہی نعرے لگایا کرتے ہیں)۔ حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کا طویل وعریض ضخیم نسخہ لیا اور ان لوگوں کے سامنے اس پر ہاتھ مار کے فرمایا:-

**ایھا المصحف حدث الناس! ایھا المُصحَف حدِث الناس!**

یعنی اے قرآن بول! یہ لوگ جس معاملہ میں جھگڑ رہے ہیں ان کو اس کی حقیقت بتلا!

حضرت علیؓ نے اس مصحف پر ہاتھ مار کے بار بار یہی فرمایا:-

اس پر خوارج ہی میں سے بعض لوگوں نے کہا اے امیر المومنین! یہ مصحف تو کاغذ ہے، اور روشنائی سے لکھے ہوئے حروف ہیں، یہ تو کوئی بولنے والی چیز نہیں ہے جو بولے اور جواب دے، اس کے بعد حضرت علی مرتضٰیؓ نے ان لوگوں کو قرآن مجید کی آیات ہی سے مسئلہ کی

حقیقت سمجھائی اُن کے اشکالات کا جواب دیا اور اُن کے باطل خیالات کا تفصیلی رد کیا[1] گو اسطرح انھیں بتلایا کہ قرآن کی پیروی کی صورت یہی ہے کہ جو قرآن جاننے والے اور سمجھنے والے ہیں وہ جو کچھ قرآن سے سمجھ کر بتلائیں اس کی پیروی کی جائے۔

اس واقعہ سے مجھے صرف یہ بتلانا تھا کہ ہمارے اس زمانہ کے جو لوگ اور جو نئے فرقے اتباع سلف کے اصول کے قائل نہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم صرف کتاب وسنّت کو مانتے ہیں، دراصل ان کی ذہنیت بالکل وہی ہے جو اُن خوارج کی تھی، اور وہ لوگوں کو سلف کے اتباع سے توڑکر اپنے متبعین میں داخل کرنا چاہتے ہیں، اور جو سادہ لوح ان کی بات مانتے ہیں وہ درحقیقت سلفِ صالحین کے اتباع سے آزاد ہو کر خود ان کے متبع اور مقتدی بن جاتے ہیں اور اسی سے امت میں نئے فرقے اور نئے نئے گروہ پیدا ہوتے ہیں۔

بہرحال دین کے بارے میں سلفِ صالحین پر اعتماد اور ان کا اتباع ہمارے نزدیک نہایت ضروری ہے، اور اسی میں عام مسلمانوں کے دین وایمان کی حفاظت ہے۔

## فقہی مسائل میں تقلید

یہ ساری گفتگو تو ایمانیات اور عقائد میں تھی، فروع اور فقہی مسائل میں بھی ہمارے نزدیک آئمہ حق کی تقلید اور سلف کے اتباع ہی میں سلامتی ہے، خصوصاً ہمارے اس زمانے میں جبکہ اجتہاد اتنا آسان اور اتنا ارزاں ہوگیا ہے کہ جو لوگ قرآن وحدیث کے اُردو ترجے بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے، وہ بھی اپنے کو اجتہاد کا حقدار سمجھتے ہیں[2]۔

---

[1] واقعہ کا تفصیلی بیان البدایہ والنہایہ صفحہ ۲۸۰ر۷ میں دیکھا جائے۔

[2] حضرت شاہ ولی اللہؒ اگرچہ مجتہدانہ طرزِ فکر رکھتے ہیں، لیکن "حجۃ اللہ البالغہ" میں اس مسئلہ پر کلام کرتے ہوئے صاف فرماتے ہیں:۔ ان هذه المذاهب الاربعة المدونة المحررة قد اجتمعت الامة او من يعتدبه منها على جواز تقليدها الىٰ يومنا هذا وفى ذالک من المصالح مالا يخفى سيما فى هذه الايام التى قصرت فيها الهمم جدًا واشربت النفوس الهوىٰ واعجب كل ذى رايٍ برايه (ص۱۵۴/ج۱)
مطلب یہ ہے کہ مذاہب اربعہ کی تقلید جائز اور صحیح ہونے پر پوری اُمت کا یا کہنا چاہئے کہ اس کے قابلِ اعتبار عناصر کا اجماع ہے، خصوصاً ہمارے اس زمانہ میں جب کہ علم کم ہے اور ہویٰ پرستی اور خودرائی زیادہ، تو اب تو ان مذاہب کی تقلید میں دین کی بڑی حفاظت اور مصلحت ہے۔ ۱۲

جو حضرات اہلِ علم کسی خاص فقہی مسلک کی تقلید پر مطمئن نہیں ہیں اُن کے لئے بھی آتنا تو نہایت ہی ضروری ہے کہ جن مسائل پر آئمہ، مجتہدین خصوصًا ائمۂ اربعہ غور کر کے متفق ہو چکے ہیں، ان میں کوئی نئی راہ اختیار نہ کریں، اور جن مسائل میں ان حضرات کے درمیان اختلاف ہے ان میں بھی ان سب سے الگ کوئی نئی رائے قائم نہ کی جائے، اس اصول کی پابندی نہ کرنے میں سخت بے احتیاطی اور خود رائی بھی ہے، اور امت میں اس انتشار بھی پیدا ہوتا ہے، خصوصًا اللہ کے وہ بندے جو اس امت کی کچھ دینی خدمت بھی کرنا چاہتے ہیں، اُن کے لئے تو بالخصوص ضروری ہے کہ وہ اپنے خیالات اور اپنے طرز عمل سے اُمّت میں انتشار نہ پیدا کریں، اور لوگوں کو اپنے سے بدگمان اور دور کرنے والی باتوں سے بچیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ علیہ نے ''فیوض الحرمین'' میں ذکر کیا ہے کہ رسُول اللہ ﷺ نے (مدینۂ طیبہ کے زمانۂ قیام میں) مجھے تین ایسی باتوں کی تاکید اور وصیت فرمائی جو میرے ذاتی رجحان اور طبعی میلان کے خلاف تھیں۔ اُن میں سے ایک فقہی مسائل میں ان مذاہب اربعہ کی تقلید کا مسئلہ بھی تھا۔

اس کی خاص حکمت یہی تھی کہ ہندوستان میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ کو دینی اصلاح کا جو کام کرنا تھا اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ عوام دین و مذہب کے بارے میں اُن سے برگشتہ اور بدگمان نہ ہوں، اور اُن پر اعتماد کریں۔ بہر حال ہم جیسوں کے لئے تو یہ نہایت ہی ضروری ہے۔ اس وقت اُمّت جس حال میں ہے اُس کو ہمارے نئے نئے اجتہادات کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اُس میں ایمان اور ایمان والی زندگی پیدا کرنے کے لئے عملی جد و جہد کی اور اس راستے میں اپنی جانوں کو بے قیمت کرنے کی ضرورت ہے۔

ایمانیات و عقائد اور دینی طرز فکر کے متعلق جو کچھ اب تک عرض کیا گیا ہے، اُمید ہے کہ انشاء اللہ وہ اس باب میں کافی وشافی ہوگا۔ اب آگے شریعت کے دوسرے عملی شعبوں کے متعلق بھی اسی انداز میں اصولی طور پر کچھ عرض کرنا ہے۔ واللہ الموفق۔

..........................

# عملی شریعت

اس سلسلہ کے شروع ہی میں عرض کیا گیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ جو دینی تعلیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے، اس کا ایک حصّہ تو وہ ہے جس کا تعلق عقائد وافکار سے ہے، جس کا بقدرِ ضرورت بیان کیا جاچکا۔ اور دوسرا حصّہ وہ ہے جس کا تعلق اعمال واخلاق سے ہے۔ کبھی کبھی صرف اسی حصّے کے لئے شریعت کا لفظ بولا جاتا ہے۔

## شریعت کے شعبے

اس کے چند شعبے ہیں۔

عبادات، اخلاق، معاملات ومعاشرت، دینی جدوجہد، اور سیاست وحکومت۔

## عبادات کی خصوصی اہمیت

جس طرح اُمہات العقائد کو دوسرے عقائد کے لحاظ سے خاص اہمیت حاصل ہے، اسی طرح شریعت کے دوسرے شعبوں کے مقابلے میں عبادات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ عبد اور معبود کا تعلق، دوسری سب چیزوں کی بہ نسبت عبادات سے زیادہ ظاہر ہوتا ہے، اور زندگی کے دوسرے شعبوں کی اصلاح اور درستی میں بھی عبادات کو خاص دخل ہے۔

عبادات کے متعلق جو کچھ یہاں عرض کیا جانا ہے، اُس سے پہلے آپ عبادت کا مطلب سمجھ لیجئے:۔

## عبادات سے کیا مراد ہے؟

عبادت سے مراد خاص وہ اعمال ہیں جو بندہ اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی اور اس کے سامنے اپنی عاجزی اور بیچارگی اور بندگی اور سرافگندگی ظاہر کرنے کے لئے کرتا ہے، اور اس

سے اُس کا مقصد صرف اللہ کی رضا اور اس کا تقرب حاصل کرنا ہوتا ہے۔ عربی میں ان عبادات کو قُربَات بھی کہتے ہیں۔ جیسے:۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وصدقات، ذکر و تلاوت، قربانی جیسے تعبدی اعمال، جو صرف اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اور اپنے روحانی پہلو کی درستی اور ترقی کے لئے کئے جاتے ہیں۔ اور وہ صرف عبد و معبود کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔

## عبادت کا مقصد

عبادت کا ایک تعلق معبود سے ہے اور ایک عبد سے ہے، یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ ہماری عبادات سے معبود کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، اور اس کی شان میں ذرّہ برابر اضافہ نہیں ہوتا۔ ایک حدیث میں آتا ہے، کہ:۔

> "اگر سارے انسان اور سب اوّلین وآخرین اعلیٰ درجہ کے متقی اور عبادت گذار ہو جائیں تو اللہ کی شان اور اس کی عظمت و کبریائی میں ذرّہ برابر زیادتی نہیں ہوگی، اور اگر سب کے سب بدترین قسم کے نافرمان اور پورے شیطان بن جائیں تو اللہ تعالیٰ کی شان میں اور اُس کے عظمت وجلال میں ذرّہ برابر کمی نہیں آئے گی"۔

بہر حال ہماری عبادات سے اللہ تعالیٰ کو ذرّہ برابر کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، اور نہ اُس کی شانِ کبریائی میں کوئی اضافہ ہوتا ہے، بلکہ ہماری عبادتیں دراصل صرف ہمارے ہی فائدے اور ہماری ہی تکمیل کے لئے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں عبادت کا حکم صرف اس لئے دیا ہے کہ اُس کے ذریعہ ہم ترقی کریں، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو بڑھائیں، اور اس کی خاص رضا اور رحمت کے مستحق بنیں۔

اصل بات یہ ہے کہ بندے میں اور مولا میں کوئی مناسبت ہی نہیں، کہاں زمین وآسمان کا خالق و مالک حق تعالیٰ شانہٗ، اور کہاں ایک ناپاک بدبودار قطرے سے پیدا ہونے والا اور گندے خون سے بننے والا انسان، حقیقت یہ ہے کہ زمین پر رینگنے والے ایک گھنونے حقیر کیڑے میں اور دنیا کے بڑے سے بڑے بادشاہ میں جو نسبت ہے، بندہ میں اور مولا میں وہ بھی تو نہیں ہے، پھر بندہ اُس کا قرب اور اُس کی رضا اور محبت کیسے حاصل کرے؟

پس اس کی صورت یہی ہے کہ اس کی انتہائی برتری اور کبریائی اور اُس کے سامنے اپنی انتہائی ذلّت و پستی اور عاجزی و بیچارگی اور عبدیت و فدائیت کا اعتراف اور اپنے عمل سے اس کا اظہار کرے، بس یہی چیز بندے کو پاک اور بلند کر کے اللہ کا مقرب اور محبوب بنا دیتی ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ سے قریب ہو جاتا ہے۔

## انسان کے رُوحانی اور ملکوتی پہلو کا نشو ونما عبادت سے ہوتا ہے

اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان میں دو پہلو ہیں، ایک مادیت اور بہمیت کا، اور ایک روحانیت اور ملکوتیت کا، اور پیدا کرنے والے کے ساتھ اُس کا خاص تعلق ملکوتی اور رُوحانی پہلو سے ہے، اور انسان کا یہی پہلو اصل قیمتی پہلو ہے، جس کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات ہے، دنیا میں انسان جو کھاتا پیتا ہے اور اس قسم کی اپنی جو دوسری خواہشیں پوری کرتا ہے، اُس سب کا تعلق اُس کے بہیمی اور مادّی پہلو سے ہے، جو انسان میں اس سفلی عالم کا حصہ ہے، اور جس میں دوسرے حیوانات بھی انسان کے شریک ہیں، اور اس لئے اس کھانے پینے سے، اور اس طرح کے دوسرے کاموں سے براہ راست اس مادی اور بہیمی پہلو کا نشو ونما ہوتا ہے۔ روحانی پہلو جو انسان میں عالمِ ملکوت کا حصّہ ہے، اور جس کی وجہ سے وہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے، اس کی ترقی اور اس کے نشو ونما کا ذریعہ عبادات ہیں۔ عبادت ہی کے ذریعہ انسان ملاء اعلیٰ سے ایک خاص مناسبت اور ربط پیدا کرتا ہے، گویا عبادت نہ کرنے والے انسان کی حیثیت صرف ایک ترقی یافتہ اور بولتے چالتے جانور کی ہے، بلکہ وہ دوسرے جانوروں سے بدتر ہے (اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ) اور اللہ کی عبادت کرنے والے انسان کی حیثیت ایک ایسی مخلوق کی ہے جس کا قالب اگرچہ مادّی ہے اور اس عالَم کا ہے، لیکن اُس میں روح فرشتوں کی ہے، اور وہ اگرچہ اس زمین پر چلتا ہے اور اُس کا مادّہ اگرچہ اسی عالمِ سفلی کا ہے، لیکن اُس کی رُوح ملاء اعلیٰ کی ہے، اور اس کو اپنے پیدا کرنے والے سے خاص ربط ہے۔

بہر حال انسان کے رُوحانی اور ملکوتی پہلو کا نشو ونما عبادت ہی سے ہوتا ہے، اور

عبادت ہی عالمِ ملکوت اور ملاء اعلیٰ سے ربط اور مناسبت پیدا کرنے کا خاص ذریعہ ہے۔ عبادات کے علاوہ جو دوسرے احکام ہیں اگرچہ اُن سب کی تعمیل میں بھی اجر وثواب ہے، یعنی اخلاق میں بھی اجر وثواب ہے، اور جو معاملہ اور جو برتاؤ کسی کے ساتھ اللہ کے حکم کے مطابق کیا جائے اُس میں بھی اجر وثواب ہے، اسی طرح دین کی جدوجہد بھی بڑے اجر وثواب کی چیز ہے، بلکہ انشاء اللہ آگے اپنے موقع پر آپ کو معلوم ہوگا کہ بعض پہلوؤں سے دین کے ان دوسرے شعبوں کی عبادت سے بھی زیادہ اہمیت ہے، لیکن ملاء اعلیٰ سے ربط اور مناسبت پیدا کرنے کی جو تاثیر اور انسان کے روحانی اور ملکوتی پہلو کی ترقی اور تکمیل کی جو خاصیت عبادات میں ہے وہ کسی دوسرے عمل میں نہیں ہے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے تمام اعمال اگرچہ وہ اللہ کے حکم کے مطابق کئے جائیں اور ہماری نیت بھی حکمِ الٰہی کی تعمیل کی اور رضاءِ الٰہی حاصل کرنے کی ہو، لیکن ان کا تعلق مخلوق سے بھی ہوتا ہے، مثلاً:۔ اخلاق، معاملات، معاشرت، سیاست وحکومت، تعلیم وتعلم، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، ان سب اعمال کا رُخ مخلوق کی طرف ہے، خالق کے ساتھ ان کا تعلق اتنا ہی ہے کہ یہ بھی اُس کے احکام ہیں۔ لیکن عبادات کا تعلق براہِ راست صرف معبود سے ہے، اور اس میں بندے کا رُخ صرف اللہ ہی کی طرف ہوتا ہے غیر کی اس میں کہیں لگاوٹ ہی نہیں ہے، یہی عبادات کا امتیاز ہے، اور دین میں عبادات پر زیادہ زور دینے کا یہی راز ہے۔

## عبادات کے بارے میں مادّیت زدہ لوگوں کی غلط فہمی

جن لوگوں کی فکر ونظر پر مادیت زیادہ غالب آچکی ہے وہ عبادات کے اس امتیاز کو نہیں سمجھ سکے، اس لئے انھوں نے عبادات میں بھی وہ فائدے ڈھونڈے جن کا تعلق اس عالمِ محسوسات سے ہے، یہانتک کہ "عنایت اللہ مشرقی" جیسے بعض لوگ تو اس قدر نیچے گرے، کہ نماز جیسی عبادت کو بھی جو دراصل انسانی روح کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہونے اور اس مادّی عالم سے کٹ کر کچھ وقت کے لئے عالم تجرد اور ملاء اعلیٰ سے وابستہ ہوجانے کا خاص الخاص ذریعہ ہے، انھوں نے اس کو قواعد پریڈ قسم کی ایک ورزش قرار دے دیا،

اور کہا کہ اس سے ڈسپلن پیدا ہوتا ہے، پابندی وقت کی عادت پڑتی ہے، اور اسی قسم کی خرافات، اور بعض لوگ جو اتنے نیچے نہیں گرے، انھوں نے کچھ اور فائدے بیان کئے، جو اتنے پست اور گھٹیا تو نہیں ہے، لیکن بہر حال اُن کا تعلق بھی اسی عالمِ محسوسات سے ہے۔

یہ ساری غلطیاں عبادت کی حقیقت اور اُس کے موضوع اور غایت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اور ذہنوں پر مادیت اور عالمِ محسوسات کی اہمیت کے غالب آجانے کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ بقول کسی کے:۔

"فکر ہر کس بقدرِ ہمّتِ اوست"

## اس غلط فہمی کی ایک مثال

راقم سطور ناچیز محمد منظور نعمانی اور رفیق محترم مولانا سیّد ابوالحسن علی میاں ندوی ایک جگہ گئے ہوئے تھے، کچھ ہی دنوں پہلے الفرقان کے حج نمبر میں مولانا موصوف کا مضمون "اپنے گھر سے بیت اللہ تک" نکلا تھا، واقعہ یہ ہے کہ حج کہ موضوع پر اللہ تعالیٰ نے مولانا سے یہ عجیب وغریب مضمون لکھوا دیا تھا، عجب تاثیر اور عجب سوز سے بھرا ہوا ہے، خود میرا حال یہ ہے کہ میں نے بارہا اس کو پڑھا ہے، لیکن ہر دفعہ اُس نے رلایا ہے، اور بہت بہت رُلایا ہے [1]۔ ایک بڑے اچھے تعلیم یافتہ دوست جن کا دینی مطالعہ بھی اچھا خاصا ہے وہ ملنے آئے، مولانا کے مضمون کی تعریف کی، اور آخر میں کہا:۔ لیکن اس میں ایک بڑی کمی یہ رہ گئی ہے کہ حج کے اجتماع کا جو خاص مقصد اور فائدہ ہے اُس کا آپ نے بالکل ذکر نہیں کیا۔ میں نے عرض کیا وہ کیا؟ فرمایا:۔ یہی کہ تمام دنیا کے مسلمان اور ان کے نمائندے جمع ہو کر وقت کے اہم مسائل پر غور کریں۔ میں نے عرض کیا:۔ یہ آپ نے کہاں سے سمجھا ہے؟ فرمایا:۔ دسویں تاریخ سے لیکر بارھویں تیرھویں تک منیٰ کے میدان جو سارے حجاج کو ٹھہرنے کا حکم ہے، اس کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ شہر کے شور و شغب اور ہنگاموں سے بالکل الگ رہ کر اطمینان سے وہاں کی پُر سکون میدانی فضا میں دنیا کے اہم مسائل پر غور کریں۔ میں نے دریافت کیا کہ:۔ جناب حج کر چکے ہیں، اور آپ نے منیٰ میں حجاج کے ٹھہرنے کا منظر دیکھا ہے؟

---

[1] یہ پورا مضمون "آپ حج کیسے کریں؟" نامی کتاب میں بھی چھپ چکا ہے۔ ۱۲

فرمایا:۔ ابھی تو نہیں اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے۔ میں نے عرض کیا کہ:۔ جب اللہ تعالیٰ نصیب فرمائیں گے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ آپ کتنی بڑی غلط فہمی میں تھے۔

حیرت ہے کہ حج کا یہ مقصد سمجھنے والے، یا اس قسم کی چیزوں کو حج کا "خاص فائدہ" بتانے والے، اور ان باتوں کو زیادہ اہمیت دینے والے، یہ بھی نہیں سوچتے، کہ اس مقصد کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہر ملک کے خواص اور نمائندے اور اہل الرائے حضرات کو بلایا جاتا، کم از کم ان کے جمع ہونے پر خاص زور دیا جاتا، حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ ہر اُس مسلمان پر حج فرض کیا گیا ہے جو وہاں پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو، اور عمر میں صرف ایک دفعہ فرض کیا گیا ہے، پھر غور کرنے کی بات ہے کہ احرام، طواف، سعی (یعنی صفا مروہ کے پھیرے) قربانی، مکہ سے منیٰ جانا، منیٰ سے عرفات دوڑنا، عرفات سے رات کو چل کر مزدلفہ آنا، وہاں سے پھر منیٰ، اور منیٰ سے پھر مکہ بھاگنا، اور پھر مکہ سے منیٰ واپس جانا، اور پھر وہاں ٹھہر کر روزانہ رمی جمار کرنا، آخر دیوانوں کے سے اِن اعمال، اور اِس مجنونانہ دوڑ بھاگ سے، اور "عالِم اسلامی کی کانفرنس" والے مقصد سے کیا ربط اور جوڑ ہے [۱]۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ حج سے یہ فائدہ اُٹھایا نہیں جا سکتا، یا ایسا کوئی فائدہ اُٹھانا نہیں چاہئے، بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حج وغیرہ عبادات کا موضوع یہ نہیں ہے اور جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں اور اس طرح سوچتے ہیں اُن کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے عبادات کی حقیقت اور اس کے اصل مقصد اور موضوع کو نہیں سمجھا ہے، عبادت کا اصل مقصد اور اس کی اصل غایت وہ ہے جس کا تعلق اس عالمِ محسوسات سے نہیں ہے، لیکن ان لوگوں کی نظروں میں چونکہ عالمِ محسوسات ہی کی وقعت اور اہمیت زیادہ ہے، اور ان کے ذہنوں کا رُخ چونکہ اس مادی عالم ہی کی طرف ہے، اس لئے یہ بیچارے عبادات کا مقصد اور اس کے خاص فائدے بھی اسی میں ڈھونڈتے ہیں، اور جو کچھ سمجھ میں آتا ہے، وہ کہتے ہیں۔ ان باتوں

[۱] حج کا اصل مقصد یہ ہے کہ اللہ کے حکم کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کے حقیقی حج کے ساتھ تشبہ اختیار کر کے اُن کے جذبۂ عبدیت اور کمالِ فدویت و فدائیت کو یاد کیا جائے، اور ان کی اس مبارک عشقی نسبت سے اور اس کی برکات سے حصہ لینے کی کوشش کی جائے، حج کے تمام اعمال سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔۱۲

سے ''عبادات'' کی امتیازی اہمیت بالکل ختم ہو جاتی ہے اور پھر وہ معمولی مقاصد کی معمولی تدبیریں رہ جاتی ہیں۔

ہاں! ہمیں اس سے انکار نہیں کہ عبادات سے بہت سے ایسے فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں جن کا تعلق اسی عالمِ محسوسات سے ہے، لیکن وہ عبادات کا مقصد اور غایت نہیں ہیں، بلکہ ان کو منافع اور زیادہ سے زیادہ برکات کہا جاسکتا ہے۔

بہر حال عبادات کا اصل مقصد و موضوع صرف معبود برحق کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنا اور اپنے کو پاک کرنا اور اپنے رُوحانی اور ملکوتی پہلو کو نشو و نما دینا ہے، اور انسانوں کے تمام اعمال میں محض عبادات ہی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کا تعلق صرف معبود سے ہے۔ اور کسی اور کا اس میں کوئی حصّہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ کوئی عبادت کسی نیت سے اور کسی پہلو سے بھی غیر اللہ کے لئے نہیں کی جاسکتی اور اگر کوئی کرے گا تو وہ مشرک ہو جائے گا، دوسرے کسی عمل کی یہ شان نہیں ہے۔

اور عبادت کے شعبے کی اسی اہمیت اور نزاکت کی وجہ سے دوسرے تمام شعبوں سے زیادہ اس میں پابندیاں لگائی گئی ہیں، اور اس کے احکام زیادہ تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں جو چیز جتنی اعلیٰ اور جتنی قیمتی اور جتنی نازک ہوتی ہے اُس کا قانون بھی اتنا ہی سخت ہوتا ہے۔

## ارکانِ اربعہ

یہاں تک تو عبادات کے متعلق عمومی اور اصولی باتیں کی گئی ہیں، اب خاص طور سے عباداتِ اربعہ (نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج) کے متعلق الگ الگ کچھ کہنا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ان کو اسلام کا رکن قرار دیا گیا ہے، اور دین میں ان کی غیر معمولی اہمیت ہے، گویا یہی وہ بنیادی ستون ہیں جن پر دین کی پوری عمارت قائم ہوتی ہے۔

## نماز اور اُس کی خاص اہمیت

پھر اِن میں نماز سب سے اہم اور افضل ہے، اور اِس کی وجہ ظاہر ہے، آپ جانتے ہیں کہ ہر چیز کی قدر و قیمت اُس کے مقصد کے لحاظ سے ہوتی ہے، مثلاً موٹر کی قیمت اس کی

خوبصورتی اور اس کے رنگ کے اعتبار سے نہیں لگتی، بلکہ موٹر جس مقصد کے لئے لیا جاتا ہے جو موٹر اس مقصد کے لحاظ سے جتنا بڑھیا ہوگا اتنی ہی اُس کی قیمت زیادہ ہوگی، اسی طرح مثلاً بھینس کی قیمت اُس کی خوبصورتی یا اُس کی چال کے حساب سے نہیں لگائی جائے گی، بلکہ دودھ کے حساب سے لگائی جائے گی، یعنی جو بھینس جس قدر زیادہ دودھ دے گی وہ اتنی ہی بڑھیا اور قیمتی سمجھی جائے گی۔ بس اسی طرح سمجھئے کہ عبادت کا جو مقصد اور فائدہ ہے (یعنی اللہ کا قرب حاصل کرنا، اور روحانی اور ملکوتی پہلو کو نشو و نما دینا، اور ملاء اعلیٰ سے ربط اور مناسبت پیدا کرنا) چونکہ نماز اس صفت میں دوسری تمام عبادات سے بڑھی ہوئی ہے، اس لئے وہی سب سے اہم اور افضل ہے، اور اسی لئے اس کی شرطیں سخت ہیں، مثلاً جسم کا پاک ہونا، کپڑوں کا پاک ہونا، زمین کا پاک ہونا، وضو سے ہونا وغیرہ وغیرہ۔ آپ حضرات جانتے ہیں کہ جتنا اہتمام نماز کے لئے کرنا پڑتا ہے، اتنا کسی عبادت کے لئے کرنا نہیں پڑتا۔

## نماز کا تعلق اللہ کی صفتِ حاکمیت سے بھی ہے اور محبوبیت سے بھی

نماز کی اہمیت کو ایک اور طریقہ سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ بعض عبادات وہ ہیں جن کا خاص تعلق اللہ تعالیٰ کی صفتِ حاکمیت اور مالکیت سے ہے، یعنی بندہ اپنے اس عمل سے اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے مالک اور حاکم ہیں، اور میں ان کا عبد اور مملوک ہوں مثلاً زکوٰۃ خاص طور سے اسی پہلو کو ظاہر کرتی ہے۔ اور بعض عبادات وہ ہیں جن کا خصوصی تعلق اللہ تعالیٰ کی صفتِ محبوبیت سے ہے، یعنی اُن کے ذریعہ اس کا اظہار ہوتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کا طالب ہے، اور وہ اس سے محبت اور فدائیت کا تعلق رکھتا ہے، اور اُس کی روح اور اُس کا دل اس سے وابستہ ہے، مثلاً روزہ سے اسی پہلو کا اظہار ہوتا ہے، اس میں عاشقوں کی طرح کھانا پینا چھوڑ دیا جاتا ہے، اور حج تو سراسر عشق و محبت کی شوریدگی اور دیوانگی کی تصویر ہے، عاشقوں کا سا لباس، محبت کے دیوانوں کی سی حرکتیں، دل میں کسی کا خیال لے کر کعبہ کے گرد گھومنا، اُس کے ایک گوشے میں لگے ہوئے ایک پتھر کو بار بار چومنا، جنگلوں میں نکل جانا،

راتوں کو اور دنوں کو وہاں پڑا رہنا، یہ سب چیزیں عشق و محبت کی سرمستی کو ظاہر کرتی ہیں، اور گویا یہی حج کی رُوح ہے۔

لیکن نماز ان دونوں پہلوؤں کو جامع ہے، ادب اور سکون و وقار کے ساتھ دربار میں حاضر ہونا، غلاموں اور چاکروں کی طرح صف باندھ کے نگاہیں نیچی کر کے دست بستہ کھڑا ہو جانا، ایک نظام کے ساتھ اس کے سارے ارکان ادا کرنا۔ ان چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی مالکیت اور حاکمیت اور بندہ کی عبدیت و مملوکیت کا پورا پورا اظہار ہوتا ہے، لیکن نماز میں بندہ کے باطن کی اور دل کی جو حالت ہونی چاہئے، اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی خاص صفتِ محبوبیت سے ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد:۔

قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ

نماز میں میرے آنکھ کی ٹھنڈک کا سامان ہے

اور نماز کا وقت آجانے پر حضرت بلالؓ سے آپ کا فرمانا:۔

اَرِحْنِيْ يَابِلَالُ

بلال! نماز کا بندوبست کر کے ہمارے بے چین دل کی راحت، اور ہمارے دردِ دل کی دَوا کا انتظام کرو۔

یہ اسی حقیقت کا اظہار ہے۔

حضرت مجدّدِ الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

''نماز است کہ راحت دہ بیماران است ''ارحنی یا بلال'' رمزیست ازیں ماجراؤ'' قرۃ عینی فی الصّلوٰۃ'' اشارۂ ایست بایں متمنا''۔

حضرت مجدّدؒ کے ایک خلیفہ خواجہ عبد الواحد لاہوری کے متعلق نقل کیا جاتا ہے، کہ ایک دن فرمایا:۔ ''کیا جنت میں نماز ہوگی؟''۔

کسی نے عرض کیا کہ:۔ حضرت! جنت دار العمل تو ہے نہیں، وہ تو دار الجزاء ہے، پھر وہاں نماز کیوں ہونے لگی۔ یہ سُن کر بڑے درد کے ساتھ روتے ہوئے فرمایا:۔

''پھر بغیر نماز کے وہاں کیسے گذرے گی!''

اللہ کے جن بندوں کی نمازیں حقیقی نمازیں ہیں، اُن کو نماز میں جو لذّت اور کیفیت ملتی ہے، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ایک جگہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"رتبۂ نماز دررنگ رتبۂ رویت است درآخرت، نہایت قرب دردنیا درنمازست، ونہایت قرب درآخرت درحین رویت"۔

بہرحال عبادات میں نماز ہی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی صفتِ حاکمیت و مالکیت سے بھی پورا پورا ہے، اور اس کی صفتِ محبوبیت سے بھی، اس کا قالب بندہ کی عبدیت اور مملوکیت کی نہایت مکمل اور نہایت حسین تصویر ہے، اور اس کی رُوح میں عشق کی لذّت اور محبت کا سوز و گداز بھرا ہوا ہے، ان دونوں پہلوؤں کی یہ کامل جامعیت صرف نماز ہی میں پائی جاتی ہے، اور یہ بھی تمام عبادات سے اُس کے افضل اور اہم ہونے کی ایک وجہ ہے۔

## نماز ایمان کا خارجی وجود ہے

نماز کی اہمیت اور امتیاز کے سلسلہ میں ایک بات اس ناچیز کے ذہن میں یہ بھی آتی ہے، کہ نماز ظاہری اور تفصیلی ایمان ہے، اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ ایمان تو دراصل ایک باطنی حقیقت ہے، اور دل کا ایک معاملہ ہے، لیکن اس کا وجود نماز سے ظاہر ہوتا ہے، اور نماز گویا ایمان کا ایک محسوس پیکر ہے، یا یوں کہہ لیجئے کہ نماز، ایمان ہی کی اندرونی کیفیت کا خارج میں ایک محسوس اور مُتشکّل وجود ہے۔ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ اُن کا ایک باطنی وجود ہوتا ہے اور ایک ظاہری، پس ایمان کا ایک وجود تو باطنی ہے، اور وہ انسان کے دل کی ایک خاص کیفیت ہے، اور اسی کا ایک وجود ظاہری ہے اور وہ نماز ہے۔ میرا خیال ہے کہ قرآن مجید میں بعض مقامات پر نماز کو اسی واسطے ایمان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ اِيْمَانَكُمْ کے متعلق مفسّرین عموماً یہی فرماتے ہیں، کہ یہاں نماز ہی کو ایمان کہا گیا ہے۔ اس آیت کا شانِ نزول یہ بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک عرصہ تک بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نمازیں پڑھتے رہے، اُس کے بعد آپ کو حکم ہوا کہ کعبۃ اللہ کو قبلہ بنائیں، اور اُس کی جانب رُخ کرکے نماز پڑھا کریں۔ چنانچہ پھر اسی پر عمل ہونے لگا۔ بعض

لوگوں کے دل میں یہ خلش تھی کہ اب تک بیت المقدس کی طرف جونمازیں پڑھی گئیں اُن کا کیا ہوگا، کیا وہ سب ضائع جائیں گی؟ یہ آیت "مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُضِیۡعَ اِیۡمَانَکُمۡ" ۔(یہ نہیں ہوسکتا کہ اللہ تمھارے ایمان کو ضائع کرے) کہا جاتا ہے کہ اسی موقع پر نازل ہوئی، اوراس کے ذریعہ تسلی دی گئی کہ تمھاری پہلی نمازیں بھی ہرگز ضائع نہیں جائیں گی، بلکہ وہ اللہ کے یہاں قبول ہوچکی ہیں۔ الغرض اس آیت میں نماز کو ایمان فرمایا گیا ہے۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہی ہے کہ نماز اندرونی ایمانی حقیقت کا ظاہری اور خارجی وجود ہے۔

اور میرا خیال ہے کہ ایمان اور نماز کے اسی خاص تعلق کی وجہ سے ترکِ نماز کو بعض حدیثوں میں کفر کہا گیا ہے، اور ان ہی احادیث کی بنا پر بعض ائمہ کا یہ فتویٰ ہے کہ عمداً نماز ترک کرنے سے آدمی اسلام سے بالکل نکل جاتا ہے۔ یہ حضرات ترکِ نماز کو دوسرے فرائض کے ترک اور دوسرے کبیرہ گناہوں جیسا گناہ قرار نہیں دیتے، بلکہ اُن کے نزدیک ترک نماز سجدۂ صنم اور سجدۂ صلیب کی قسم کا ایسا عمل ہے جو اپنی ذات کے لحاظ سے منافیِ ایمان ہے، یعنی جس طرح بُت کے سامنے یا صلیب کے سامنے سجدہ کرنا ایک ایسا کافرانہ عمل ہے، کہ اگر بالفرض کفر کے عقیدے کے ساتھ نہ بھی ہو، تب بھی وہ کفر ہے، اسی طرح ان ائمہ کے نزدیک نماز نہ پڑھنا بھی اسی قسم کا کافرانہ عمل ہے۔

الغرض نماز کا ایمان سے ایک ایسا خاص تعلق ہے جو دوسری عبادات اور دوسرے فرائض اور ارکان کا نہیں ہے، اوراس بناء پر بھی دوسری تمام عبادات کے مقابلہ میں نماز کو خاص اہمیت اور امتیاز حاصل ہے۔

## نماز زندگی کے تمام شعبوں پر اثر ڈالتی ہے

ایک خصوصیت نماز کی یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کے سب شعبوں پر اپنا اثر ڈالتی ہے، اور پوری زندگی کو اللہ کی یاددالی اوراس کی طاعت والی زندگی بناتی ہے، بشرطیکہ حقیقی نماز ہو، نماز میں یہ تاثیر بدرجۂ اتم موجود ہے۔

بعض حدیثوں میں آتا ہے کہ کچھ لوگوں کے اعمال کی جانچ آخرت میں اسی طرح ہوگی کہ اُن کی صرف نمازوں کو دیکھ لیا جائے گا، اگر وہ درست اور ٹھیک ہونگی، تو پوری زندگی

کو درست قرار دے دیا جائے گا، اور اگر اُن میں نقص اور خرابی ہوگی تو ساری زندگی ناقص اور خراب قرار دے دی جائے گی، اس کا راز یہی ہے کہ نماز اگر واقعی نماز ہو، تو وہ پوری زندگی کو پاک صاف بنا دیتی ہے۔ دوسری عبادات سے نماز کے افضل اور اہم ہونے کی یہ بھی ایک وجہ ہے۔

## اپنی نمازوں کی تکمیل اور ترقی کی ضرورت

نماز کے متعلق راقم سطور کو آخری اور عملی بات آپ حضرات سے اپنی نمازوں کی اصلاح اور ترقی سے متعلق کہنی ہے، اللہ کا شکر ہے کہ ہم سب نماز کی اہمیت کو کچھ سمجھتے ہیں، اور نمازیں پڑھتے ہیں، لیکن ہم میں سے اکثر اپنی نمازوں کی موجودہ سطح پر بالکل قانع ہیں، اور انھیں اپنی نمازوں کے بہتر بنانے کی کوئی فکر نہیں ہے، یہ بڑے خسارے کی بات ہے۔ ابھی ابھی حضرت مجددؒ کا قول گذر چکا ہے کہ۔

"نماز کا دنیا میں وہ مقام ہے جو آخرت میں دیدارِ الٰہی کا ہے"

اب آپ خود ہی سمجھ لیجئے کہ اپنی نمازوں کو بہتر بنانے اور ترقی دینے کی ہمیں کتنی فکر اور کوشش کرنی چاہئے۔

نماز میں ترقی اور تکمیل کی بے انتہا گنجائش ہے۔ جو بہتر سے بہتر اور اچھی سے اچھی نماز دنیا میں پڑھی جاتی ہے، اگر کوشش جاری رکھی جائے تو اس میں بھی ہزاروں درجہ اور ترقی ہو سکتی ہے۔

## اس کی چند اصولی تدبیریں

ناچیز اس سلسلہ میں چند اصولی تدبیریں عرض کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اُن سے آپ کو فائدہ پہنچائے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ نماز کے ضروری مسائل اگر نہیں سیکھے ہیں تو سیکھے جائیں، اور مقررہ شرائط کے مطابق خشوع خضوع کے ساتھ صحیح نماز ادا کرنے کا ہمیشہ اہتمام رکھا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر سمجھ کر اور اس کا پورا دھیان رکھ کر نماز

پڑھنے کی عادت ڈالی جائے، اور اس بارے میں اپنی پوری ہمّت اور فکر سے کام لیا جائے۔ یعنی اپنے امکان کی حد تک اس کی پوری کوشش کی جائے کہ نماز ایسی ہو جیسی کہ اُس وقت ہوتی، جب اللہ تعالیٰ اپنے پورے جلال و جمال کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتے، اور وہ ہمیں نماز ادا کرنے کا حکم دیتے، اور اُس وقت ہم اُن کے سامنے کھڑے ہو کر ادا کرتے۔ اگر چہ یہ بات ہمارے آپ کے لئے آسان نہیں ہے، بہت مشکل ہے، لیکن اپنی حد تک اس کی کوشش پوری کرنی چاہئے، انشاء اللہ کوشش کرنے سے بہت کچھ فرق ہو جائے گا۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ جب نماز کے لئے کھڑے ہونے لگیں تو یہ مراقبہ کر لیا کریں، یعنی یہ سوچ لیا کریں کہ اللہ تعالیٰ حاضر ناظر ہیں، میں اگر چہ نہیں دیکھ سکتا، لیکن وہ مجھے دیکھ رہے ہیں، اور میں ان کے حضور میں نماز ادا کر رہا ہوں۔ پھر پوری نماز میں، قیام میں، قعود میں، رکوع میں، سجود میں، یہی دھیان اور خیال رہے۔ اگر اس کیفیت کا ذرّہ بھی نصیب ہو جائے تو بہت ہے۔

## نماز سمجھ کر پڑھی جائے

تیسری بات یہ ہے کہ نماز میں جن چیزوں کا پڑھنا بالکل مقرر ہے، مثلاً ثناء سورۂ فاتحہ، رکوع، سجدہ کی تسبیحات، تشہد یعنی التحیات، درود شریف وغیرہ، کم از کم ان کا مطلب تو ضرور ایسا یاد کر لیا جائے کہ ان چیزوں کے پڑھتے وقت آپ کو دھیان رہے کہ ان لفظوں میں آپ اپنے مالک و معبود سے کیا عرض کر رہے ہیں، تاکہ آپ کے دل کی کیفیت بھی اس کے مطابق رہے، اس سے حضورِ قلب میں بھی بڑی مدد ملتی ہے۔

جو لوگ بے سمجھے بوجھے نمازیں پڑھتے ہیں اُن سے فرض تو ضرور ادا ہو جاتا ہے، لیکن اُن کی وہ نمازیں بڑی گھٹیا درجہ کی نمازیں ہیں، اور اُن سے اُن کی نمازوں کو شکایت ہو گی کہ انھوں نے اُن کی طرف سے ایسی بے توجہی برتی۔

## اس بارے میں بعض لوگوں کا غلو

آج کل کے پڑھے لکھے بعض مسلمان اِس بارے میں بڑا غلو اور بڑی زیادتی

کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جو لوگ عربی نہیں جانتے اور معنی مطلب سمجھے بغیر نمازیں پڑھتے ہیں (جیسا کہ عام مسلمانوں کا حال ہے) اُن کی نمازیں بالکل فضول ہیں، اور وہ سرے سے ادا ہی نہیں ہوتیں۔ یہ خیال قطعاً غلط ہے، اور اس میں سخت غلو ہے۔ اگر نماز کا مقصد صرف اتنا ہی ہوتا کہ جو کچھ اس میں پڑھا جاتا ہے اس کو سمجھا جائے، تو بیشک ایسے لوگوں کی نمازیں بالکل فضول ہوتیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ نماز سے بہت سی چیزیں مطلوب ہیں۔ مثلاً:۔ وقت آجانے پر اور نماز کی پکار بلند ہونے پر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اللہ کے حضور میں حاضر ہو جانا، اللہ کے حکم کے مطابق اپنے کو پاک کر کے سب طرف سے رُخ پھیر کے اللہ کی طرف اپنا رُخ کر لینا، اپنے آپ کو ایک عاجز بندے کی حیثیت سے اُس کے سامنے پیش کر دینا، اُس کی بارگاہ میں ادب اور تعظیم کے ساتھ دست بستہ کھڑا ہو جانا، جھک کر اور خاک پر پیشانی رکھ کر اپنی بندگی اور نیازمندی کا اظہار کرنا، جس حال میں جو کچھ پڑھنے کا حکم ہے اُس کو پڑھنا۔ پس چونکہ عام نمازی مسلمان جو بیچارے معنی مطلب سمجھے بغیر نمازیں پڑھتے ہیں اُن کی نمازوں سے یہ مقاصد پورے ہو جاتے ہیں، اس لئے اُن کی نمازیں ادا تو یقیناً ہو جاتی ہیں، لیکن اِس میں شبہ نہیں، کہ معنی مطلب سمجھنے کا جو خاص نور ہے، اُن کی نمازیں اس سے خالی رہتی ہیں، اور یہ بہت بڑا گھاٹا اور بہت بڑی محرومی ہے، اِس لئے اِس میں بے پروائی ہرگز نہیں کرنی چاہئے، جس طرح اِس دنیا کی اپنی چیزوں کے متعلق ہمارا جی چاہتا ہے کہ وہ بہتر سے بہتر اور حسین و جمیل ہوں، اسی طرح، بلکہ اس سے بھی زیادہ اپنی نمازوں کے متعلق ہمیں کوشش کرنا چاہئے کہ وہ حسین و جمیل اور نورانی ہوں۔

بہر حال اِس طرف ہمیں توجہ کرنی چاہئے، اور دوسرے اپنے بھائیوں کو بھی اِس کی ترغیب دینی چاہئے، اور اُنھیں بتلانا چاہئے کہ بہت تھوڑی سی محنت اور معمولی توجہ سے نماز کے مقررہ اذکار کا مطلب یاد کیا جا سکتا ہے، اور اِس سے اُن کی نمازوں میں بہت ترقی ہو سکتی ہے، انشاء اللہ ایسا کرنے سے خارجی خیالات بھی کم آئیں گے۔

## نماز میں خیالات آنے کی شکایت

جب ذکر آ گیا ہے تو نماز میں خطرات و خیالات آنے کے متعلق بھی کچھ عرض

کیا جاتا ہے:۔

اکثر حضرات اِس کی شکایت کرتے ہیں، اور اِس کی وجہ سے بہت شکستہ دل ہوتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اِن سے نماز خراب ہو جاتی ہے، خوامخواہ ایسے وہموں میں نہیں پڑنا چاہئے۔ اپنی طرف سے اِس کی فکر اور کوشش تو ضرور کرنی چاہئے کہ نماز میں بیرونی خیالات نہ آئیں، لیکن اس کے باوجود جو خیالات آپ سے آپ دل میں آجاتے ہیں، جن کو ہم اپنے ارادہ اور اختیار سے نہیں لاتے، اُن سے ہرگز نماز خراب نہیں ہوتی، اور یہ کوئی پریشان ہونے کی بات نہیں ہے، تاہم اِس کی فکر اور کوشش جاری رکھنی چاہئے، کہ نماز میں ایسے خیالات نہ آئیں، اور سمجھ کے نماز پڑھنے سے، اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضری کا دھیان رکھنے سے اِن خیالات میں بہت کمی ہو جاتی ہے۔

نماز کی تکمیل اور ترقی کے سلسلہ کی آخری بات یہ ہے کہ اللہ کے ایسے بندوں کے پاس رہا جائے، اور اُن کی نمازوں کو دیکھا جائے، جن کی نمازیں اللہ کے فضل سے کامل ہیں، کم از کم ہماری نمازوں کے اعتبار سے کامل ہیں، اور جب یہ میسّر نہ ہو، ایسی کتابیں ہی دیکھی جائیں، جن کے دیکھنے سے ہمیں اپنی نمازوں کو بہتر بنانے کا شوق پیدا ہو، اور اِس معاملہ میں رہنمائی حاصل ہو سکے۔ جیسے کہ امام غزالیؒ کی ''کیمیائے سعادت'' وغیرہ۔ ''نماز کی حقیقت'' کے نام سے اس عاجز کا بھی ایک رسالہ ہے، اس میں بھی حضرات بزرگانِ دین کی ایسی چیزیں اس عاجز نے خاص اہتمام سے نقل کی ہیں جن سے نماز کی ترقی اور تکمیل کا شوق اور اہتمام پیدا ہو، اور اس سلسلہ میں رہنمائی بھی حاصل ہو۔ اور چونکہ اُس کے وہ خاص مضامین میرے اپنے نہیں ہیں، بلکہ میں نے اُن کو عربی یا فارسی کتابوں سے صرف اُردو میں منتقل کر دینے کا کام کیا ہے، اور صاف لفظوں میں اس حقیقت کا وہیں اظہار بھی کر دیا ہے اِس لئے اِس کے اظہار میں، میں کوئی حجاب اور شرم محسوس نہیں کرتا، کہ جب کبھی میں خود بھی اپنی ہی لکھی ہوئی اِس کتاب کو دیکھتا ہوں تو الحمد للہ ہر دفعہ اپنی نماز کو بہتر بنانے کا شوق اُس کے مطالعہ سے پیدا ہوتا ہے، اور مجھے نفع ہوتا ہے۔ میں نے یہاں یہ بات اس لالچ میں لکھ دی ہے کہ شاید اس سے آپ کو بھی اُس کے مطالعہ کا شوق ہو، اور آپ کی نمازوں

میں اس سے کوئی ترقی ہو، اور پھر "الدال علی الخیر کفاعلہ" کے اصول پر مجھے بھی اُس کے اجر میں کوئی حصہ مل سکے۔

## نماز کو بہتر بنانے کی ایک نبویؐ تدبیر

نماز کو بہتر بنانے اور ترقی دینے کے لئے رسُول اللہ ﷺ کی اس سلسلہ کی ایک نصیحت انشاء اللہ بہت نفع مند ثابت ہوگی، اُس پر عمل کرنا بھی زیادہ مشکل نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک صحابیؓ کو نصیحت فرمائی تھی:۔

"اِذَا قُمْتَ فِیْ صَلٰوتِکَ فَصَلِّ صَلٰوۃَ مُوَدِّعٍ"۔(مشکوٰۃ، کتاب الرقاق)

مطلب یہ ہے کہ جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو الوداع کہنے والے کی سی نماز پڑھو، یعنی جو شخص اس دنیا کو اور دنیوی زندگی کو الوداع کہنے والا ہو، اور ہمیشہ کے لئے سب سے رخصت ہونے والا ہو، اُس کی نماز جیسی ہونی چاہئے، تم ویسی نماز پڑھا کرو۔ جس کی عملی صورت یہ ہے کہ جب ہم نماز کے لئے کھڑے ہونے لگیں تو یہ خیال کریں کہ کیا خبر ہے شاید یہی ہماری آخری نماز ہو، اور اِس کے بعد کوئی اور نماز ادا کرنے کا مجھے موقع نہ ملے، بس یہ خیال کر کے اور اچھی طرح اس کا مراقبہ اور دھیان کر کے اپنی نماز کو ظاہر اور باطن کے لحاظ سے بہتر سے بہتر ادا کرنے کی کوشش کریں، انشاء اللہ اس تدبیر سے بے حد نفع ہوگا، اور نماز میں جان آجائے گی۔

نماز کی تکمیل و ترقی اور اس کی تدابیر کے بارے میں جو کچھ عرض کرنا تھا، وہ عرض کیا جا چکا، اب نماز ہی کے سلسلہ میں ایک اور بات عرض کرنی ہے:۔

## نوافل

فرض تو روزانہ صرف پانچ نمازیں ہیں، اُن کے علاوہ کچھ سنتیں ہیں اور کچھ نوافل ہیں، اور توفیق کے مطابق فرضوں سے آگے پیچھے والی سنتیں اور اُن کے ساتھ کے نوافل بھی الحمدللہ ہم آپ اکثر پڑھ لیتے ہیں۔ لیکن اِن کے علاوہ جو نوافل ہیں جیسے تہجد، اشراق، اوّابین، جن کی رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام کو ترغیب دیتے تھے، اور خود بھی پڑھا کرتے تھے، اور آپ

نے اُن کے بڑے بڑے فضائل بیان فرمائے ہیں، اُن کی توفیق ہم کو بہت کم ہوتی ہے۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جن بندوں پر یہ فضل فرمایا ہے کہ اس زمانہ میں اُن کو دین سے ایک درجہ کا تعلق بخشا ہے، اُنھیں چاہئے کہ وہ اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر پہچانیں، اور اس کا شکر ادا کریں، اور اس کا خاص شکر یہی ہے کہ اُس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں، اور کم از کم خاص خاص اوقات کے یہ نوافل پڑھ لیا کریں، اس میں وقت بہت کم صرف ہوتا ہے، اور ثواب بہت زیادہ بتلایا گیا ہے۔ بالخصوص تہجد کی عادت ضرور ڈالنی چاہئے۔

## تہجد کی غیر معمولی اہمیت اور اُس کی خاص برکات

قرآن مجید سے اور رسول اللہ ﷺ کے طرزِ عمل سے بھی تمام غیر فرض نمازوں میں تہجد کی خاص فضیلت اور اہمیت معلوم ہوتی ہے، سورۂ مزّمّل میں جس طرح تہجد کا ذکر کیا گیا ہے، اُس سے اِس ناچیز کی سمجھ میں یہ آتا ہے، کہ تہجد اپنی عظمت اور برکات کے لحاظ سے فرض ہونا چاہئے تھا، لیکن اُمّت کی آسانی کیلئے اس میں رخصت دے دی گئی ہے۔ بلکہ اکثر علماء کی تحقیق یہ ہے کہ تہجد شروع میں فرض ہی تھا، سُورۂ مزّمّل کے دوسرے رکوع کی آیتیں جب نازل ہوئی ہیں اُس وقت اُمّت کی سہولت کے لئے رخصت دی گئی، اور اس کی فرضیت اُٹھالی گئی، اور اُس کو سنّت قرار دے دیا گیا۔ لیکن اپنی بعض خصوصیات اور انوار کے لحاظ سے وہ دوسری سب نمازوں میں ممتاز ہے۔ تہجد ہی وہ نماز ہے جس میں حضور ﷺ کے پاؤں پر ورم آجاتا تھا، اور اس کے باوجود آپ پڑھتے تھے۔ اور تہجد ہی کا وقت وہ وقت ہے جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے اطلاع دی ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی وہ خاص عنایتیں متوجہ ہوتی ہیں جو دوسرے اوقات میں نہیں ہوتیں۔ آپ اسی وجہ سے تہجد کے لئے ازواج مطہرات کو بھی اُٹھادیتے تھے۔ اسی طرح صحابۂ کرام کو تہجد کی خاص تاکید فرماتے تھے۔

چنانچہ ایک حدیث میں ہے، آپ نے ارشاد فرمایا:۔

"عَلَيْكُمْ بِقِيَامِ اللَّيْلِ فَإِنَّهُ دَابُ الصّٰلِحِيْنَ قَبْلَكُمْ وَهُوَ قُرْبَةٌ لَكُمْ اِلٰى رَبِّكُمْ وَمَكْفَرَةٌ لِلسَّيِّئَاتِ وَمَنْهَاةٌ عَنِ الْاِثْمِ ۔"

(رواہ الترمذی عن ابی امامۃ ۔ مشکوٰۃ باب التحریض علیٰ صلوٰۃ اللیل)

مطلب یہ ہے کہ تم تہجد کو لازم پکڑ لو، کیونکہ وہ تم سے پہلے اللہ کے صالح بندوں کا دستور العمل رہا ہے، اور تم کو تمھارے رب سے وہ قریب کرنے والا ہے، اور تمھارے گناہوں کے لئے کفارہ بننے والا ہے، اور تم کو گناہوں سے روکنے والا ہے"۔

اور ظاہر بات ہے کہ حضور ﷺ کے اس قسم کے دینی احکام صرف صحابۂ کرامؓ کے لئے نہیں تھے، بلکہ ان ارشادات کے مخاطب قیامت تک کے سب مسلمان ہیں۔ ہمیں محسوس کرنا چاہئے، کہ گویا آنحضرت ﷺ براہِ راست ہم کو ارشاد فرما رہے ہیں، اور آپ نے اس حدیث میں تہجد کی جو برکات اور اُس کے جو خواص بیان فرمائے ہیں اُن پر پورا یقین کر کے ہمیں اُس پر عمل کرنا چاہئے۔

تہجد کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے بھی ہوتا ہے جس میں حضور ﷺ نے اس کی ترغیب دی ہے، کہ:۔ گھر میں اگر مرد تہجد کے لئے پہلے اُٹھے تو بیوی کو بھی اُٹھانے کی کوشش کرے، یہاں تک کہ اگر وہ نہ اُٹھے تو اُس کے مُنھ پہ پانی کا ہلکا سا چھینٹا دے کے اُس کو بیدار کرنے کی کوشش کرے، اور اسی طرح اگر گھر کی بیوی پہلے اُٹھ جائے تو وہ اپنے شوہر کو اُٹھانے کی کوشش کرے، اور اگر ضرورت پڑے تو اسی طرح وہ بھی جگانے کیلئے پانی کا ہلکا سا چھینٹا اُس کے مُنھ پہ مارے [1]۔ حضور ﷺ نے ایسا کرنے والے شوہروں اور بیویوں کو بڑی پیاری دُعا دی ہے۔ اسی حدیث میں ارشاد ہے:۔

رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلًا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ"———— اور

"رَحِمَ اللّٰهُ امْرَأَةً قَامَتْ مِنَ اللَّيْلِ"

یعنی ایسا کرنے والے مردوں پر اور ایسا کرنے والی بیویوں پر خدا کی خاص رحمت ہو۔

اور ایک دوسری روایت میں "رَحِمَ اللّٰه" کی جگہ "نَضَّرَ اللّٰه" کا لفظ آیا ہے جس کا

---

[1] یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ یہ حکم اُن میاں بیویوں کو ہے جن میں دینی ذوق ہو اور ایسا کرنے سے آپس میں ناراضی اور اختلاف پڑنے کا اندیشہ نہ ہو، جن گھروں میں دینی ذوق ہوگا، وہاں ایسا کرنے سے محبت بڑھے گی۔
یہ حدیث مشکوٰۃ میں ابوداؤد اور نسائی کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے۔ ۱۲

مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ایسے شوہروں اور ایسی بیویوں کو تازہ اور شاداب رکھے۔

فرض نمازوں کے علاوہ کسی سنت یا نفل کے لئے حضورؐ نے ایسی ترغیب نہیں دی جب اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تہجد غیر فرض نمازوں میں سب سے زیادہ اہم اور افضل ہے۔ بلکہ ایک حدیث کے تو صاف الفاظ یہ ہیں:۔

"افضل الصلوٰۃ بعد الفریضۃ صلوٰۃ اللیل[1]"۔

یعنی فرض کے بعد سب نمازوں میں افضل تہجد ہے

لیکن چونکہ اُس وقت کا اُٹھنا نفس کے لئے تکلیف دہ ہوتا ہے، اس لئے بہت سے وہ حضرات بھی جن کو الحمد للہ دین سے اچھا خاصا تعلق ہے وہ بھی تہجد کے لئے نہیں اُٹھتے۔ حالانکہ تہجد کی فضیلت اور اہمیت میں اس کو بھی دخل ہے کہ اُس وقت کے اُٹھنے میں نفس کو مشقت پڑتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں صاف فرمایا گیا ہے:۔

"اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ○"

اَشَدُّ وَطْاً کا مطلب یہی ہے کہ تہجد نفس کو خوب کچلنے والا اور روندے والا عمل ہے۔ بہر حال یہی تو اس کی فضیلت ہے، اور اسی سے تو اس کی خاص قیمت ہے۔

## تہجد کی ایک خاص تاثیر

قرآن شریف کے ایک اشارہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تہجد میں دین کے راستے کی طاقت پیدا کرنے کی بھی خاص تاثیر ہے۔ سورۂ مزمّل میں آنحضرت ﷺ کو یہ حکم دینے کے بعد کہ تم رات کے آدھے حصّے میں، یا اس سے کم، یا اس سے کچھ زیادہ تہجد پڑھا کرو۔ متصلاً فرمایا ہے:۔

"اِنَّا سَنُلْقِىْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا"

یعنی ہم تم پر ایک بہت بھاری بات کا بوجھ ڈالیں گے۔

گویا اشارہ فرمایا گیا ہے کہ تہجد اُس بوجھ کو اُٹھانے کے لئے تیار کرنے والی چیز بھی ہے، اور اس سے ایک خاص طاقت پیدا ہوتی ہے۔

---

[1] رواہ مسلم عن ابی ہریرۃ، مشکوٰۃ باب فی صیام التطوع ۱۲۔

تہجد کے سلسلہ میں ایک بات یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ صحابۂ کرامؓ میں تہجد عام طور سے طویل پڑھنے کا رَواج تھا، اور اُس کی وجہ یہ تھی کہ ہم لوگ جس طرح قرآن شریف مُصْحَف میں دیکھ کے تلاوت کرتے ہیں، یہ تلاوت تو اُن کے یہاں مروّج تھی نہیں، عام طور سے پورا قرآن مجید یا اُس کا کافی حصہ لوگوں کو حفظ ہوتا تھا، اور اس کو تہجد ہی میں عموماً پڑھا جاتا تھا، راقم سطور نے ایک روایت میں کہیں دیکھا تھا کہ ایک صحابی نے غالبًا اپنے لڑکے کی شکایت کی تھی کہ وہ رات کو تہجد میں قرآن پڑھنے کے بجائے دن کو پڑھتا ہے۔

بہرحال حضرات صحابۂ کرامؓ کے حالات سے جو لوگ کچھ بھی واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ حضرات تہجد میں بہت طویل قرأت فرماتے تھے، گویا تہجد ہی ان کی تلاوت کا وقت تھا۔

اللہ تعالیٰ توفیق دے تو ہمیں اِس کی بھی تقلید کرنی چاہیئے، ہم میں سے جن کو قرآن مجید کا کچھ زیادہ حصہ یاد ہے، وہ تہجد میں چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھ کر جلدی فارغ ہونے کی کوشش نہ کیا کریں۔ ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ وہ نماز ہے جس میں حضور کے پائے مُبارک پر وَرم آجاتا تھا۔

## آخرِ شب میں اللہ کا ذکر

نماز کے علاوہ ذکر و تلاوت کے لئے بھی وہ وقت سب سے بہتر ہے۔ ایک حدیث میں ہے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔

"اَقْرَبُ مَا يَكُوْنُ الرَّبُّ مِنَ الْعَبْدِ فِيْ جَوْفِ اللَّيْلِ الْاٰخِرِ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَكُوْنَ مِمَّنْ يَذْكُرُ اللّٰهَ فِيْ تِلْكَ السَّاعَةِ فَكُنْ ۔"[1]

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ سے سب سے زیادہ قریب رات کے آخری حصّے میں ہوتے ہیں، اس لئے اگر تم سے ہو سکے کہ اُس وقت تم اللہ کا ذکر کرنے والے بندوں میں ہو، تو ضرور ایسا کرو، اور وہ قیمتی وقت غفلت میں نہ گذارو۔

آخرِ شب کے ذکر کے متعلق یہ بات تو یہاں صرف ضمناً تہجد کی مناسبت سے ذکر کردی

---

[1] رواہ الترمذی عن عمرو بن عنبسۃ، مشکوٰۃ باب التحریض علی صلوٰۃ اللیل۔ ۱۲

گئی ہے، ورنہ دراصل نمازوں کی ترقی اور تکمیل کے سلسلہ میں کچھ عرض کیا جارہا تھا، اور اُسی سلسلے میں نوافل کا ذکر آ گیا تھا۔ پھر نوافل میں خاص کر تہجد کی ترغیب وتشویق کے لئے کچھ تفصیل سے عرض کرنا مناسب معلوم ہوا، اللہ تعالیٰ اس سے فائدہ اُٹھانے کی ہم سب کو توفیق دے۔

## چاشت کے نفل

مقررہ نوافل میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تہجد کے علاوہ چاشت کی بھی بڑی فضیلتیں اور برکتیں بیان فرمائی ہیں، اور اُمّت کو اس کی بھی بہت ترغیب دی ہے، کم از کم دو حدیثیں اس سلسلہ کی بھی پڑھ لیجئے:۔

ایک حدیث قدسی ہے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان فرمایا ہے) کہ ہر بندہ کو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، کہ:۔

"یَاابْنَ اٰدَمَ! اِکْفِنِیْ اَوَّلَ النَّھَارِ بِاَرْبَعِ رَکْعَاتٍ اَکْفِکَ بِھِنَّ اٰخِرَ یَوْمِکَ"[1]

اے فرزند آدم! تو بس اتنی ذمہ داری لے لے کہ دن کے شروع حصّے میں (یعنی صبح چاشت کے وقت) چار رکعت نماز میرے حضور میں ادا کیا کر، مین اُن کی وجہ سے دن کے ختم ہونے تک تیرے لئے کفایت کروں گا، یعنی تیری ضروریات کی کفالت کروں گا۔

ایک دوسری حدیث میں ہے، آپ نے ارشاد فرمایا:۔

"من حافظ علی شفعة الضُّحی غفرت له ذنوبه و ان کانت مثل زبد البحرة"[2]

جو بندہ چاشت کے وقت کی دو رکعتیں برابر ادا کیا کرے اُس کے گناہ بخشدیئے جائیں گے، اگرچہ سمندر کے جھاگ برابر کیوں نہ ہوں۔

پہلی حدیث میں چاشت کی چار رکعتوں کا ذکر تھا، اور اس دوسری حدیث میں

---

[1] رواہ احمد الموصلی عن عقبة بن عامر، والترمذی عن ابی ذر وابی الدرداء۔ کذا فی جمع الفوائد۔۱۲

[2] رواہ الترمذی عن ابی ہریرۃ۔ کذا فی جمع الفوائد۔۱۲

صرف دو کا ذکر کیا گیا ہے، چاشت ہی کے سلسلہ کی بعض دوسری حدیثوں میں چھ، آٹھ، اور بارہ رکعتوں کا ذکر بھی آیا ہے۔ بات یہ ہے کہ نوافل میں رکعات کے عدد کی فرضوں کی سی پابندی نہیں ہے، اگر کم سے کم صرف دو رکعتیں بھی کسی نے پڑھ لیں تو وقت کا نفل ادا ہو گیا، اور اگر زیادہ پڑھیں تو بندہ زیادہ اجر و ثواب کا مستحق ہوگا۔

دین کے اوّلین رُکن نماز کے بارے میں جو کچھ عرض کرنے کا ارادہ کیا گیا تھا وہ عرض کیا جا چکا، اور ضمناً نوافل کا بھی کچھ ذکر آ گیا، اب باقی ارکان زکوٰۃ، روزہ، حج کے متعلق عرض کرنا ہے۔

## زکوٰۃ

ارکان میں نماز کے بعد زکوٰۃ کا درجہ ہے، زکوٰۃ کا مقصد بھی دوسری عبادات کی طرح اللہ تعالیٰ کی رضا اور اپنے نفس کی تطہیر اور اُس کا تزکیہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اکثر رذائل کی جڑ بنیاد حبِّ مال اور حبِّ جاہ ہے۔ اور حبِّ مال حبّ جاہ سے زیادہ عام ہے۔ زکوٰۃ حبِّ مال کو توڑنے کا خاص ذریعہ ہے۔ قرآن مجید میں اکثر مقامات پر زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں زکوٰۃ کی اہمیت نماز ہی کے قریب قریب ہے۔ اسلام میں زکوٰۃ کا جو مقام ہے اس کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ رسُول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد عرب کے جن قبائل نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تھا، حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ نے اُن کے خلاف جہاد کرنے کا فیصلہ فرمایا، اور پھر تمام صحابۂ کرامؓ نے اُن کے اِس فیصلہ سے اتفاق کیا۔

یہ بھی ملحوظ رکھنے کی بات ہے کہ مسلمانوں سے دین کا مالی مطالبہ صرف زکوٰۃ ہی پر ختم نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس کے علاوہ اور بھی حقوق ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں صراحۃً ارشاد ہے:۔

ان فی المال حقًا سوی الزکوٰۃ [1]

مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی بعض اور حقوق ہیں۔

فقہا نے اپنے اپنے موقع پر اُن حقوق کو بیان بھی کیا ہے۔

---

[1] رواہ الترمذی۔ مشکوٰۃ وجمع الفوائد۔۱۲

قرآن مجید میں " انفاق فی سبیل اللہ" کا، یعنی اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا مطالبہ اتنی کثرت سے اور اتنی تاکید سے کیا گیا ہے، اور اس کے لئے جابجا ایسا انداز اختیار کیا گیا ہے، کہ گویا وہ ایمان کا لازمی جز ہے۔ یوں تو ہم مسلمانوں میں اللہ کے تمام ہی احکام سے بےفکری اور بے اعتنائی عام ہوگئی ہے، اور بہت کم لوگوں کو اس کی فکر رہ گئی ہے، لیکن سب سے زیادہ بے اعتنائی اس انفاق کے مسئلہ میں ہو رہی ہے۔ خصوصًا ہمارے اس زمانہ میں دولت کی محبت اور خودغرضی اتنی بڑھ گئی ہے کہ اپنی دولت دوسرے ضرورت مندوں پر صرف کرنے کا رواج بہت ہی کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور اللہ کے جو بندے اس فریضہ کو ابھی تک ادا کرتے بھی ہیں، اُن میں سے اکثر اس کے مصرف کے بارے میں ادائیگی کے طریقے میں بڑی بےفکری اور بے اعتنائی برتتے ہیں۔ اور اسی لئے وہ برکات ان کو حاصل نہیں ہوتیں جن کا قرآن پاک میں راہِ خدا میں مال خرچ کرنے والوں کے لئے پختہ وعدہ کیا گیا ہے۔

## نماز کی طرح زکوٰۃ کو بھی بہتر طریقے پر ادا کرنے کی فکر ضروری ہے

زکوٰۃ بھی جب نماز کی طرح ایک رُکن ہے تو اس کو بھی بہتر سے بہتر طریقے سے ادا کرنے کی ہمیں نماز ہی کی طرح فکر کرنی چاہئے، جس طرح وہ نماز بے رُوح اور بے نور ہے جو بےفکری سے ادا کی گئی ہو، اُسی طرح وہ زکوٰۃ بھی بے رُوح اور بے نور ہے جس کو بہتر سے بہتر طریقے پر ادا کرنے کی فکر نہ کی گئی ہو، اور ادائیگی میں اُس کے آداب کا لحاظ نہ کیا گیا ہو۔

## زکوٰتوں کو نورانی بنانے کی تدابیر

زکوٰۃ کو نورانی بنانے کے لئے جن چند باتوں کا خاص طور سے لحاظ کرنا چاہئے وہ یہ ہیں:

(۱) یہ کہ نماز کی طرح زکوٰۃ کے مسائل سیکھے، اور نیت میں اخلاص پیدا کرے۔

(۲) یہ کہ تلاش کر کے اور سوچ سمجھ کے ایسے مصرف میں صرف کرے جس کو صحیح تر اور بہتر سمجھے، اور جن پر صرف کرنے سے اللہ کی رضا کی اور اجر کی زیادہ اُمید ہو۔

(۳) یہ کہ جس کو زکوٰۃ دے اُس پر اپنا کوئی احسان نہ سمجھے، اور نہ اُس کو حقیر جانے،

بلکہ اُس کا احسان مانے کہ اُس کی وجہ سے ہمارا فرض اچھی طرح ادا ہوگیا، اور اپنی اس ممنونیت کو اپنے عمل سے اور اپنی زبان سے ظاہر کرے۔

(۴) یہ کہ دیتے وقت نماز کی طرح یہ دھیان کرے کہ اللہ تعالیٰ حاضر ناظر ہیں، اور میرے اس عمل کو اور میری نیت کو دیکھ رہے ہیں، اور میں اُن ہی کے حکم سے اور اُن کے سامنے اُن کے اس بندہ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

پھر زکوٰۃ دے کے اللہ تعالیٰ سے قبول فرمانے کی اور برکت کی دعا کرے، اس کے علاوہ بھی اپنے جن مقاصد کے لئے چاہے دعا کرے، جس طرح نمازوں کے بعد دعا کی جاتی ہے۔

اگر زکوتیں اس طرح ادا کی جائیں تو انشاء اللہ دنیا میں بھی اُن کی برکتیں دیکھ لی جائیں۔ تجارتوں میں اور زمین کی پیداواروں میں وہ برکت ہو کہ اہل دنیا کی سمجھ میں نہ آئے۔

## روزہ

نماز اور زکوٰۃ کے بعد تیسرا عملی رُکن ''روزہ'' ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں رُوحانیت اور ملکوتیت کا جو حصّہ رکھا ہے، روزہ اس کو ترقی دینے کا، اور نفس کی تطہیر اور تزکیہ کا خاص ذریعہ ہے، اور قناعت اور صبر و تقویٰ جیسی ملکوتی صفات کے نشو و نما میں روزہ کو خاص دخل ہے۔ علاوہ اس کے روزہ میں انسان پیٹ کے اور شہوتِ نفس کے خالِص مادی اور بہیمی تقاضوں سے بے تعلق ہو کر ملاء اعلیٰ سے اور عالَمِ ملکوت سے خاص ربط اور مناسبت پیدا کر لیتا ہے۔ لیکن نماز اور زکوٰۃ کی طرح روزہ سے بھی یہ مقاصد جب ہی حاصِل ہو سکتے ہیں جب کہ وہ عبادت والی فکر کے ساتھ رکھا جائے، اور اُس کے آداب کا پورا لحاظ رکھا جائے، اور اُن تمام باتوں سے پرہیز کیا جائے، جو اِن مقاصِد کے منافی ہیں، جن میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ ہر قسم کے معاصی سے بچا جائے، خاص کر تمام بُری باتوں سے مُنھ کی اور زبان کی حفاظت کی جائے، اگر ایسا نہیں کیا گیا، تو روزہ سے یہ رُوحانی نتائج ہرگز حاصِل نہیں ہوں گے۔ حدیث شریف میں ہے:۔

''مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ

اَن یَّدَعَ طَعَامَہٗ وَشَرَابَہٗ۔[1]

یعنی جو شخص روزہ میں بھی جھوٹ بولنا اور غلط اور دھوکہ فریب کے کام کرنا نہ چھوڑے، تو اللہ کو اس کی کوئی حاجت نہیں ہے کہ وہ کھانا پینا چھوڑ کر صرف بھوکا پیاسا رہے۔

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے:۔

رُبَّ صَائِمٍ حَظُّہٗ مِنْ صِیَامِہٖ الْجُوْعُ وَالْعَطَش[2]

یعنی بہت سے روزہ رکھنے والے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اُن کو اُن کے روزہ سے سوائے بھوکا اور پیاسا رہنے کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

بہرحال نماز اور زکوٰۃ کی طرح روزہ میں بھی اس کی ضرورت ہے کہ فکر اور اہتمام سے ایسے روزے رکھے جائیں جن سے ہماری روحوں کو پاکیزگی حاصل ہو، اور ہم میں تقویٰ کی صِفت پیدا ہو۔

## روزہ کی برکات حاصل کرنے کی شرطیں اور تدبیریں

اس کے لئے ایک شرط تو یہی ہے کہ ہر قسم کے معاصی سے، اور خاص طور سے مُنہ اور زبان سے تعلق رکھنے والے گناہوں سے، بلکہ مکروہات سے بھی پورا پرہیز کیا جائے، حتیٰ کہ حدیث شریف میں ہے، کہ:۔ چیخ کے بھی نہ بولا جائے۔ اور اس کے برعکس نیکیوں کی مقدار روزہ کے ایام میں بڑھادی جائے، خاص کر مُنہ اور زبان سے تعلق رکھنے والی نیکیوں کی، مثلاً تلاوت اور ذکر کی کثرت کی جائے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ روزہ کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کا، اور اسکے حکم اور امر کا زیادہ سے زیادہ استحضار رکھا جائے، یعنی بار بار اس کا مراقبہ اور دھیان کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ حاضر ناظر ہیں، اور میں نے اُن کے حکم سے اور اُن کے لئے کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے، اور وہ تیرے اس حال کو دیکھ رہے ہیں، خاص کر جب بھوک یا پیاس کا احساس ہو تو دل سے کہا جائے کہ اگرچہ

[1] رواہ البخاری وابوداؤد والترمذی عن ابی ہریرۃ وکذا فی جمع الفوائد۔۱۲

[2] رواہ الطبرانی فی الکبیر عن ابن عمرؓ۔ (جمع الفوائد)۔۱۲

کھانا اور پانی حاضر اور موجود ہے، لیکن اللہ کے حکم کی وجہ سے اور اللہ کو راضی کرنے کے لئے تجھے بھوکا اور پیاسا ہی رہنا ہے، تیرا مالک و معبود آج تیری اسی بھوک اور پیاس سے خوش ہے، اور آج کی یہ بھوک پیاس انشاء اللہ تجھے آخرت کی سخت ترین بھوک پیاس سے بچانے والی ہے۔

افطار اور سحر میں کم کھانا بھی روزہ کو نورانی بنانے والی چیز ہے، اور بسیار خوری سے روزہ میں ظلمت اور کدورت پیدا ہوتی ہے، اور اس کی تاثیر جاتی رہتی ہے۔

## نفلی روزوں کے بارے میں

## اُسوۂ نبویؐ اور ہمارا طرزِ عمل

روزہ کا بیان ختم کرنے سے پہلے نفلی روزوں کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا ہے:۔

نماز کے باب میں تو ہمارا یہ حال ہے کہ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو صرف فرض رکعتوں پر قناعت کرتا ہو اور سنن و نوافل نہ پڑھتا ہو، بلکہ اگر کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار کرے تو اُسے بُری نگاہوں سے دیکھا جائے گا اور اُس کے متعلق اچھا خیال قائم نہیں کیا جائے گا۔ لیکن روزہ کے باب میں قریب قریب ہم سب کا طرزِ عمل یہ ہی ہے کہ بس رمضان کے روزے سال میں ایک دفعہ رکھ لیتے ہیں۔ بہت کسی نے ہمّت کی تو عرفہ کا، یومِ عاشوراء کا اور شب برأت کا ایک ایک روزہ رکھ لیا، حالانکہ رسول اللہ ﷺ جس طرح فرض نمازوں کے علاوہ نفل نمازیں پڑھتے تھے اور دوسروں کو اس کی ترغیب دیتے تھے، اسی طرح آپ رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ نفلی روزے بھی کثرت سے رکھتے تھے، اور اُن کی بھی اُمت کو ترغیب دیتے تھے۔ ہر مہینے ایامِ بیض کے، یعنی تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں تاریخوں کے ۳ روزے تو آپ قریب قریب ہمیشہ ہی رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دوشنبہ اور پنجشنبہ کو آپ کا اکثر روزہ ہوتا تھا۔ ہمیں اپنے عمل سے حضورؐ کی اس سنّت کو بھی زندہ کرنا چاہئے۔ روزہ تو بڑی برکت والی اور رُوح کو بہت پاک اور نورانی بنانے والی چیز ہے۔ روزے کے انوار و برکات سے پورے گیارہ مہینے محروم رہنا بڑے خسارے کی بات ہے۔

## نفلی روزے نہ رکھنے کا اثر

## ہمارے رمضان کے روزوں پر

بلکہ میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ گیارہ مہینہ مسلسل روزے نہ رکھنے کی وجہ سے ہمارے رمضان کے روزے بھی گھٹیا ہوتے ہیں، اگر ہر مہینے کچھ روزوں کا معمول رہے تو روزہ کی کیفیات اور اُس کے انوار سے ایک خاص مناسبت قائم رہے، اور پھر رمضان آنے پر ہماری حالت کچھ اور ہی ہوا کرے۔

آنحضرت ﷺ کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ یوں تو آپ ہر مہینے کچھ روزے رکھتے تھے، لیکن خصوصیت سے شعبان میں بہت روزے رکھتے تھے، بلکہ کبھی کبھی قریباً پورے مہینہ کے روزے رکھتے تھے، میرے خیال میں اس کی ایک حکمت یہ بھی تھی کہ روزہ کی حقیقت سے، اور اُس کے انوار سے طبیعت مبارک کی مناسبت اور زیادہ بڑھ جائے۔ واللہ اعلم۔

بہرحال نفل نمازوں کی طرح ہمیں نفلی روزوں سے بھی شوق پیدا کرنا چاہئے، اور اُن کی عادت ڈالنی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے کم از کم ہر مہینے ۱۳، ۱۴، ۱۵ کا روزہ رکھ لیا کریں، رسول اللہ ﷺ کا معمول بھی یہی تھا، اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ

"ہر مہینے میں تین روزے، اور ہر سال پورے رمضان کے روزے رکھنا اجر وثواب کے لحاظ سے ایسا ہے جیسا کہ کوئی ہمیشہ بارہ مہینے روزے رکھے"۔ [ا]

# حج

حج اسلام کا آخری رُکن ہے۔ اور دوسری عبادات کی طرح اس کی بھی اصل غایت تو اللہ کی رضا ہی ہے، لیکن اس کی ایک خاص اور البیلی نوعیت ہے۔

اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السّلام جن کے ساتھ حضور سرورِ عالم ﷺ کو اور آپ کی وساطت سے آپ کی اُمت کو بھی ایک خاص تعلق ہے، حج دراصل اللہ تعالیٰ کے

---

[ا] نفل روزوں کے بارے میں ایک طویل روایت حضرت ابوقتادہؓ سے صاحب جمع الفوائد نے مسلم، ابوداؤد اور نسائی کے حوالہ سے نقل کی ہے، یہ اُسی کا ایک ٹکڑا ہے۔ ۱۲

ساتھ اُن ہی کی عبدیت اور فدائیت کی نسبت کا ایک ظاہری و باطنی خاکہ ہے، اور حج کے حکم کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کا جو بندہ وہاں پہنچ سکے، وہ عمر میں ایک دفعہ ضرور اللہ کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینے والے اس کے خلیل کی ہیئت بنا کر پہنچے، اور اُن کے کامل عبدیت اور کامل محبت والے مسلک سے اپنی وابستگی کا ثبوت دے، اور اللہ کے جو شعائر اُس سرزمین میں ہیں اُن سے عظمت و محبت کے اپنے تعلق کا اظہار کرے، اور اپنے ظاہر و باطن کو ابرہیمی رنگ میں رنگنے کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرے، اور اُس کی رُوح وہاں کے خاص انوار و برکات سے اپنا حِصّہ لے۔

حج کے متعلق اس سے زیادہ عرض کرنا یہاں کچھ مفید نہ ہوگا، حج کی باتیں حج کرنے ہی سے سمجھ میں آتی ہیں۔

## حج کے لئے رُوح اور باطن کو تیار کرنے کی ضرورت

البتہ اتنا عرض کرنا انشاء اللہ مفید ہوگا کہ جب کبھی اللہ تعالیٰ توفیق دے، اور آپ حج کا ارادہ فرمائیں، تو اس کے لئے کچھ پہلے سے اپنی روح اور اپنے باطن کو تیار کرنے کی فکر دوسری سب چیزوں سے زیادہ کیجئے۔

افسوس ہے کہ لوگ مادّی ضروریات کی تو فکر کرتے ہیں، نمک، مرچ، اچار، چٹنی تک ساتھ لے جانا چاہتے ہیں، دس دس جوڑے کپڑے بنواتے ہیں، اور مہینوں پہلے سے ان چیزوں کے انتظام کی فکر کرتے ہیں، لیکن حج کے لئے روحانی تیاری کی فکر کرنے کا بالکل رواج نہیں، اِسی لئے اکثر جانے والے جیسے جاتے ہیں ویسے ہی آجاتے ہیں۔ اِن مادّی ضروریات کا انتظام اگرچہ بالکل جائز ہے، بلکہ بقدرِ ضرورت ضروری ہے، لیکن یہ حج کی اصل تیاری نہیں ہے، حج کی اصل تیاری، حج کرنا سیکھنا اور اپنی رُوح اور اپنے باطن کو حج کے انوار اور برکات لینے کے قابل بنانا ہے۔

اقامت حج کے سلسلہ کا یہ بڑا ضروری کام ہے کہ حج کا ارادہ کرنے والوں کو اس طرف توجہ دلائی جائے، اور اس کی اہمیت اور ضرورت بتلائی جائے۔ حج میں رُوح پیدا کرنے کی اور رسمی حج کو حقیقی بنانے کی یہی صورت ہے۔

اب تک ہم نے اعمال اور عبادات کے سلسلہ میں نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کا ذکر کیا ہے۔ ایمان کے بعد اسلام کے یہی چار رکن ہیں۔

## ارکانِ اسلام کے رکن ہونے کا مطلب اور اُن کا امتیاز

ان کے رکن ہونے کا مطلب یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ چاروں چیزیں ایمان کی طرح مقصود بالذات ہیں، اور اپنی معیّن شکل وصورت کے ساتھ مطلوب ہیں اور ایک مسلمان کے مسلمان ہونے کا اِن سے عملی ثبوت ملتا ہے۔ اِن کے علاوہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ اگرچہ وہ دین میں ضروری ہیں لیکن ان کی شکل وصورت شریعت نے اس طرح مقرر نہیں کی ہے بلکہ صرف اصول بتلا دیئے ہیں، یا وہ مقصود بالذات نہیں ہیں، بلکہ کسی مقصد کا ذریعہ ہیں، مثلاً دین سیکھنا سکھانا بھی ضروری ہے، فرائض میں سے ہے، اسی طرح مثلاً دین کی نصرت اور حمایت بھی فرائض میں سے ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ نماز روزہ وغیرہ ارکان کی طرح اِن کی شکل اور ہیئت مقرر نہیں کی گئی ہے، اور یہ مقصود بالذات بھی نہیں ہیں، بلکہ تعلیم وتعلّم اس لئے ضروری ہے کہ دین پر چلنا اُس پر موقوف ہے، اسی طرح دین کی نصرت اور حمایت دین کی حفاظت اور اس کی ترقی اور ترویج کے لئے مطلوب ہے۔

ایک دوسری بات اِس سلسلہ میں یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ اسلام نام ہے اللہ کی بندگی اور فرمانبرداری کا، گویا عبدیت ہی کا دوسرا نام اسلام ہے، اور عبدیت کی صفت کا جیسا اظہار اِن چار چیزوں سے ہوتا ہے ایسا کسی دوسرے دینی عمل سے نہیں ہوتا، گویا اسی امتیاز کی وجہ سے اِن کو رکن قرار دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اِن کے رکن قرار دیئے جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اگر یہ چاروں عبادتیں صحیح طور پر ادا کی جائیں، جیسا کہ اِن کا حق ہے، تو اِن کا اثر پوری زندگی پر پڑتا ہے، اور پھر پوری زندگی اسلام والی اور عبدیت والی زندگی بن سکتی ہے، لیکن شرط یہی ہے کہ یہ صرف ظاہری اور رسمی نہ ہوں، بلکہ اپنے ظاہر وباطن اور اپنے قالب وروح میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز، روزہ اور زکوٰۃ وحج سے کچھ نسبت رکھتی ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان چاروں چیزوں میں بڑی تاثیر اور بڑی جان ہے۔

ہماری نمازیں اور ہمارے روزے، ہماری زکوٰتیں اور ہمارے حج اگر آج ہماری

زندگیوں پر کوئی بڑا اثر نہیں ڈال رہے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ بے رُوح اور بے جان ہیں۔ ؎

خرمانتواں یافت ازاں خار کہ کشتیم
دیبانتواں بافت ازاں پشم کہ رشتیم

انبیاء علیہم السّلام کی اُمتوں میں طولِ امد کی وجہ سے جو تغیرات ہوا کرتے ہیں اُن میں سے ایک بڑا تغیر یہ ہوتا ہے کہ ان کی عبادات میں رسمیت آجاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی اُمت میں بھی یہ تغیر آیا۔ اُن مسلمان کہلانے والوں کا اِس وقت ذکر نہیں جنھوں نے سرے سے اِن ارکان ہی کو چھوڑ رکھا ہے، اور کافروں کی طرح عملاً اِن ارکان سے بالکل بے تعلق اور بے پرواہو کر زندگی گذار رہے ہیں، اُن کا جو حشر ہونے والا ہے وہ مرنے کے بعد آنکھوں کے سامنے آجائے گا۔ بلکہ ہم اور آپ جیسے مسلمان جن کا تعلق الحمدللہ اِن ارکان سے باقی ہے، اُن کا بھی عام حال یہ ہے کہ ان کے پاس ان اعمال کا صرف ظاہری خاکہ باقی ہے، اور رُوح نکل چکی ہے، بہت کم اللہ کے بندے ہوں گے جن کا حال اس عموم سے مستثنیٰ ہے، اگر ہمارے اِن ارکان میں سے رُوح نہ نکل چکی ہوتی تو کم از کم اُمت کے اُن طبقوں کا حال کچھ اور ہوتا جن کا تعلق اِن ارکان سے اب بھی باقی ہے وہ اپنے اخلاق میں معاملات میں، معاشرت میں، اور اپنی پوری زندگی میں دنیا سے بالکل ممتاز ہوتے، جس سے اُن کا واسطہ پڑتا، اور جو اُن کو برتتا وہ اُن کے وجود کو رحمت سمجھتا، اور اُن میں ایک خاص محبوبیت اور خوشبو محسوس کرتا۔ یہ بالکل حقیقت ہے، اس میں ذرا بھی شاعری نہیں ہے اور اب بھی اللہ کے جن بندوں کا حال اِس بگڑے ہوئے عموم سے مستثنیٰ ہے یعنی اُن کی عبادات میں رُوح ہے، اور اُن کی نمازوں، اُن کے روزوں اور اُن کی زکوٰۃ اور اُن کے حجوں کو رسول اللہ ﷺ کے نماز، روزہ، اور آپ کی زکوٰۃ و حج سے کوئی نسبت ہے، اُن کی زندگی اب بھی ممتاز ہے، اور دیکھنے برتنے والوں کے لئے اُن میں محبوبیت اور خوشبو موجود ہے، لیکن حالات کچھ ایسے ہیں کہ ہمارے اس زمانہ میں ایسے بندے تو کبریتِ احمر کی طرح کم ہیں ہی، لیکن اُن کے دیکھنے اور برتنے والے بھی کم ہیں۔

## ارکان میں حقیقت پیدا کرنے کی کوشش احیاءِ دین کے سلسلہ کا بنیادی کام ہے

اللہ توفیق دے، تو اس وقت خدمتِ دین اور احیاءِ دین کے سلسلہ کا بنیادی کام یہ ہے کہ ان ارکان میں رُوح اور حقیقت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، اور اُمت کی نمازوں، روزوں، زکوٰتوں اور حجوں کو ظاہر اور باطن کے لحاظ سے حضورؐ کے نماز، روزے اور زکوٰۃ و حج کے منہاج پر لانے کے لئے جدوجہد کی جائے۔

عبادات کے سلسلہ میں یہاں بس اتنا ہی عرض کرنا تھا، اب اس کے بعد شریعت کے دوسرے شعبوں کے متعلق اسی طرح کی کچھ اصولی باتیں عرض کرنی ہیں۔

-------------

# اخلاقِ حسنہ

## دین میں اخلاق کی اہمیت

جس طرح عبادت دین کا ایک شعبہ ہے، اور اُس کا ہم بندوں سے مطالبہ کیا گیا ہے، اسی طرح اخلاق کا بھی ایک شعبہ ہے، اور دین میں اس کی بھی بڑی اہمیت ہے بلکہ ایک پہلو سے دین کے دوسرے تمام شعبوں کے مقابلے میں اس کو فوقیت اور بالاتری حاصل ہے، اور وہ پہلو یہ ہے کہ اخلاق میں بندہ اللہ تعالیٰ کی نیابت کرتا ہے، یعنی اخلاق دراصل خدائی صفات ہیں، اور ہمیں یہ حکم ہے کہ ہم بھی اپنی بندگی کی حیثیت کے مطابق وہی صفات اختیار کریں۔

چنانچہ ایک روایت میں ہے:۔

"تَخَلَّقُوْ بِاَخْلَاقِ اللّٰه"

اللہ تعالیٰ والے اخلاق کو اپنے اخلاق بناؤ

اخلاق کی اس امتیازی حیثیت کو سمجھنے کے لئے پہلے ایک اصولی بات یہ سمجھ لینی چاہئے کہ بندے کے جن اعمال سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے، اور جن پر بندہ کو اجر وثواب ملنے والا ہے، وہ چار قسم کے ہیں۔

## اعمالِ صالحہ کی ۴ قسمیں

ایک وہ اعمال جن کے ذریعہ بندہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اُس کی معبودیت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے سامنے اپنی بندگی اور اپنے عجز و نیاز کا اظہار کرتا ہے۔ یہ شان عبادات کی ہے، گویا بندہ اپنی عبدیت کا اظہار عبادات ہی کے ذریعہ کرتا ہے۔

دوسری قسم وہ اعمال ہیں کہ دراصل بندہ اُن کو اپنی دنیوی ضرورت اور نفس کی

خواہش سے کرنے پر مجبور ہے، لیکن جب بندہ اُن کو اللہ کی ہدایت اور اللہ کے احکام کی پابندی کے ساتھ کرتا ہے، تو اُن پر بھی وہ اللہ کی رضا کا اور اجر وثواب کا مستحق ہوتا ہے۔ مثلاً روزی کمانے کے لئے کھیتی باڑی یا تجارت یا مزدوری کرنا بندے کی اپنی ضرورت ہے۔ اسی طرح نکاح کرنا اور بچّوں کا پالنا اپنی ضرورت اور اپنے نفس کی خواہش ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کے بارے میں کچھ احکام دیدیئے ہیں کہ اگر اُن کی پابندی کے ساتھ یہ کام کئے جائیں تو بندہ ان کاموں پر بھی اسی طرح اللہ کی رضا کا اور آخرت کے اجر وثواب کا مستحق ہوتا ہے جس طرح کہ عبادات پر مستحق ہوتا ہے۔ یہ شان معاملات اور معاشرت کی ہے۔

تیسری قسم وہ اعمال ہیں جو دراصل انبیاء علیہم السّلام کے ہیں، اور دوسرے لوگ اُن کو اُن کی نیابت میں اور اُن ہی کے مشن کی خدمت کے طور پر کرتے ہیں۔ جیسے کہ دینی دعوت، دین کی نصرت، دین کے راستے میں جدوجہد اور قربانی، دین کی تعلیم اور تبلیغ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ یہ سب اعمال بھی اللہ تعالیٰ کو بہت راضی کرنے والے ہیں، اور بلاشبہ ان میں بہت بڑا اجر وثواب ہے۔ اور ان کا خاص امتیاز یہ ہے کہ یہ انبیاء علیہم السّلام کی نیابت والے اعمال ہیں، اور ان اعمال کے کرنے والوں کو انبیاء علیہم السلام سے ایک خاص نسبت ہوتی ہے، جو دوسرے اعمال سے حاصِل نہیں کی جا سکتی۔

اور چوتھی قسم وہ اعمال ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی نیابت کا رنگ ہے۔ یہ شان اخلاق کی ہے۔ مثلاً رحم ایک خُلق ہے جو دراصل اللہ تعالیٰ میں ہے، اور وہ اس کی وجہ سے رحمٰن اور رحیم ہے، پھر بندوں کو بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ وہ اپنے اندر بھی رحم کی صفت پیدا کریں، اور ہر قابلِ رحم مخلوق کے ساتھ رحم کا معاملہ کریں۔

اسی طرح خطا قصور معاف کرنا، اور دوسروں کے عیب چھپانا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور بندوں کو بھی حکم ہے کہ وہ بھی اپنے اندر یہ صفت پیدا کریں۔

علیٰ ہذا حیا اور حلم اللہ تعالیٰ کی صفتیں ہیں اور بندوں کو بھی حکم ہے کہ وہ بھی ان کو اختیار کریں۔

ایسے ہی جود و کرم، سخاوت، حاجت مندوں کی مدد کرنا، عدل وانصاف کرنا، یہ سب اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، اور بندوں کو بھی حکم ہے کہ وہ یہ صفات اپنے اندر پیدا کریں۔

اسی طرح نیکوں اور نیکیوں سے محبت اور اُن کو پسند کرنا، اور بُرائیوں سے بُغض ونفرت اور اُن سے ناراض ہونا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، اور بندوں کو بھی حکم ہے کہ اُن کا حال بھی یہی ہو۔

## اخلاق میں ایک گونہ اللہ تعالیٰ کی نیابت ہے

الغرض بندے کے تمام اعمال واحوال میں صرف اخلاق کی یہ شان ہے کہ بندہ اس میں اللہ تعالیٰ کی نیابت کرتا ہے، یعنی وہ کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ خود کرتے ہیں، یہ شان کسی دوسرے عمل کی نہیں ہے۔ اس لئے اس پہلو سے اخلاق کو بندے کے دوسرے تمام اعمال کے مقابلہ میں امتیاز اور برتری حاصل ہے۔

## اخلاق کے متعلق چند احادیث نبویؐ

جب آپ نے شعبۂ اخلاق کے اس امتیاز کو سمجھ لیا تو اب اخلاق کی اہمیت سے متعلق رسول اللہ ﷺ کی چند حدیثیں سُنئے۔

ارشاد فرمایا:۔

"بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاق"

اللہ نے مجھے اس لئے نبی بنا کر بھیجا ہے کہ میں اخلاقی خوبیوں کو درجۂ کمال تک پہنچادوں۔

(رواہ مالک واحمد۔ مشکوٰۃ باب حسن الخلق)

ایک دوسری حدیث میں ہے:۔

"اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُھُمْ خُلُقًا"

ایمان میں سب سے زیادہ کامل وہ مومنین ہیں جن کے اخلاق زیادہ اچھے ہیں۔ (رواہ ابوداؤد والدارمی مشکوٰۃ باب حسن الخلق)

ایک حدیث کے الفاظ ہیں:۔

"اِنَّ اَثْقَلَ شَیْءٍ یُوْضَعُ فِیْ مِیْزَانِ الْمُؤْمِنِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ خُلُقٌ حَسَنٌ

قیامت کے دن مومن کی میزانِ اعمال میں سب سے زیادہ وزن دار چیز جو رکھی جائے گی، وہ اُس کا اچھا اخلاق ہوگا۔

(رواہ الترمذی وابوداؤد۔ مشکوٰۃ)

رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دین میں اخلاق کے شعبہ کی کتنی اہمیت ہے، اور اس کا کیا درجہ اور مقام ہے، لیکن ہم مسلمانوں میں جو کچھ دیندار بھی ہیں اُن میں سے بھی اکثر کا اب حال یہ ہے کہ وہ شعبۂ عبادات کی اہمیت تو کسی درجہ میں محسوس کرتے ہیں مگر اخلاق اور اسی طرح معاملات اور معاشرت کے متعلق جو احکام ہیں اُن کی اہمیت کو وہ محسوس نہیں کرتے، بہت سے لوگ تو کچھ ایسا سمجھتے ہیں کہ گویا ان احکام کی پابندی بڑا بزرگ اور کامل بننے کے لئے ضروری ہے اور نجات کے لئے بس نماز روزہ کافی ہے۔ حالانکہ دوزخ سے اور اللہ کے عذاب سے بچنے کے لئے جس طرح نماز روزہ ضروری ہے اسی طرح بُرے اخلاق کا چھوڑنا اور اچھے اخلاق کا اختیار کرنا بھی ضروری ہے۔

## قرآن وحدیث میں اچھے اخلاق کی تاکید اور بُرے اخلاق پر سخت وعیدیں

قرآن وحدیث میں جس طرح نماز روزہ وغیرہ عبادات کی تاکید فرمائی گئی ہے، اسی طرح اخلاقِ حسنہ کی بھی تاکید فرمائی گئی ہے اور جس طرح عبادت کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو عذاب سے ڈرایا گیا ہے، اسی طرح بہت سے بُرے اخلاق پر بھی جہنم کی اور عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔

مثلاً بُخل (یعنی مال کی ایسی محبت اور اُس سے ایسی دلبستگی جو خرچ کے موقعوں پر خرچ کرنے میں رکاوٹ بنے) ایک اخلاقی مرض ہے، اُس کے متعلق ارشاد ہے:۔

"وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ط بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ط سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ط

مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جن کو دولت دی ہے اور وہ اُس میں بخل کرتے

ہیں (اور جہاں اُس کو خرچ کرنا چاہئے وہاں خرچ نہیں کرتے) وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ اُن کے حق میں کوئی اچھی چیز ہے، بلکہ وہ اُن کے حق میں شرِ محض ہے، قیامت کے دن یہی دولت جس کے خرچ کرنے میں وہ بخل کرتے ہیں ان کے گلے کا طوق بنائی جائے گی۔

(آل عمران۔ ع ۱۸)

اس آیت میں بُخل پر (جو صرف ایک اخلاقی رذیلہ ہے) کتنی بڑی وعید سنائی گئی ہے۔

اسی طرح سُورۂ ھُمَزَہ میں ایسے لوگوں کو جن میں مال کی گہری محبت، اور دوسروں پر طعنہ زنی اور عیب چینی کے بُرے اخلاق ہوں، دوزخ کے عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔ ارشاد ہے:۔

"وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۨ ٥ الَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ ٥ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ٥ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِى الْحُطَمَةِ" ٥

یعنی ان لوگوں کے لئے انجام کی بڑی خرابی ہے جن کا حال یہ ہے کہ وہ دوسروں کو رودررو طعنے دیتے ہیں، اور پیٹھ پیچھے لوگوں کے عیوب اوراُن کی بُرائیاں بیان کرتے ہیں، اورانھیں مال ودولت سے ایسی گہری محبت ہے کہ وہ اس کو جوڑ جوڑ کے رکھتے ہیں اور گِنا کرتے ہیں، گویا کہ اُن کا یہ مال ہمیشہ باقی رہے گا، یہ لوگ ضرور بالضرور دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔

الغرض ان آیتوں میں جن بُرائیوں پر دوزخ کی اور عذاب کی وعید ہے وہ صرف اخلاقی بُرائیاں ہیں۔

اسی طرح رسُول اللہ ﷺ نے بعض بُرے اخلاق کے متعلق بیان فرمایا ہے کہ یہ دوزخ میں لے جانے والے اور جنت سے محروم کرنے والے ہیں۔ مثلاً کِبر کے متعلق ارشاد فرمایا:۔

لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ فِىْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ

جس کے دل میں ذرّہ برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں نہیں جا سکے گا۔

(رواہ مسلم۔ مشکوٰۃ)

اسی طرح ایک حدیث میں ہے:۔

لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ ——— (رواہ البخاری۔ مشکوٰۃ)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کی عیب جوئی کرنے والا اور اُن کے راز معلوم کر کر کے اُن کو پھیلانے والا جنت میں نہ جا سکے گا۔

اسی طرح ایک حدیث ہے:۔

تَجِدُوْنَ شَرَّ النَّاسِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ذَاالْوَجْهَیْنِ یَاتِیْ هٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ وَهٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ۔ (رواہ البخاری و مسلم۔ مشکوٰۃ)

یعنی قیامت میں سب سے بُرے حال میں وہ دورُخا آدمی ہوگا جو ایک گروہ سے ایک رُخ سے ملے اور دوسرے گروہ سے دوسرے رُخ سے مطلب یہ ہے کہ اِن سے اِن کی سی بات کرے اور اُن سے اُن کی سی۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے:۔

لَا یَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَّا یَرْحَمُ النَّاسَ ——— (بخاری و مسلم۔ مشکوٰۃ)

یعنی اللہ تعالیٰ اُس شخص پر رحم نہیں کرے گا جو اُس کے بندوں کیساتھ رحم کا معاملہ نہیں کرتا۔

بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اطلاع دی ہے کہ:

''ایک عورت صرف اپنی اس بے رحمانہ حرکت کی وجہ سے دوزخ میں جائے گی کہ اُس نے ایک بلّی کو بند کر رکھا تھا، اور اُسے کھانے کے لئے کچھ نہیں دیا، یہاں تک کہ وہ بھوکی مر گئی''۔ (رواہ مسلم۔ مشکوٰۃ)

اور اس کے برعکس مخلوق پر رحم کرنے والوں کے لئے اللہ کی خاص رحمت کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ ایک حدیث میں ہیں:۔

اَلرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ

یَرْحَمُکُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ ـــــــــــ (ابوداؤد۔ مشکوٰۃ)

یعنی رحم کرنے والوں پر اللہ کی رحمت ہوگی، تم زمین پر بسنے والی مخلوق پر رحم کرو، آسمان والا خالق تم پر رحمت کرے گا۔

ایک حدیث میں ہے، حضورؐ نے اس واقعہ کی اطلاع دی، کہ:۔

''ایک عورت اِس عمل پر بخشی گئی کہ پیاس سے تڑپنے والے ایک کُتّے کو دیکھ کر اُس کا دل دُکھا، اور اُس نے بڑی محنت سے کنوئیں سے پانی نکال کے اُس کو پلایا، اور اُس کی جان بچائی''۔ (مشکوٰۃ)

اور جس طرح مندرجہ بالا حدیثوں میں بعض بُرے اخلاق کے متعلق عذاب کی اور دوزخ کی وعیدیں ہیں، اسی طرح بعض بُرے اخلاق کے متعلق حدیثوں میں آتا ہے کہ جس میں یہ باتیں ہوں وہ مومن نہیں ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے قسم کھا کر ارشاد فرمایا:۔

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَا یُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَایُحِبُّ لِنَفْسِہٖ ـــــــــــ (رواہ البخاری ومسلم۔ مشکوٰۃ)

قسم اُس اللہ کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، کوئی بندہ اُس وقت تک صاحبِ ایمان نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اس کا یہ حال نہ ہو کہ وہ اپنے ہر بھائی کے لئے وہی چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے۔ یعنی اگر یہ بات نہیں ہے تو وہ پورا مومن اور سچّا مسلمان نہیں ہے۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے۔ حضور ﷺ نے تین بار قسم کھا کر ارشاد فرمایا:۔

وَاللّٰہِ لَایُؤْمِنُ، وَاللّٰہِ لَایُؤْمِنُ، وَاللّٰہِ لَایُؤْمِنُ، قِیْلَ مَنْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! قَالَ اَلَّذِیْ لَایَاْمَنُ جَارُہٗ بَوَائِقَہٗ ـــــ (رواہ مسلم۔ مشکوٰۃ)

خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ صاحبِ ایمان نہیں، خدا کی قسم اُس کو ایمان نصیب نہیں۔ عرض کیا گیا:۔ حضرت کون؟۔ ارشاد فرمایا: وہ بدبخت جس کی شرارتوں سے اُس کے پڑوسی اَمن میں نہیں۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے، آپ نے ارشاد فرمایا:

لَیْسَ الْمُؤْمِنُ الَّذِیْ یَشْبَعُ وَجَارُهٗ جَائِعٌ اِلٰی جَنْبِهٖ

یعنی وہ بیدرد اور بے رحم مومن نہیں جس کا حال یہ ہو کہ وہ اطمینان سے پیٹ بھر کے کھائے اور اُس کے پہلو میں اُس کا پڑوسی فاقہ سے رہے۔ (مشکوٰۃ)

غور کیجئے ان سب حدیثوں میں جن برائیوں پر دوزخ کی اور عذاب کی وعید سُنائی گئی ہے، اور جنت سے یا ایمان سے محرومی کا اعلان فرمایا گیا ہے وہ سب اخلاق کے سلسلہ کی چیزیں ہیں۔ ان حدیثوں سے سمجھا جا سکتا ہے کہ دین میں اخلاق کی کتنی اہمیت ہے۔

شیخ الاسلام حافظ ابنِ تیمیہؒ نے ''کتاب الایمان'' میں لکھا ہے، کہ:۔

''حدیثوں میں جن جن باتوں کے بارے میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جس میں یہ باتیں ہوں گی وہ جنت میں نہیں جا سکے گا، یا یہ کہ جس میں یہ باتیں ہوں وہ مومن نہیں ہے، اُن کا درجہ کم سے کم یہ ہے کہ وہ شریعت میں حرام ہیں، اور اُن سے اپنے کو بچانا واجب ہے''۔

بہر حال اخلاق کی اصلاح کا معاملہ صرف تکمیلی چیز نہیں ہے کہ صرف بزرگ اور کامل بننے کے لئے اس کی ضرورت ہو، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان ہونے کے لئے اور دوزخ سے بچنے کے لئے جس طرح نماز، روزہ ضروری ہے، اسی طرح بُرے اخلاق سے بچنا اور اچھے اخلاق کا اختیار کرنا ضروری ہے، خاص کر وہ اخلاق جن کی حدیث وقرآن میں خصوصیت کے ساتھ تاکید فرمائی گئی ہے، مثلاً:۔ صبر، توکّل، سچائی، امانت داری، عہد کی پابندی، اخلاص، اللہ ورسول کی سچی اور کامل محبت، دوسروں کی خیر خواہی، دوسروں کے ساتھ نیک گمانی، دوسروں کی پردہ پوشی، رحم، عفو و درگذر، غصہ کا پی جانا، سخاوت، عدل وانصاف، تواضع اور خاکساری، حب فی اللہ اور بغض فی اللہ۔ ان اخلاق کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش نہایت ضروری ہے، اسی طرح جو اِن کے اضداد بُرے اخلاق ہیں جن کو رذائل کہا جاتا ہے، اُن کو اپنے اندر سے نکالنے کی کوشش بھی بے حد ضروری ہے۔

ان اخلاق کے بارے میں قرآن مجید کی آیات اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کچھ اس عاجز کی کتاب ''اسلام کیا ہے؟'' میں بھی ذکر کئے جا چکے ہیں، اور اس سے زیادہ تفصیل ''معارف الحدیث جلد دوم'' کے مطالعہ سے معلوم کی جا سکتی ہے، اس لئے یہاں اِس اجمالی بیان ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اب میں معاملات اور معاشرت کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

......................

# معاملات اور معاشرت

معاملات اور معاشرت کا تعلق دراصل ہماری زندگی کی ضرورتوں اور خواہشوں سے ہے، اور اللہ تعالیٰ نے یہ بڑا فضل فرمایا ہے کہ اِن چیزوں کے بارے میں بھی احکام دے کر ہمارے لئے اِن کو بھی ثواب کا اور اپنی رضا اور اپنا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ بنادیا ہے، معاملات سے مُراد مالی لین دین کے معاملات ہیں، جیسے قرض، امانت، خرید وفروخت، نوکری، مزدوری وغیرہ۔ اور معاشرت سے مُراد رہن سہن کا وہ برتاؤ ہے، جو اُن لوگوں کے ساتھ کیا جاسکتا ہے جن سے کسی قسم کا تعلق اور واسطہ پڑتا ہے، خواہ مستقل اور دائمی واسطہ ہو، جیسے ماں باپ، اولاد، بھائی بہن اور دوسرے اقارب، اور میاں بیوی کا یا گھر کے برابر رہنے والے پڑوسی کا۔ اور خواہ عارضی اور وقتی ہو، جیسا کہ مثلاً سفر کے رفیقوں کا، یا مدرسہ یا کارخانہ کے ساتھیوں کا۔

## دین میں معاملات اور معاشرت کی خصوصی اہمیت

اخلاق کی طرح دین میں اِن دونوں شعبوں کی بھی بہت بڑی اہمیت ہے، بلکہ اِن کو دوسرے شعبوں کے مقابلہ میں اس حیثیت سے خاص امتیاز حاصل ہے کہ ان میں اپنی دنیوی منفعت اور مصلحت اور اپنی خواہش نفس کی اور اللہ کے احکام کی کشمکش دوسرے تمام شعبوں سے زیادہ رہتی ہے۔ مثلاً کاروبار میں منفعت اِس میں نظر آتی ہے اور نفس کی خواہش بھی عموماً یہ ہی ہوتی ہے کہ جھوٹ سچ اور جائز ناجائز کا لحاظ نہ کیا جائے، بلکہ جیسا موقع ہو اور جس طرح بھی زیادہ نفع کی اُمید ہو وہ کر گذرا جائے، لیکن اللہ کا دین یہ کہتا ہے کہ خبردار چاہے سراسر نقصان ہو، اور چاہے بالکل دِوالہ نکل جائے لیکن جھوٹ ہرگز نہ بولو، اور صرف اُس طریقے سے کاروبار کرو جس کو اللہ نے حلال کیا ہے، اسی طرح معاشرت یعنی آپس کے

برتاؤ کا حال ہے اُس میں بھی خواہش نفس اور اللہ کے حکم کے درمیان اکثر مقابلہ اور تصادم رہتا ہے، اس لئے بندہ کی بندگی اور فرمانبرداری کا سب سے زیادہ سخت امتحان معاملات اور معاشرت کے احکام میں ہے۔

## معاملات اور معاشرت کی اہمیت کا ایک دوسرا پہلو

اور دوسرا پہلو اِن شعبوں کی اہمیت کا یہ ہے کہ ان کا تعلق اللہ کے بندوں کے حقوق سے بھی ہے، یعنی نماز، روزہ، اگرچہ ارکانِ دین ہیں اور اس حیثیت سے ایمان کے بعد اِن ہی کا درجہ ہے، لیکن وہ صرف حقوقُ اللہ ہیں، اور جو شخص اِن میں کوتاہی کرتا ہے وہ صرف خدا کا مجرم ہوتا ہے، اور اگر توفیق مل جائے اور سچے دل سے استغفار اور توبہ کر کے اپنے یہ گناہ معاف کرالے تو اللہ تعالیٰ کے کرم سے معافی ہی کی اُمید ہے۔ لیکن معاملات اور معاشرت میں اگر گڑبڑ ہوئی تو اللہ تعالیٰ کی بھی نافرمانی ہوئی، اور کسی نہ کسی بندے کی اس میں حق تلفی بھی ضرور ہوئی، اور بندے تو عموماً ہم ہی جیسے کم حوصلہ اور تنگ ظرف ہیں، وہ تو قیامت میں اپنی پھوٹی کوڑی بھی نہ چھوڑیں گے۔ ایک حدیث کا مضمون ہے کہ:۔

> "بعض لوگ نماز روزہ اور صدقہ وخیرات کی قسم کی بہت سی نیکیاں یہاں سے کما کے لے جائیں گے لیکن اُن کے معاملات اور اُن کی معاشرت خراب ہوگی، کسی کا حق مارا ہوگا، کسی کا دل دُکھایا ہوگا، کسی کی غیبت کی ہوگی وغیرہ وغیرہ"۔ جب وہ محشر میں مقامِ حساب میں پہنچیں گے تو جن لوگوں کے معاملاتی اور معاشرتی حقوق اُن کے ذمہ ہوں گے وہ مدّعی بن کے کھڑے ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ سے انصاف کے طالب ہوں گے پھر اللہ تعالیٰ انصاف اور فیصلہ فرمائیں گے، اور اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نماز، روزہ، صدقہ، خیرات کی قسم کی اِن لوگوں کی ساری نیکیاں اُن مدعیوں کو دلوادی جائیں گی، اور جب ان نیکیوں سے بھی اُن لوگوں کے پورے حقوق ادا نہ ہوں گے تو اُن مدعیوں کے کچھ گناہ اِن لوگوں پر لاد دیئے جائیں گے، اور بالآخر

یہ لوگ جہنّم میں ڈلوادیئے جائیں گے"۔ (رواہ مسلم۔ مشکوٰۃ)

بہر حال اس پہلو سے معاملات اور معاشرت کی بڑی اہمیت ہے، اور غالبًا اِسی حیثیت سے ایک حدیث میں معاملات اور معاشرت کی اصلاح کو صراحۃً نماز، روزہ اور صدقہ وخیرات سے افضل بتایا گیا ہے، یہ حدیث ترمذی اور ابوداؤد کے حوالہ سے مشکوٰۃ شریف میں نقل کی گئی ہے، اِس کے راوی حضرت ابوالدرداءؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن ہم سے فرمایا:۔

"اَلَا اُخبِرُ کُمْ بِاَفْضَلَ مِنْ درجة الصِّیَامِ وَالصَّدَقَةِ وَالصَّلٰوة".

"کیا میں تمھیں وہ چیز بتاؤں جو روزہ، صدقہ اور نماز سے بھی افضل ہے؟"۔

ابوالدرداء بیان کرتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا:۔ حضرت وہ چیز ضرور بتلایئے! آپ نے ارشاد فرمایا:۔

قَالَ اِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَینِ وَفَسَادُ ذَاتِ الْبَیْنِ هِیَ الْحَالِقَةُ۔

(رواہ الترمذی وابوداؤد۔ مشکوٰۃ)

وہ چیز آپس کے معاملات اور معاشرتی تعلقات کی اصلاح ہے، اور اِن معاملات اور تعلقات کی خرابی، مونڈ دینے والا اُسترا ہے۔ (بال مونڈنے والا اُسترا نہیں، بلکہ دین کا صفایا کردینے والا اُسترا)۔

ان دو ہی حدیثوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام میں معاملات اور معاشرت کی اصلاح ودرستی کی کتنی اہمیت ہے۔ افسوس! آج کل کے بہت سے اچھے خاصے دیندار حلقوں میں بھی معالات اور معاشرت کی اصلاح ودرستی کا اتنا اہتمام نہیں، جتنا کہ ہونا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ جن کی حالت نماز۔ روزہ وغیرہ عبادات کے لحاظ سے کچھ غنیمت بھی ہے، معاملات اور برتاوے اُن کے بھی اسلامی نہیں۔ ایسی حالت میں عبادتیں اور دُعائیں کیا قبول ہوں۔

مشکوٰۃ شریف میں بحوالہ مسند احمد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

مَنِ اشْتَرٰی ثَوْبًا بِعَشْرَةِ دَرَاهِمَ وَفِیْهِ دِرْهَمٌ حَرَامٌ لَمْ یَقْبَلِ
اللّٰهُ تَعَالٰی لَهٗ صَلٰوۃً مَادَامَ عَلَیْهِ۔ ثُمَّ اَدْخَلَ اِصْبَعَیْهِ فِیْ
اُذُنَیْهِ وَقَالَ صُمَّتَا اِنْ لَّمْ یَکُنِ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ
سَمِعْتُهٗ یَقُوْلُهٗ۔

جس شخص نے دس درہم کا کوئی کپڑا خریدا، اور اِن دس درہموں میں ایک درہم حرام ہے (جو کسی ناجائز ذریعہ سے حاصل ہوتھا) تو جب تک وہ شخص اُس کپڑے کو پہنے رہے گا اُس کی کوئی نماز بھی اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے یہ حدیث سُنا کر اپنے کانوں میں انگلیاں دے کر سامعین سے فرمایا کہ بہرے ہو جائے میرے یہ کان، اگر میں نے حضورؐ سے یہ بات نہ سنی ہو۔

ایک دوسری حدیث میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔

اِنَّ اللّٰهَ طَیِّبٌ لَا یَقْبَلُ اِلَّا طَیِّبًا ——— [1]

پھر اس کے بعد آپ نے رزق طیّب حاصل کرنے کی تاکید فرمائی، اور پھر آخر میں ایک شخص کا ذکر فرمایا:۔

ثم ذکر الرجل یطیل السفر اشعث اغبر یمدّ یدیه الی
السّماء یارب یارب ومطعمه حرام ومشربه حرام وغذی
بالحرام فَاَنّٰی یُستَجابُ لِذالِکَ۔ (رواہ مسلم۔ مشکوٰۃ)

جو دُور دراز کا سفر کر کے (کسی خاص مقدس اور متبرک مقام پر دعا کرنے کے لئے) اِس حال میں آئے کہ اُس کے بال پراگندہ ہوں، اور سر سے پاؤں تک وہ غبار میں اَٹا ہوا ہو، اور آسمان کی طرف دونوں ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے وہ خوب اِلحاح کے ساتھ دعا کرے اور کہے اے میرے رب! اے میرے پروردگار! لیکن اُس کا کھانا پینا حرام

---

[1] اللہ تعالیٰ خود پاک ہے وہ صرف پاک مال ہی کو قبول کرتا ہے۔ ۱۲

مال سے ہو، اور حرام مال ہی سے اُس کی پرورش ہوئی، تو اس حالت میں اُس کی یہ دُعا کیونکر قبول ہوگی۔

مطلب یہ ہے کہ جب کسی شخص کے کاروباری معاملات درست اور شریعت کے مطابق نہ ہوں، اور اُس کا کھانا پہننا حرام مال اور ناجائز آمدنی سے ہو، تو اُس کی دعا قابلِ قبول نہیں، چاہے وہ ہزاروں میل کا سفر کرکے کسی مقدس اور متبرک مقام پر جاکر ہی دعا کرے، ایک اور حدیث میں ہے:۔

لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ جَسَدٌ غُذِّیَ بِالْحَرَامِ ۔(رواہ البیہقی ۔مشکوٰۃ)

جو جسم حرام غذا اور ناجائز آمدنی سے پلا ہو وہ جنت میں نہ جا سکے گا۔

رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ کی رضا و رحمت حاصل کرنے کے لئے اور سچا مسلمان بننے کے لئے جس طرح نماز، روزہ، وغیرہ عبادات اور اخلاقِ حسنہ ضروری ہیں اسی طرح معاملات کی درستی اور ذرائع آمدنی کی صحت اور پاکی بھی ضروری ہے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ایسے لوگوں سے اپنی بیزاری اور بالکل بے تعلقی کا اعلان فرمایا ہے جو کاروبار میں ایمانداری اور دیانتداری کے اصول کی پابندی نہ کریں۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ غلّہ کے ایک ڈھیر کے پاس سے گذرے (جو کسی دُکاندار نے لگا رکھا تھا) آپ نے اپنا ہاتھ اُس ڈھیر کے اندر داخل کر دیا تو اندر کچھ نمی اور تری محسوس ہوئی (حالانکہ اوپر سے غلّہ بالکل سوکھا نظر آتا تھا) آپ نے دُکاندار سے پوچھا کہ یہ کیا قصّہ ہے کہ اوپر سے تمھارا غلّہ خشک ہے اور اندر گیلا ہے، اُس نے کہا کچھ بوندیں پڑ گئی تھیں جس سے غلّہ تر ہو گیا تھا، آپ نے فرمایا:۔ پھر تم نے اُس بھیگے ہوئے غلّہ کو ڈھیر کے اوپر کیوں نہیں ڈالا تاکہ خریدار تمھارے غلّہ کے گیلے پن کو دیکھ سکتا۔

اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا:۔

مَنْ غَشَّ فَلَیْسَ مِنِّی ــــــــ (رواہ مسلم۔مشکوٰۃ)

جو کوئی (کاروبار میں ایسا) دھوکا کرے، وہ میرا نہیں (اور میرا اُس

سے کوئی تعلق نہیں )۔

اسی طرح جو لوگ اسلام کے سکھائے ہوئے شریفانہ آدابِ معاشرت کی پابندی نہ کریں، اُن کے متعلق بھی فرمایا گیا ہے کہ وہ ہم میں سے نہیں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی مشہور حدیث ہے:۔

لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يَعْرِفْ شَرَفَ كَبِيْرِنَا ۔

جو ہمارے چھوٹوں کے ساتھ ترحّم وشفقت سے اور بڑوں کے ساتھ ادب واحترام سے پیش نہ آئے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

**(لابی داؤد والترمذی)**

ابھی اوپر شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ جن چیزوں کے متعلق حضورؐ نے یہ فرمایا کہ:۔ جو یہ نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے، اس کا کم سے کم درجہ واجب کا ضرور ہے۔ پس اس حدیث کی رو سے چھوٹوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ، اور بڑوں کے ساتھ ادب اور عظمت کا برتاؤ گویا ہمارے دینی اور شرعی واجبات میں سے ہے، حالانکہ یہ ایک خالص معاشرتی مسئلہ ہے۔

معاشرت کا اصل اصول یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کی دل آزاری سے بچا جائے اور اُن کا حق ادا کرنے کی اور (شریعت کے حدود میں رہتے ہوئے) اُن کو خوش کرنے اور خوش رکھنے کی اور ان کے حق کے مطابق اُن کو آرام پہنچانے کی پوری کوشش جائے، اس معاملہ میں اسلام کا جو منشا اور جو نقطۂ نظر ہے اُس کا کچھ اندازہ اِس حدیث سے کیا جا سکتا ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے، کہ:۔

''جب تین آدمی ایک جگہ بیٹھے ہوں تو ایک کو تنہا چھوڑ کر اُن میں سے دو الگ باتیں نہ کریں (ممکن ہے اِس سے اُس کا دل دُکھے، اور وہ آزردہ ہو) بلکہ جب کوئی چوتھا آجائے جو اُس کے پاس بیٹھا رہ سکے تو یہ دونوں الگ ہو کر اپنی باتیں کر لیں''۔

لیکن آج ہمارا حال یہ ہے کہ دوسروں کی دل آزاری میں ہمیں لذت آتی ہے،

اللہ تعالیٰ ہماری اس بیماری کی اصلاح فرمائے، شاید ہم لوگ سب سے زیادہ اس کے مریض ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان کامل نہیں ہوسکتا، اور ہماری زندگی اسلامی زندگی نہیں بن سکتی، جب تک کہ اپنے معاملات اور اپنی معاشرت کو بھی درست نہ کریں۔

اخلاق کی طرح معاملات اور معاشرت کے متعلق بھی یہاں صرف اسی قدر پر اکتفا کیا جاتا ہے، ان دونوں شعبوں میں اسلام کی تفصیلی تعلیمات کافی حد تک ''اسلام کیا ہے؟'' میں بھی لکھی جاچکی ہیں وہاں سے معلوم کی جاسکتی ہیں۔

اس سے زیادہ تفصیل کے لئے حدیث کے مجموعوں کی طرف رجوع کیا جائے۔

..................

# دین کی خدمت ونصرت

## نبوت ختم ہوگئی مگر کارِ نبوت باقی ہے
## اور اب قیامت تک کے لئے
## اس کی ذمہ داری امتِ محمدیؐ پر ہے

جیسا کہ شروع ہی میں تفصیل سے بتایا جاچکا ہے ''دینِ اسلام'' اُس صالح طریقِ زندگی اور اس خداوندی ہدایت کا نام ہے جس کا پیغام انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بندوں کو پہنچتا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں نبیوں کے دو کام تھے:

ایک وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے اِس طریقِ زندگی اور اِس ہدایت کا علم حاصل کرنا۔

اور دوسرے اِس علم وہدایت کو بندوں تک پہنچانا، بتانا سکھانا اور اُن کو اِس پر چلانے کی کوشش کرنا۔

ان میں سے پہلا کام تو سلسلۂ نبوت ختم ہونے کے ساتھ ختم ہوگیا، ختمِ نبوت کا مطلب ہی یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد اللہ کی طرف سے اب کسی کو یہ مقام ومنصب عطا نہیں فرمایا جائے گا کہ وحی کے ذریعہ اُس پر دین وشریعت کے احکام نازل ہوں اور اُس کو نبی مان کر اُس کی اطاعت وپیروی کرنا لوگوں کے لئے ضروری ہو۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی اُس ہدایت وشریعت نے جو قیامت تک پیدا ہونے والے سب انسانوں کی رہنمائی کے لئے کافی ہے، اور جس کے آخری زمانہ تک محفوظ رہنے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے انتظام بھی کردیا گیا ہے، اِس ضرورت کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا۔

لیکن سلسلۂ نبوت کا دوسرا کام (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی اِس ہدایت وشریعت کو

بندوں تک پہنچانا اور اُن کو اِس پر چلانے کی کوشش کرنا) باقی اور جاری ہے اور امت محمدیؐ کا یہ خاص شرف ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نیابت میں وہ اِس مقدس مشن کو قیامت تک جاری رکھنے اور اس کارِ نبوت کو انجام دینے کی ذمہ دار ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے مکہ معظمہ میں یہ کام دعوت و تبلیغ سے شروع کیا تھا۔ لوگوں کو آپ اللہ کی طرف اور اُس کے دین کی طرف بُلاتے تھے، اِس راستہ پر یہ آپ کا پہلا قدم تھا، پھر جب اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اُس کے کچھ بندوں نے آپ کی ایمانی دعوت کو قبول کرلیا اور اپنے لئے اُس دینِ حق اور اُس صالح طریقِ زندگی کا فیصلہ کرلیا جس کی طرف آپ دعوت دیتے تھے، تو ابتدائی دعوت و تبلیغ کے ساتھ ان اہلِ ایمان کی تعلیم و تربیت اور تزکیہ وارشاد اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے کام کا اور اضافہ ہوگیا۔ پھر ایک وقت آیا کہ ہدایت وارشاد کے اس مقدس مشن کی حفاظت اور اس کو آگے بڑھانے کے لئے اور اللہ کے زیادہ سے زیادہ بندوں کو ایمان و عمل صالح کی دولت سے بہرہ مند کرنے کے لئے اُن باطل کوش مخالف طاقتوں سے نمٹنا ضروری ہوگیا جو اللہ کے نور کی اس شمع کو زبردستی بُجھا دینا چاہتی تھیں، یا اس کے راستہ میں مزاحم ہوتی تھیں، اُس وقت اس مقدس مہم کے پروگرام میں جہاد و قتال کا بھی اضافہ ہوگیا، اور پھر زمانہ کی رفتار کے ساتھ یہ سارے کام بھی روز بروز بڑھتے ہی گئے۔ جو لوگ آپ کی دعوت قبول کرتے تھے اُن کو آپ دین کے بنیادی اصول و احکام بتلانے کے ساتھ اس کی بھی تلقین فرماتے تھے کہ دین کی دعوت و خدمت اور اللہ کے بندوں کی اصلاح و ہدایت کا جو کام اور اس راستہ میں جو جدوجہد میں کررہا ہوں تمھیں بھی اپنے حالات و امکانات کے مطابق اس میں میرا ساتھ دینا ہے اور اس کام کو اپنا کام بنانا ہے۔ جب تک آپ اس دنیا میں رونق افروز رہے، امت آپ کی زیرِ قیادت، ہدایت وارشاد اور دین کی خدمت و نصرت کی اس پیغمبرانہ مہم میں اپنے جان و مال سے پوری طرح آپ کی شریک و رفیق رہی، دعوت و تبلیغ، تعلیم و تربیت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے میدانوں میں اور جہاد و قتال کے معرکوں میں آپ کے زیرِ ہدایت اپنا یہ فرض ادا کرتی رہی، پھر جب آپ اس عالَم سے دوسرے عالَم کی طرف تشریف لے گئے تو اس پوری مقدس مہم کو اسی طرح جاری رکھنا اور اُس

کے تمام شعبوں کے تقاضوں کو انجام دیتے رہنا بطور نیابت اِس امت ہی کا فریضہ ہو گیا، اوراب قیامت تک کے لئے خدمتِ دین ونصرتِ دین کے ان سب شعبوں میں آپ کی امت ہی آپ کی قائم مقام اور مسئول و جوابدہ ہے۔

اس کام کی اہمیت وفضیلت کے لئے اگرچہ یہی کافی ہے کہ یہ دراصل پیغمبرانہ کام اور کارِ نبوت کی نیابت ہے لیکن پھر بھی اس بارے میں قرآن وحدیث کے بعض تاکیدی اور ترغیبی نصوص یہاں ذکر کر دینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

## دین کی خدمت ونصرت کے مختلف شعبے اور مختلف صورتیں

جیسا کہ اوپر کی سطروں سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا، اس کام کے مختلف شعبے ہیں، دعوت وتبلیغ، تعلیم وتزکیہ، امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور قتال فی سبیل اللہ۔ ''دین کی نصرت'' کا لفظ (جس کے معنی ہیں دین کی مدد) اور اسی طرح ''جہاد'' اور ''جہد'' کا لفظ (جس کے معنی ہیں کسی مقصد کے لئے پوری محنت وکوشش) اپنے اصل معنی کے لحاظ سے خدمت دین کے ان سب شعبوں پر حاوی ہیں، اور قرآن مجید میں یہ دونوں لفظ بکثرت اسی عام معنی میں استعمال ہوئے ہیں، اور بعض مقامات پر نصرتِ دین کی آخری مخصوص شکل یعنی قتال فی سبیل اللہ کے لئے بھی استعمال ہوئے ہیں۔

## قرآن مجید میں نصرتِ دین اور جہاد فی سبیل اللہ کی عمومی تاکید وترغیب

پہلے ہم چند وہ آیتیں پیش کرتے ہیں جن میں دین کی مطلق خدمت ونصرت اور دین کے لئے جد وجہد کی بطور عموم تاکید کی گئی ہے یا ترغیب دی گئی ہے، خواہ وہ کسی طور پر اور کسی شکل میں ہو۔ اِس کے بعد ہم وہ آیتیں پیش کریں گے جن میں خدمتِ دین کے خاص خاص شعبوں کے لئے تاکید فرمائی گئی یا ترغیب دی گئی ہے۔ پہلے قسم اوّل کی آیتیں سُنئے!:

سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوا ہے:۔

يَا اَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُو اللّٰهَ وَابْتَغُوا اِلَيْهِ الْوَ سِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِىْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ٥ ——— (مائدہ۔ع۔۶)

اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور اُس کے (قرب و رضا کا) ذریعہ تلاش کرو (یعنی ایسے عمل کرو جن سے اُس کی رضا حاصل ہو، اور اِس سلسلہ کا خاص خاص عمل یہ ہے کہ) اس کے دین کی راہ میں جدوجہد کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔

اور سورۂ حج کے آخر میں ارشاد ہے:۔

وَجَاهِدُوا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ط هُوَاجْتَبٰكُمْ وَمَاجَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ط مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ ط هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِىْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ——— (سورۂ حج۔ع۱۰)

اور جدوجہد کرو، اللہ کی راہ میں اور اُس کے دین کے راستہ میں جیسی جدوجہد کا اُس کا حق ہے، (اے اُمتِ محمدؐ) اللہ نے تم کو اِس خدمت کے لئے چنا ہے، طریقہ ہے تمھارے باپ ابراہیمؑ کا، اس نے تمھارا نام مسلم رکھا ہے، اِس (کتاب قرآن مجید) میں، اوراس سے پہلے (والی کتابوں میں) تو ایسا ہو کہ رسول تو تمھارا نگراں و معلّم ہو، اور (رسول سے دین کی تعلیم و تربیت پا کے) تم باقی دنیا کے نگراں و معلم بنو۔

اور سورۂ صف میں ارشاد ہوا ہے:۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ٥ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ط ذَالِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ٥ يَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِىْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ط ذَالِكَ الْفَوْزُ

الْعَظِيْمُ o وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ط نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ o يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ط قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۔ (سورۂ صف۔ ع ۲)

اے ایمان والو! کیا میں تمھیں ایک ایسا کاروبار بتادوں جو دردناک عذاب سے تمھیں نجات دلا دے؟ (سنووہ یہ ہے کہ) تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر (اور اپنے اس ایمان کے مطالبوں کو ادا کرکے اپنے حقیقی مومن ہونے کا ثبوت دو) اور اپنے جان ومال سے اللہ کے راستہ میں اور اُس کے دین کے لئے جدوجہد کرو، یہ تمھارے لئے سراسر خیر ہے اگر تم کو حقیقت کا علم ہو (تم نے اگر ایسا کیا) تو اللہ تمھارے گناہ بخش دے گا اور تم کو بہشت کے اُن باغات میں پہنچادے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، اور سدا بہار جنتوں کے نہایت نفیس مکانات میں تمھیں بسائے گا، یہ عظیم الشان کامیابی ہے (اور آخرت کی اس جنت اور کامیابی کے علاوہ اور اُس سے پہلے) ایک دوسری نعمت بھی تم کو عطا کرے گا جس کی تمھیں چاہت ہے (اور وہ ہے) دشمنوں کے مقابلہ میں اللہ کی مدد اور قریبی فتح، اور اے پیغمبر آپ ایمان والے بندوں کو اس کی خوشخبری سنا دیجئے۔ اے ایمان والو! ہو جاؤ اللہ کے مددگار، جیسا کہ عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا تھا کہ کون ہیں میری مدد کرنے والے اللہ کے راستے میں؟ تو حواریوں نے کہا ہم ہیں اللہ کے انصار، اور اس کے راستہ میں آپ کے مددگار۔

سورۂ صف کی اِن آیتوں کے آخر میں اس اُمت کے اہلِ ایمان کو "کُوْنُوْا اَنْصَارَ اللّٰہ" کے دلنواز نعرے کے ذریعہ دین کی نصرت اور مدد کا حکم اور اُس کی ترغیب دیتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پکار "مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہ" اور حواریوں کے جواب "نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہ" کا

ذکر جس طرح کیا گیا ہے اُس سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ ان آیتوں میں جس جہاد اور نصرت کی اہلِ ایمان کو دعوت وترغیب دی گئی ہے اُس سے مُراد خاص جہاد بالسّیف ہی نہیں ہے، بلکہ دین کی عام کوشش اور مدد مُراد ہے، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام اور اُن کے حواریوں کے متعلق یہ معلوم ومسلّم ہے کہ انھوں نے کبھی بھی جہاد بالسیف نہیں کیا، اُن کا جہاد دعوت وتبلیغ، تعلیم وتزکیہ اور اصلاح وارشاد کی راہ میں تکلیفیں اُٹھانا اور مصیبتیں سہنا ہی تھا۔

بہرحال قرآن مجید کی ان سب آیتوں میں اہلِ ایمان کو جہاد یا نصرت کے لفظ سے دین کی جدوجہد اور خدمت ونصرت کی جو دعوت دی گئی ہے اُس میں ہروہ سعی وکوشش اور ہروہ محنت وخدمت اور ہروہ قربانی داخل ہے جو دین کے فروغ کے لئے اور اللہ کے بندوں کی اصلاح وہدایت کے لئے کی جائے، خواہ وہ تبلیغ ودعوت کی شکل میں ہو یا تعلیم وتربیت کی شکل میں، یا جنگ وقتال کی صورت میں۔

## دین کی جدوجہد اور خدمت ونصرت کے خاص خاص شعبوں کی تاکید وترغیب

اس کے بعد وہ چند آیتیں بھی سُن لیجئے جن میں دینی جدوجہد اور دین کی خدمت ونصرت کے مختلف شعبوں اور اس کی مختلف صورتوں میں سے کسی خاص شعبہ اور کسی خاص صورت کی اہلِ ایمان کو دعوت وترغیب دی گئی ہے، یا ہدایت وتاکید فرمائی گئی ہے۔

## دعوتِ حق، امر بالمعروف ونہی عن المنکر

سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے:۔

وَلْتَكُنْ مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

(آل عمران۔ ع ۱۱)

اور ضروری ہے کہ تم میں سے ایک امت ایسی ہو جو لوگوں کو بھلائی کی طرف دعوت دے، نیکی کے لئے لوگوں سے کہے، اور بُرائی سے روکے،

اور یہ کام کرنے والے ہی فلاح یاب ہوں گے۔

اس آیت کے لفظ "مِنْکُمْ" سے شبہ ہوسکتا ہے کہ دعوت الی الخیر، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کام پوری اُمت کے ذمہ نہیں ہے، بلکہ اُس کے کسی خاص طبقہ اور خاص گروہ کو یہ کام انجام دینا ہے، اور وہی اِس کے لئے ذمہ دار ہے، لیکن ایسا سمجھنا غلط فہمی ہوگا۔ اوّلاً تو اس لئے کہ اسی آیت میں آگے فرمایا گیا ہے، کہ:۔ "اس کام کے کرنے والے ہی فلاح پانے والے ہیں"۔ اور ظاہر ہے کہ جس نیک کام پر نجات وفلاح کا انحصار ہو وہ امت کے کسی خاص طبقہ اور گروہ کا کام نہیں ہوسکتا۔ علاوہ ازیں اس آیت سے ۴۔۵ ہی آیتوں کے بعد یہ دوسری آیت ہے:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَامُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۔ (آل عمران۔ ع ۱۲)

اے پیروانِ محمدؐ! تم تمام امتوں میں بہترین امت ہو، جو لوگوں (کی اصلاح وہدایت) کے لئے ظہور میں لائی گئی ہے، تمھارا کام یہ ہے کہ نیکی کا حکم دیتے ہو، بُرائی سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اِس آیت میں اس اُمت کے ظہور کی غرض وغایت ہی یہ بتائی گئی ہے کہ اس کو ایمان باللہ کے ساتھ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور لوگوں کی اصلاح وہدایت کی خدمت انجام دینا ہے اس لئے اِن آیتوں کی رو سے اِن کاموں کی انجام دہی کی ذمہ داری تو پوری اُمت کی ہے، لیکن ان کاموں کی خاص نوعیت ایسی ہے کہ ان کی انجام دہی کے لئے اکثر حالات میں اُمّت کے ہر ہر فرد کا اِن میں لگنا ضروری نہیں ہوتا، بلکہ اِن کاموں کی اہلیت اور صلاحیت رکھنے والے لوگ بقدرِ کفایت اگر اِن کاموں میں لگ جائیں اور باقی افرادِ امت کی تائید اور تعاون ان کو حاصِل رہے تو بھی کام پورا ہو جاتا ہے۔ بہر حال اس عاجز کا خیال ہے کہ غالبًا اسی طرف اشارہ کرنے کے لئے پہلی آیت میں مِنْکُمْ کا لفظ لایا گیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ایک آیت اسی سلسلہ میں اور سُن لیجئے۔ سورۂ مائدہ میں ارشاد ہے:۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ ——— (مائدہ۔ع۱۱)

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اُن پر لعنت ہوئی اللہ کے نبی داؤد اور عیسیٰ بنِ مریم کی زبان پر، یہ اِس لئے ہوا کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حدود سے تجاوز کرتے تھے (ان کا ایک خاص گناہ جو اِس لعنت کا سبب بنا یہ تھا) کہ جو بُرائیاں وہ کرنے لگے تھے آپس میں ایک دوسرے کو اُن سے روکتے نہیں تھے (نہی عن المنکر کا فریضہ انھوں نے معطل کر رکھا تھا) اُن کا یہ بہت بُرا فعل تھا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اس درجہ کا فریضہ ہے کہ اس سے غفلت برتنے اور اس کو ترک کرنے کی وجہ سے بنی اسرائیل قابلِ لعنت ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں اِس کے ذکر کرنے کا خاص مقصد اُمتِ محمدی کو یہ آگاہی دینا ہے کہ اگر اس بارہ میں اس نے بھی وہی غفلت کی جو بنی اسرائیل نے کی تھی، تو بنی اسرائیل ہی کی طرح وہ بھی خدا کی خاص رحمت و نصرت سے محروم اور لعنت کی مستحق ہو جائے گی۔

اس موقع پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے بارے میں رسُول اللہ ﷺ کی چند حدیثیں بھی سُن لی جائیں:

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ اَوْلَيُوْشِكَنَّ اللّٰهُ اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ عِنْدِهٖ، ثُمَّ لَتَدْعُنَّهٗ وَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ ——— (رواہ الترمذی)

قسم اُس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے رہو، اور اگر ایسا نہیں کرو گے، تو ضرور ایسا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی طرف سے کوئی عذاب بھیجے، پھر تم (اس عذاب سے نجات کے لئے) اُس سے

دُعائیں کرو گے، اور تمھاری دعائیں قبول نہ ہوں گی۔

دراصل رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث اسی اشارے کی تفصیل اور وضاحت ہے جو مائدہ کی مذکورہ بالا آیت سے مفہوم ہوتا ہے۔

اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

مَنْ رَأَى مِنكُمْ مُنكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ۔ (رواہ مسلم)

تم میں سے جو شخص کوئی بُرا عمل ہوتے دیکھے تو (اگر اپنی طاقت وقوت سے اُس برائی کو نیکی سے بدل سکتا ہو تو) وہ اپنی طاقت استعمال کر کے اس تبدیلی کی کوشش کرے، اور اگر اس کی طاقت نہ ہو تو اپنی زبان سے اس کی کوشش کرے، اور اگر یہ بھی نہ کرسکتا ہو تو پھر دل ہی سے کرے (یعنی دل ہی سے اس کو بُرا سمجھے، اور اس کی اصلاح کے بارے میں سوچتا رہے) اور یہ آخری صورت ایمان کے سخت ضعف کے وقت ہوگی۔

اور حضرت جریر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

مَامِنْ رَجُلٍ يَكُوْنُ فِيْ قَوْمٍ يَعْمَلُ فِيْهِمْ بِالْمَعَاصِيْ يَقْدِرُوْنَ عَلٰى أَنْ يُغَيِّرُوْا عَلَيْهِ وَلَا يُغَيِّرُوْنَ إِلَّا أَصَابَهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابٍ قَبْلَ أَنْ يَّمُوْتُوْا ـــــــــــ (رواہ ابوداؤد وابن ماجہ)

جو شخص کسی قوم میں رہتا ہو اور ان کے اندر رَہ کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کرتا ہو، اور وہ لوگ اس کے اس طرز عمل کے بدلنے کی قدرت رکھتے ہوں لیکن اس کے باوجود نہ بدلیں تو اللہ تعالیٰ مرنے سے پہلے دنیا ہی میں ان کو اپنے عذاب میں مبتلا کرے گا۔

## تبلیغ، تعلیم وتربیت، اصلاح وارشاد

اس کے بعد چند آیتیں اور حدیثیں، دعوت وتبلیغ، تعلیم وتربیت اور اصلاح

وارشاد کے بارے میں بھی سُن لی جائیں:۔

سورۂ حٰم سجدہ میں ارشاد فرمایا گیا:۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ وَصَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ـــــــــــ (حٰم سجدہ۔ع۔۵)

اور کون زیادہ اچھا ہوسکتا ہے بات میں اُس شخص سے جس نے بُلایا اللہ کی طرف، اور نیک عمل کیا ، اور کہا کہ میں اللہ کے فرمانبرداروں میں سے ہوں۔

یعنی اللہ کے نزدیک سب سے اچھی بات اُس بندے کی ہے جو ایمان و عمل صالح کا ذاتی سرمایہ رکھنے کے ساتھ اللہ کے دوسرے بندوں کو بھی اس کی طرف بُلاتا ہو اور اُن کی اصلاح کی کوشش کرتا ہو۔

اور سورۂ العصر میں فرمایا:۔

وَالْعَصْرِ o اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ o اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحَاتِ وَتَوَاصَوْ بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْبِالصَّبْرِ o

زمانہ کی گردش کی قسم، سارے انسان خسارے میں ہیں، خسارے سے بچنے والے اور فلاح پانے والے صرف وہ بندگانِ خدا ہیں جو ایمان لائیں، نیک اعمال کریں، اور راہِ حق پر چلنے کی اور نفس کو بُری خواہشوں سے تھامے رکھنے کی ایک دوسرے کو وصیت اور نصیحت کریں۔

"تَوَاصَوْ بِالْحَقِّ" اور "تَوَاصَوْ بِالصَّبْرِ" ہدایت وارشاد کا ایسا جامع عنوان ہے جس میں تبلیغ ودعوت، تعلیم وتربیت، اور اصلاح وارشاد کی سب ہی صورتیں آجاتی ہیں۔

ان قرآنی آیتوں کے بعد رسول اللہ ﷺ کی دو چار حدیثیں بھی سُن لیجئے۔

حضرت سہل بن سعدؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

واللّٰہِ لَاَنْ یّھدِیَ اللّٰہُ بِکَ رَجُلًا خَیْرٌ لَکَ مِنْ حُمُرِ النَّعَمِ ـــــــــــ (ابوداؤد)

قسم اللہ کی کسی ایک آدمی کا تمھارے ذریعہ ہدایت پا جانا تمھارے لئے (نہایت قیمتی قسم کے) سُرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔

اور حضرت ابو مسعود انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا:۔

مَنۡ دَلَّ عَلٰی خَیۡرٍ فَلَهٗ مِثۡلُ اَجۡرِ فَاعِلِهٖ ـــــــــــ (رواہ مسلم)

اللہ کا جو بندہ کسی دوسرے بندے کو کسی نیک عمل کی رہنمائی کرے تو اس بتانے والے کو بھی کرنے والے کے برابر ثواب ہے۔

اور حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

هَلۡ تَدۡرُوۡنَ مَنۡ اَجۡوَدُ جُوۡدًا قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ اَعۡلَم، قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی اَجۡوَدُ جُوۡدًا ثُمَّ اَنَا اَجۡوَدُ بَنِیۡ اٰدَمَ وَ اَجۡوَدُهُمۡ مِنۡ بَعۡدِیۡ رَجُلٌ عَلِمَ عِلۡمًا فَنَشَرَهٗ یَاۡتِیۡ یَوۡمَ الۡقِیَامَةِ اَمِیۡرًا وَحۡدَهٗ اَوۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً ـــــــــــ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

کیا تم جانتے ہو کہ جود وسخا میں کون سب سے بڑھا ہوا ہے؟۔ صحابہؓ نے عرض کیا، کہ:۔ اللہ اور اُس کے رسول ہی کو خبر ہے۔ آپ نے فرمایا، کہ:۔ جود وسخا میں سب سے اعلیٰ اور بالا تو اللہ تعالیٰ ہیں، پھر اس کے بعد جود وسخا میں میرا درجہ ہے، اور میرے بعد اُس شخص کا درجہ ہے جس نے اللہ کی ہدایت کا علم حاصل کیا، پھر اس کو پھیلانے اور دوسروں تک پہنچانے میں جدوجہد کی، ایسا شخص قیامت کے دن سردار اور حاکم بن کر آئے گا (یا فرمایا کہ یہ اکیلا شخص ایک اُمّت بن کر آئے گا)۔

ایک حدیث اِسی سلسلہ میں اور بھی سُن لی جائے۔ عبدالرحمٰن بن ابزیٰ راوی ہیں:۔

خَطَبَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ یَوۡمٍ فَاَثۡنٰی عَلٰی طَوَائِفَ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ خَیۡرًا ثُمَّ قَالَ مَابَالُ اَقۡوَامٍ لَا یُفَقِّهُوۡنَ جِیۡرَانَهُمۡ وَلَا یُعَلِّمُوۡنَهُمۡ وَلَا یَعِظُوۡنَهُمۡ وَلَا یَاۡمُرُوۡنَهُمۡ وَلَا یَنۡهَوۡنَهُمۡ. وَمَا بَالُ اَقۡوَامٍ لَا یَتَعَلَّمُوۡنَ مِنۡ

جِيْرَانِهِمْ وَلَا يَتَفَقَّهُوْنَ وَيَتَّعِظُوْنَ وَاللّٰهِ لَيُعَلِّمَنَّ قَوْمٌ جِيْرَانَهُمْ وَيُفَقِّهُوْنَهُمْ وَيَعِظُوْنَهُمْ وَيَأْمُرُوْنَهُمْ وَيَنْهَوْنَهُمْ وَلَيَتَعَلَّمَنَّ قَوْمٌ مِنْ جِيْرَانِهِمْ وَيَتَفَقَّهُوْنَ وَيَتَّعِظُوْنَ اَوْلَا عَاجِلَنَّهُمُ الْعُقُوْبَةَ ——————— (رواہ الطبرانی فی الکبیر (جمع الفوائد)۔

ایک دن رسول اللہ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں مسلمانوں کے بعض گروہوں اور قبیلوں کی (ان کی کارگردگی اور خدمت کی بناپر) تعریف فرمائی۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا بعض دوسرے گروہوں اور قبیلوں کا یہ کیا حال ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں میں دین کی سمجھ اور اس کا شعور پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے، اور نہ ان کو تعلیم دیتے ہیں، اور نہ نصیحتیں کرتے ہیں، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض بھی وہ ادا نہیں کرتے (اس کے بعد آپ نے روئے سخن بدلتے ہوئے فرمایا) اور بعض گروہوں کا یہ کیا حال ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں سے دین کا علم اور اس کا فہم وشعور حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے، اور نہ وہ اُن سے نصیحتیں لینے کے لئے جاتے ہیں۔ خدا کی قسم (دین کا علم اور دین کی سمجھ رکھنے والے) ہر گروہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کی تعلیم کا اہتمام کرے، اور ان میں دین کی سمجھ پیدا کرنے کی کوشش کرے اور اُن کو وعظ ونصیحت کیا کرے، اور بُری باتوں سے ان کو روکا کرے، اور اچھی باتوں کے لئے ان سے کہا کرے۔ اور اسی طرح (جن گروہوں میں علم دین نہ ہو) ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے علم رکھنے والے پڑوسیوں سے علم حاصل کیا کریں، اور نصیحت لیا کریں، اور دین کو سمجھنے کی کوشش کیا کریں۔ (بہر حال جاننے والوں کے لئے نہ جاننے والوں کو بتانا اور نہ جاننے والوں کے لئے جاننے والوں سے سیکھنا ان کے

دینی فرائض میں سے ہے، اور ہر گروہ کو چاہئے کہ وہ اپنا یہ فرض ادا کیا کرے) اور اگر کسی گروہ نے اپنے اس فریضہ کی ادائیگی میں غفلت اور کوتاہی کی، تو میں ان کو جلدی سخت سزا دلواؤں گا۔

اس حدیث سے یہ بات بہت وضاحت کے ساتھ معلوم ہوگئی کی دین کی تبلیغ اور ناواقفوں کی تعلیم وتربیت اور اصلاح وارشاد کے بارے میں اس اُمت کی ذمہ داری کیا ہے، اور اگر وہ اس ذمہ داری کو ادا نہ کرے، تو اللہ اور رسول کے نزدیک وہ کتنے بڑے جُرم کی مرتکب ہے۔

اُمت کی اسی عام ذمہ داری کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک بہت مختصر اور مشہور جملہ میں اس طرح ادا فرمایا ہے:۔ اَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ [1]۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک اپنے حلقہ کا نگراں ہے، اور ہر ایک کو اپنے زیر نگرانی حلقہ کی بابت خدا کے سامنے جواب دہی کرنا ہے۔

ان آیتوں اور حدیثوں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ دین کی خدمت ونصرت کے ان شعبوں اور ان شکلوں یعنی تبلیغ ودعوت، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، تعلیم وتربیت اور اصلاح وارشاد کی اس امت پر کتنی عظیم ذمہ داری ہے، اور اس کے بارے میں اللہ ورسول کی طرف سے کتنی سخت تاکید ہے، اور اس کام کے کرنے والوں کا کیا مقام اور کتنا بلند درجہ ہے اور اس میں غفلت اور سستی کرنے والے کتنے معتوب اور اس کو بالکل چھوڑ دینے والے کتنے ملعون اور مغضوب ہیں۔

## قتال فی سبیل اللہ

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، دین کی خدمت ونصرت کی ایک خاص شکل اور اس کا ایک خاص شعبہ قتال فی سبیل اللہ بھی ہے، اس کے بارے میں آیات واحادیث سننے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ جنگ وقتال اپنی ذات سے ہرگز کوئی اچھی چیز نہیں ہے، لیکن جس طرح کسی بیماری کے علاج کے لئے جس میں انجکشن کی سوئی بھونکی جاتی ہے، اور جس

---

[1] رواہ البخاری۔ مشکوٰۃ شریف کتاب الامارۃ۔

طرح آنکھ میں روشنی لانے کے لئے آنکھوں کا بھی آپریشن کیا جاتا ہے، یا جسم کے کسی سڑے ہوئے حصّہ کو کاٹ کر جسم سے الگ کرنا مریض کے ساتھ خیر خواہی سمجھا جاتا ہے، اسی طرح جب کسی بڑے فتنہ وفساد کو روکنے، اور کسی ظلم وشرارت سے اللہ کے بندوں کی حفاظت کرنے کے لئے یا اللہ کے اور اس کے بندوں کے درمیان حائل ہونے والی یا ایمانی اور اصلاحی دعوت کی راہ میں مزاحمت کرنے والی کسی ظالم طاقت کا زور توڑنے کے لئے جنگ وقتال اور طاقت کا استعمال کرنا ہی ناگزیر ہو جائے اور اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہے، اور طاقت کے استعمال سے اصلاح حال کی پوری اُمید ہو، تو اللہ کا دین اسلام اور اس کا مقدس صحیفہ قرآن مجید خاص شرائط کے ساتھ جہاد وقتال کی اجازت بلکہ اس کا حکم، اللہ اور رسول پر ایمان لانے والے اُن بندوں کو دیتا ہے جو اس کے ضروری وسائل اپنے پاس رکھتے ہوں اور اس کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے اہلِ ہوں۔

## جہاد کے بارے میں غلط فہمی کی بنیاد

جہاد کے بارے میں غلط فہمی بہت سوں کو دراصل اس سے ہوتی ہے کہ ناواقفی سے اس کا مطلب ''مسلمانوں کی قومی جنگ'' سمجھا جاتا ہے، حالانکہ اسلام اور قرآن نے ہر قومی جنگ کو حرام قرار دیا ہے، کسی قتال کو ''شرعی اور اسلامی جہاد'' جب ہی کہا جا سکتا ہے، جبکہ وہ محض اللہ کے لئے اور اُس کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے اُس کی رضا اور جنّت کی طلب اور شوق میں ہو، اور ان اخلاقی شرائط اور دینی حدود کی پابندی کے ساتھ ہو، جو اسلام نے اس کے لئے مقرر کی ہیں۔

پس جو جنگ قوم پرستانہ نقطۂ نظر سے خالِص دنیوی اور مادّی مقاصد کے لئے کی جائے جیسا کہ مادہ پرستی کے اس دور میں عام طور سے ہوتا ہے تو خواہ اس کے کرنے والے مسلمان ہی ہوں دین وشریعت کی اصطلاح میں اس کو ہرگز جہاد نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ اسلام کی نگاہ میں وہ فساد ہوگا، اور اس کے علمبردار، مجاہدین نہیں بلکہ اللہ کی نگاہ میں مجرمین اور مفسدین فی الارض ہوں گے۔

## جہاد کے بارے میں قرآنی آیات

## اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات

جہاد کی اس حقیقت کو ذہن میں رکھ کر اب اس کے بارے میں قرآن مجید کی چند آیتیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ حدیثیں سُنئے:۔

پہلے سورۂ حج کی وہ آیت سُنئے، جس کے ذریعہ سب سے پہلے مسلمانوں کو جہاد کی اجازت ملی، اور اس کا حکم دیا گیا تھا:۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ط وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۞ اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ط ——— (سورہ الحج۔ ع ٦)

جن اہلِ ایمان کے خلاف ایمان کے دشمن ظالموں نے جنگ قائم کر رکھی ہے اب اُن کو بھی (مسلح مقابلہ کی) اجازت دی جاتی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں، اور اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے۔ یہ وہ مظلوم بندے ہیں جو ناحق صرف اس جرم میں اپنے گھروں سے نکالے گئے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب صرف ایک اللہ ہے۔

اس کے بعد ظلم اور زور دستی کی مدافعت کی حکمت اور مصلحت اور حق کی حمایت کرنے والوں کی نصرت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی ازلی سنت بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے کہ (یہ مظلوم بندے جن کو مسلح مقابلہ اور مقاتلہ کی اجازت دی جارہی ہے، ان کے بارے میں اللہ کو علم ہے، کہ)۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔ (الحج۔ ع۔ ٦)

یہ ایسے ہیں کہ اگر ہماری طرف سے ان کو زمین پر حاکمانہ اقتدار بخشا

جائے، تو وہ نمازیں قائم کریں گے، زکوٰۃ اَدا کریں گے، اور نیکیوں کے احکام جاری کریں گے، اور بُرائیوں کو روکیں گے، اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔

## سورۃ الحج کی اِذنِ جہاد والی آیتوں کے دو خاص نکتے

سُورۂ حج کی ان آیتوں سے دو باتیں بہت صفائی کے ساتھ معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ مسلح جہاد وقتال کی اجازت اور اس کے حکم کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اُن ظالموں کا زور توڑ دیا جائے جو دعوت حق اور نیکی کی راہ میں حائل ہوتے ہیں، اور اللہ کے بندوں کو اس کے راستے پر چلنے سے روکتے اور ان کو طرح طرح سے ایذائیں دیتے اور ستاتے ہیں، اور اختیار واقتدار اُن کے ہاتھوں میں آجائے جو خدا شناس اور خدا پرست ہوں، نیکیوں اور بھلائیوں کو رواج دینے والے اور منکرات وفواحش سے لوگوں کو روکنے والے ہوں، اور ظاہر ہے کہ جب حالات ایسے ہوں کہ یہ مقصد طاقت کے استعمال کے بغیر حاصل نہ ہو سکے، تو اس کے لئے طاقت کا استعمال اور جان ومال کی قربانی انسانیت کے حق میں کتنی بڑی نیکی ہوگی۔

دوسری بات اِس آیت سے یہ معلوم ہوئی کہ مسلمانوں کا جو گروہ جہاد وقربانی کی اِس مقدس راہ میں قدم اُٹھائے، اس کو خدا پرستی میں ایسا مخلص اور اتنا پختہ اور تربیت یافتہ ہونا چاہیے، کہ جب اس جدوجہد کے نتیجے میں اس کو دنیا کے کسی حصے میں اقتدار وحکومت حاصل ہو جائے، تو وہ حکومتی وسائل کو اپنی نفسانی خواہشات اور دنیادی تمنائیں پورا کرنے کے بجائے خدا پرستی اور نیکی پھیلانے میں اور ہر قسم کی برائیوں اور خباثتوں سے دنیا کو پاک کرنے میں لگائے، اور حکومت اور اُس کے خزانے ہاتھ آجانے کے بعد بھی خدا کی عبادت اور دنیا کی اصلاح ہی اس کا خاص مشغلہ اور نصب العین رہے۔

افسوس ہے کہ ہمارے اس زمانہ میں مسلمانوں نے، خاص کر مسلمانوں کے اُس طبقہ نے جس کے ہاتھوں میں اس وقت اسلامی ملکوں کا نظامِ حکومت وسیاست ہے، اس حقیقت کو بالکل فراموش کر دیا ہے، آج ان کو اور اُن کے فوجی افسروں اور عام سپاہیوں کو دیکھ کر کسی طرح بھی یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا، کہ ان کو اسلام کے اس نصب العین سے کچھ بھی تعلق ہے۔

## سورۂ توبہ کی ایک آیت میں مجاہدین کے اوصاف

اس کے بعد سورۂ توبہ کی بھی ایک آیت سُن لیجئے، جس میں مجاہدین فی سبیل اللہ کی فضیلت اوران کے لئے جنت کی خاص بشارت کے ساتھ اُن ایمانی اوصاف کا بھی کچھ تفصیل سے ذکرکیا گیا ہے، جواُن میں ہونے چاہئیں:۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ط یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرٰاۃِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ط وَمَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ ط وَذٰلِکَ ھُوَالْفَوْزُالْعَظِیْمُ o اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاھُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِوَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰہِ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ——————— (توبہ۔ع۔۱۴)

یقیناً اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے اُن کی جانیں اوراُن کا مال اِس قیمت پرخرید لیا ہے کہ مومنین کے لئے جنت ہے (اَب جبکہ وہ اپنی جانوں کا سَودا خدا سے کر چکے، اورسب کچھ خدا کے ہاتھ بیچ چکے، تو) اُن کی شان یہ ہے کہ وہ (اپنے کسی دنیاوی مقصد کی خاطر نہیں، بلکہ) اللہ ہی کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، پس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ (اِن جاں فروش اہلِ ایمان کے لئے اللہ طرف سے جنت ورحمت کا وعدہ ہے) وعدہ ہے اللہ کے ذمہ جو ثابت اور مقرر ہے (اللہ کی تینوں مشہور مقدس کتابوں) توراۃ، انجیل اورقرآن میں، اوراللہ سے زیادہ اپنے وعدے کا پورا کرنے والا کون ہوسکتا ہے (پس اے ایمان والو!)

اپنے اس سودے پر جو تم نے (اپنے جان و مال کا) خدا سے کیا ہے، خوشیاں مناؤ، یہ تمھاری بہت ہی بڑی کامیابی اور فیروز مندی ہے (اللہ کی راہ میں جنگ کرنے والے ان اہلِ ایمان کے اوصاف اور ان کی نشانیاں یہ ہیں) یہ اپنی خطاؤں اور قصوروں سے توبہ کرنے والے ہیں، عبادت میں سرگرم رہنے والے ہیں، اللہ کی حمد و ثنا کرنے والے ہیں (اللہ کے لئے اور اس کے دین کے لئے، ملک بہ ملک قریہ بہ قریہ اور در بدر) پھرنے والے ہیں، رکوع اور سجود کے ذریعہ اللہ کے حضور میں اپنی بندگی اور نیاز مندی ظاہر کرنے والے ہیں، نیکیوں کا حکم دینے والے اور برائیوں سے روکنے والے ہیں، اور اللہ کی مقرر کی ہوئی ساری حدوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، اور اے پیغمبر اِن اہلِ ایمان کو ہماری طرف سے خوشخبری سُنا دیجئے (کہ ہم نے اپنی رضا اور رحمت اور محبت و جنت اُن کے لئے لکھ دی ہے)۔

اور خدا کی راہ میں اور اُس کے دین نصرت کے لئے جان اور سر کی بازی لگانے والے ان ہی مجاہدین کے متعلق سورۃ صف میں فرمایا گیا ہے:۔

## فی سبیل اللہ جم کر قتال کرنے والے بندے اللہ کے محبوب ہیں

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ——— (صف۔ع۔۱)

بلا شبہ اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے اُن بندوں سے جو اُس کی راہ میں یعنی اس کے مقدس دین اور نازل کی ہوئی ہدایت کی خدمت و نصرت اور وفاداری میں اس طرح صف بنا کر (اور قدم جما کر) جنگ کرتے ہیں کہ گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

## راہِ خدا میں شہید ہونے والے مرتے نہیں
## بلکہ زندۂ جاوید ہو جاتے ہیں

قتال فی سبیل اللہ کی عظمت شان اور ترغیب وتاکید سے قرآن مجید کے رکوع کے رکوع بھرے ہوئے ہیں، یہاں صرف دو آیتیں اور سُن لیجئے، جن میں بتایا گیا ہے، کہ جو بندے اس راہ میں بظاہر مارے گئے ہیں اُنھیں نہ مُردہ سمجھا جائے اور نہ مردہ کہا جائے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں ایک خاص الخاص زندگی عطا ہوتی ہے، وہاں وہ انواع واقسام کی نعمتیں پاتے اور شاداں وفرحاں رہتے ہیں۔

سورۂ بقرہ میں ارشاد فرمایا گیا:۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ○ ———— (البقرہ۔ع ۱۹)

اور جو بندے راہِ خدا میں مار ڈالے جائیں ان کو مُردہ نہ کہو، بلکہ وہ (دوسرے عالَم میں خدا کے حضور میں) بالکل زندہ ہیں، لیکن تم کو اس زندگی کا یہاں شعور نہیں ہے۔

اور سورۂ آل عمران میں فرمایا گیا:۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ○ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔

(آل عمران۔ع ۱۷)

اور جو بندے اللہ کی راہ میں قتل کئے جائیں ان کو تم مرا ہوا نہ کہو بلکہ وہ (دوسرے عالم میں) اپنے مالک کے حضور میں (جس کے لئے انھوں نے جان دی ہے) زندہ ہیں، ان کو وہاں (انواع واقسام کا) رزق عطا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اُن کو جو کچھ اپنے فضل خاص سے عطا فرمایا ہے وہ اس پر شاداں وفرحاں ہیں۔

زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں حق کے نام پر
اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کر دیا

## حدیثوں میں جہاد وشہادت کی ترغیب وفضیلت

ان آیتوں کے بعد چند حدیثیں بھی قتال فی سبیل اللہ کی فضیلت وترغیب کے سلسلہ میں سن لی جائیں:۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

لَغَدْوَةٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوْرَوْحَةٌ خَیْرٌ مِنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْهَا ۔
(رواہ البخاری ومسلم)

ایک دفعہ صبح کو اللہ کے راستہ میں نکلنا یا ایک دفعہ شام کا نکلنا دنیا ومافیہا سے بہتر اور زیادہ قیمتی ہے۔

اور حضرت عبدالرحمٰن ابن جبیر انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

مَاغْبَرَّتْ قَدَمَا عَبْدٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَتَمَسَّهُ النَّارُ (رواہ البخاری)

ایسا نہیں ہوگا کہ جس بندے کے قدموں پر اللہ کے راستوں کی گرد پڑی ہو، پھر اُس کو دوزخ کی آگ چھو سکے۔

اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

اَلْقَتْلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یُکَفِّرُ کُلَّ شَیْءٍ اِلَّا الدَّیْنَ

راہِ خدا میں شہید ہونا ہر چیز کا کفارہ ہو جاتا ہے (اور ہر بوجھ سے وہ بندہ ہلکا ہو جاتا ہے) سوائے قرضے کے۔ (رواہ مسلم)

اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

مَامِنْ رَجُلٍ یَّدْخُلُ الْجَنَّةَ یُحِبُّ اَنْ یَّرْجِعَ اِلَی الدُّنْیَا وَلَهٗ مَافِی الْاَرْضِ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا الشَّهِیْدُ یَتَمَنّٰی اَنْ یَّرْجِعَ اِلَی الدُّنْیَا

فَيُقْتَلَ عَشَرَةَ مَرَّاتٍ لِمَا يَرىٰ مِنَ الْكَرَامَةِ۔ (رواہ البخاری ومسلم)

کوئی شخص جنت میں جانے کے بعد یہ نہ چاہے گا کہ وہ پھر دنیا میں واپس جائے، اگرچہ اس کو ساری زمین کی دولتیں اور نعمتیں ملیں، البتہ راہِ خدا میں شہید ہونے والا بندہ اِس کی تمنا کرے گا کہ وہ پھر دنیا میں لوٹایا جائے، اور پھر وہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے دس مرتبہ، بہ سبب اس اعزاز واکرام کے جو وہ وہاں شہادت کے صلہ میں دیکھے گا۔

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر جہاد میں اپنی شرکت کی تمنا ظاہر کرنے کے بعد ایک حدیث میں فرمایا:۔

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَوَدِدْتُّ اَنْ اُقْتَلَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ اُحْیٰ ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیٰ ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیٰ ثُمَّ اُقْتَلُ۔ (رواہ البخاری ومسلم)

قسم اُس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، میں چاہتا ہوں کہ اللہ کے راستہ میں شہید کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں۔

قتال فی سبیل اللہ کی عظمت اور اس راہ کی موت یعنی شہادت کی فضیلت معلوم کرنے کے لئے یہی ایک آخری حدیث کافی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ کو اس کی خواہش اور تمنا تھی کہ اللہ کے لئے اور اس کے دین کی وفاداری میں لڑی جانے والی ہر جنگ میں آپ بہ نفس نفیس شریک ہوں اور اعداء حق کی تلواروں سے آپ شہید ہوں، اور پھر زندہ کئے جائیں اور پھر شہید ہوں، اور پھر زندہ کئے جائیں اور پھر شہید ہوں۔۔

می خواہم زخدا بدعا صد ہزاراں جاں
تاصد ہزار بار بمیرم برائے تو

بہرحال اپنے موقع پر مقررہ حدود وشرائط کے ساتھ جہاد وقتال فی سبیل اللہ بھی کارِ نبوت یعنی دین کی خدمت ونصرت کا اسی طرح ایک شعبہ ہے جس طرح دعوت وتبلیغ، تعلیم وتزکیہ، اصلاح وارشاد، امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔ اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے

اَب اُمّتِ محمدی ہی خاتم النّبیین ﷺ کی قائم مقام اور نائب مناب ہونے کی حیثیت سے قیامت تک ان سب چیزوں کی ذمہ دار ہے۔

## امت کی طرف سے نصرتِ دین کے تمام شعبوں کی انجام دہی کا صحیح ترین نظام، خلافتِ راشدہ کا نظام تھا

امت کی طرف سے اِن کاموں کی انجام دہی کی صحیح ترین شکل تو وہ تھی جو رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد کچھ عرصہ تک ''خلافتِ راشدہ'' کی شکل میں قائم رہی، وہ پوری امت کا ایک اجتماعی نظام تھا، جس نے اپنے کو مقصد اور طریقہ کار میں رسُول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کا پوری طرح پابند کر لیا تھا۔

## وفاتِ نبویؐ کے بعد انتخابِ خلیفہ کے مسئلہ کی اصل نوعیت کیا تھی

رسُول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد اُمّت کے سامنے انتخابِ خلیفہ کا جو سوال آیا تو اس کی نوعیت، جیسا کہ ناواقفی سے بہت سے لوگ سمجھتے ہیں، کسی حکمراں بادشاہ یا کسی صدر جمہوریہ کے انتخاب کی نہ تھی، بلکہ صحابۂ کرام کے سامنے اُس وقت اصل مسئلہ یہ تھا، کہ رسُول اللہ ﷺ خلق اللہ کی ہدایت کے لئے، اور دنیا میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور اس کا دین پھیلانے کے لئے، اور دنیا کے نقشے کو اللہ کی مرضی کے مطابق بنانے کے لئے جو جدوجہد کر رہے تھے، اور اس سلسلہ میں دعوت وتبلیغ، تعلیم وتزکیہ، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، اور جہاد وقتال اور اقامتِ عدل کی قِسم کے جو مختلف النوع کام اُمت کو ساتھ لے کر انجام دے رہے تھے، اب کون ہم میں اس کے لئے زیادہ اہل ہے کہ اس کو رسُول اللہ ﷺ کا خلیفہ اور نائب خصوصی بنا کر ہم اُس کی سربراہی میں اِس مقدس جدوجہد کو اُسی طرح جاری رکھیں، اِس موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو خطبہ دیا تھا، اس کا ایک فقرہ کتابوں میں یہ بھی نقل کیا گیا ہے:۔

اَلَا اِنَّ مُحَمَّدً ا قَدْ مَاتَ وَلَا بُدَّ لِھٰذَ الدِّیْنِ مِمَّنْ یَّقُوْمُ بِہٖ۔

(مواقف، المرصد الرابع)

حضرت محمد علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا وصال ہو گیا، اور اس دین کے کاموں کے لئے کسی ایسے آدمی کا انتخاب ضروری ہے جو اس کی ذمہ داریاں سنبھالے۔

الغرض اُس وقت صحابہؓ کرام کے سامنے مسئلہ یہی تھا، کہ آپ کے فیض یافتوں میں سے کسی ایسی مناسب تر شخصیت کو منتخب کر لیں جو ان سب کاموں میں آپ کے جانشین اور خلیفہ کی حیثیت سے آپ ہی کے طرز پر اُمت کی سربراہی کرے، اور اُمّت کا قافلہ اس کی رہنمائی میں اسی طرح اس راستہ پر چلتا رہے جس پر رسول اللہ ﷺ اس کا سفر شروع کرا کر دنیا سے تشریف لے گئے ہیں [1]

خلافتِ راشدہ کے دَور میں (خاص کر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں) یہ سب کام ٹھیک اسی طرح اور اسی طرز پر ہوتے رہے جس طرح اور جس طرز پر رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہوتے تھے۔

## خلافتِ راشدہ کے بعد دین کی خدمت ونصرت کا نظام

لیکن خلافتِ راشدہ کے بعد جب حالات بگڑ گئے اور خلافت پر ''نبوت کی نیابت'' کے بجائے شاہی اور حبِ دنیا کا غلبہ ہو گیا، تو اس تغیر کا سب سے بڑا اثر اس کارِ نبوت پر پڑا، اور یہ کام بطور نصب العین کے خلفاء کے سامنے نہیں رہا (مستثنیات کا یہاں ذکر نہیں ہے) لیکن اُمت میں اس فرض کا احساس کم وبیش ہر دور میں رہا، اس لئے اللہ کے باتوفیق بندے اپنی اپنی صلاحیتوں اور زمانہ کے احوال وظروف کے مطابق اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ کرتے رہے۔ جہاد وقتال کے شعبے کو اپنی خصوصیات اور اپنے شرائط کے ساتھ جاری رکھنے کا کام تو ادارۂ حکومت ہی سے متعلق تھا، افرادِ اُمت اس میں بے بس تھے، اور اسی لئے اس کے مکلف بھی نہیں تھے، لیکن دوسرے شعبے جن کو انفرادی طور پر افراد بھی سنبھال سکتے تھے، ان کو مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں میں اپنے حالات کے مطابق اللہ کے بندوں نے سنبھالا، اور دین کی

---

[1] انتخاب خلیفہ کے مسئلہ کی اس واقعی نوعیت کو سمجھ لینے کے بعد وہ بہت سی گتھیاں آپ سے آپ سلجھ جاتی ہیں جو اس مسئلہ کے بارے میں شیعہ سنّی اختلاف کی بنیاد بن گئی ہیں۔ ۱۲

خدمت ونصرت اور ہدایت وارشاد کے ان میدانوں میں جدوجہد ہر دور میں کچھ نہ کچھ ہوتی رہی، اور آج دین وایمان اور خیر وسعادت کا جو کچھ سرمایہ اس اُمت میں موجود ہے، وہ دراصل اللہ کے اِن باتوفیق بندوں کی کوششوں ہی کا نتیجہ ہے۔

## دین کی خدمت اور اس کی راہ میں جدوجہد کرنے والے "انصار اللہ" اور "خلفاء نبوی" ہیں!

اُمت کی پوری تاریخ میں اللہ کے جن بندوں نے دین کی خدمت ونصرت اور بندگانِ خدا کی اصلاح و ہدایت کی جو خاص کوششیں اللہ کے لئے کیں، خواہ دعوت وتبلیغ یا تعلیم وتربیت کی شکل میں، خواہ وعظ وارشاد اور تصنیف وتالیف کی شکل میں، یا کسی اور صورت میں، وہ سب بلاشبہ "انصار اللہ" اور "حزب اللہ" میں شامل ہیں، اور اگرچہ حکومت وسلطنت سے ان کا کبھی کوئی واسطہ نہ رہا ہو، لیکن رسُول اللہ ﷺ کی خلافت ونیابت میں ان کا حصہ ہے، اور وہ رسُول اللہ ﷺ کے خلفاء اور نائبین میں سے ہیں۔

## حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تحقیق کہ رسُول اللہ ﷺ کی خلافت دو قسم کی ہے

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے "فیوض الحرمین" میں تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی ہے، کہ جس طرح جہاد وقتال اور اقامتِ عدل وغیرہ خدمتِ دین ونصرتِ دین کے حکومتی شعبوں کے صحیح طور پر سنبھالنے والے رسُول اللہ ﷺ کے خلفاء ہیں، اسی طرح کارِ نبوت کے دوسرے شعبوں مثلاً دعوت وتبلیغ، تعلیم وتربیت، اصلاح وارشاد وغیرہ کے سنبھالنے والے، اور ان راہوں میں اخلاص اور خدا طلبی کی صفت کے ساتھ جدوجہد کرنے والے بھی رسُول اللہ ﷺ کے خلفاء ہیں، فرق بس یہ ہے کہ پہلی قِسم کے خلفاء ظاہری اور بیرونی پہلو کے خلفاء ہیں، اور دوسری قسم کے خلفاء اندرونی اور باطنی پہلو کے خلفاء ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے پہلی قسم کی خلافت کا نام "خلافتِ ظاہرہ" اور دوسری کا نام "خلافتِ باطنہ" رکھا ہے۔ (فیوض الحرمین)۔

## حکومت والی خلافت اُمّت میں عرصہ سے مفقود ہے لیکن دوسری خلافت باقی وجاری ہے

بلکہ اب تو واقعہ یہ ہے کہ حکومت والی خلافت کا نظام تو عرصہ سے ختم ہو چکا ہے، مسلمانوں کی جو حکومتیں ہیں (اور خیر سے اب بھی چھوٹی بڑی بیسیوں ہیں) یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ان میں سے اکثر کو رسُول اللہ ﷺ والے مقصد سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور نہ ان کو اس کا دعویٰ ہی ہے، بلکہ ان میں سے بعض تو دین اور ہدایت الٰہی سے اتنی ہی بے تعلق اور اس کے بارے میں اتنی ہی "ناجانب دار" ہیں جتنی کہ یورپ وایشیاء کی دوسری نامسلمان سیکولر حکومتیں، والعیاذ باللہ رب العلمین ۔ لیکن رسُول اللہ ﷺ کی دوسری خلافت یعنی حکومتی نظام کے بغیر داعیانہ اور مصلحانہ طور پر آپ کے دین کی خدمت ونصرت اور آپ کی لائی ہوئی ہدایت سے اللہ کے بندوں کو بہرہ مند کرنے کے لئے مخلصانہ جدوجہد باقی وجاری ہے، اور اس کا دروازہ کھلا ہوا ہے، بلکہ اس کا میدان آج ہمیشہ سے زیادہ وسیع ہے، اللہ کے بندے اس میدان میں اُتریں اور اپنی صلاحیت واستعداد کے مطابق رسُول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے طریقۂ زندگی کو رواج دینے کی کوشش کریں، اس راہ میں محنت ومشقت کرنا اور قربانی دینا ہمارے اس دور کا جہادِ عظیم اور رسُول اللہ ﷺ کے ساتھ سچی وفاداری، اور آپ کی سچی خلافت ونیابت ہے۔ اللہ کے جو بندے اخلاص اور صدق نیت کے ساتھ اس راستہ پر بڑھیں گے، اللہ تعالیٰ اُن کے لئے دوسرے دروازے بھی کھولے گا، مکہ معظمہ میں ایسے ہی حالات میں مسلمانوں کو سورۂ عنکبوت کی آخری آیت کے ذریعہ یہ خوشخبری سنائی گئی تھی:۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ o ———— (عنکبوت، آخری آیت)

اور جو بندے ہماری راہ میں اور ہمارے دین کے لئے جدوجہد کریں گے، ہم ان کو اپنے راستوں کی رہنمائی کریں گے، یقیناً اللہ تعالیٰ نیکوکار بندوں کے ساتھ ہے، اور اُن کا ساتھ دینے والا ہے۔

# سیاست وحکومت

سیاست وحکومت ایک حیثیت سے انسانی زندگی کا اہم ترین شعبہ ہے، دنیا کے صلاح وفساد پر سب سے زیادہ اثر اسی کے صلاح وفساد کا پڑتا ہے، اسلئے یہ ممکن نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ہدایت اور رہنمائی سے اس اہم شعبہ کو بالکل خارج کر دیتا، اور اس کے بندے بالکل آزاد ہوتے کہ سیاست وحکومت کی گاڑی وہ جس طرح چاہیں چلائیں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے دین اسلام نے اور اس کی اُتاری ہوئی ہدایت نے جس طرح انسانی زندگی کے دوسرے شعبوں میں انسان کہ رہنمائی کی اور اس کو بتایا کہ یہ کام اس طرح کرنا ٹھیک ہے اور اس کے خلاف کرنا غلط اور گناہ ہے، اسی طرح سیاست وحکومت کے اس شعبہ کے بارے میں بھی اس نے انسانوں کی پوری رہنمائی کی ہے، اور اپنے ماننے والوں کو زندگی کے اس میدان میں بھی صحیح اور خدا پرستانہ طریق کار اختیار کرنے کا پابند کیا ہے۔ مسلمان جس طرح عقائد وعبادات میں، اخلاق اور معاشرت ومعاملات میں، دین کی خدمت ونصرت اور اس کے تمام شعبوں میں، خدا اور رسُول کے احکام اور اُن کی ہدایات پر چلنے کا مکلّف ہے، ٹھیک اسی طرح وہ سیاست وحکومت کے بارہ میں بھی ان اصول واحکام کا پابند ہے، جو اسلام نے اس شعبہ سے متعلق دیئے ہیں۔

جن قوموں کے پاس ''دین اسلام'' جیسا کوئی مکمل ضابطۂ حیات نہیں تھا، جو آج کل کی ترقی یافتہ اور پُر پیچ سیاست میں بھی ان کی رہنمائی کرسکتا، یا کم از کم ان کا ساتھ ہی دے سکتا، ان کا دین وسیاست کی تفریق کے نظریہ کو اپنانا بالکل قدرتی بات تھی، وہ بیچارے یہ نہ کرتے تو کیا کرتے، لیکن سیاست وحکومت کے کاروبار سے تعلق رکھنے والے مختلف ملکوں کے جن مسلمانوں نے اس نظریئے کو اپنایا ہے اور اپنا رہے ہیں، ہر واقف کار جانتا ہے کہ انھوں نے جدید زمانہ کے حالات واقتضاءات اور سیاست وحکومت سے متعلق اسلامی اصول وتعلیمات کا علمی

جائزہ لے کر، غور وفکر کے بعد یہ فیصلہ نہیں کیا ہے کہ اس زمانہ میں سیاست وحکومت کی گاڑی کو خدا اور رسُول کی ہدایت اور اسلامی احکام کا پابند کر کے چلایا نہیں جاسکتا، بلکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ سیاست میں اسلامی احکام کا پابند بننے سے خود ان کے ذاتی مفادات اور نفسانی خواہشات اور ان کی بے راہ روی ونفس پرستی پر جو پابندیاں عائد ہوتی ہیں اور انھیں قربانی اور نفس کشی کی جو زندگی اپنانی پڑتی ہے، اس کے لئے وہ اپنے کو آمادہ نہیں کر سکے، اس لئے انھوں نے اپنی خیر بھی دین وسیاست کی تفریق میں سمجھی اور یہ نعرہ لگانا شروع کر دیا۔ ورنہ اگر آج کسی ایک مسلمان حکومت کے حکمران حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مثال کو سامنے رکھ کر تقویٰ اور قربانی والی زندگی اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیں (اور اللہ نے ان کو تفقُّہ فی الدین بھی دیا ہو، یا اہلِ بصیرت اور اصحاب تفقُّہ کا تعاون انھیں حاصِل ہو) تو وہ دنیا کو عملی طور پر دکھا سکتے ہیں کہ اس نئے زمانہ میں بھی قومی اور بین الاقوامی میدانوں میں سب سے زیادہ کامیاب وہی سیاست ہوسکتی ہے جو اسلامی تعلیم کی رہنمائی میں چلائی جائے، اور اسی سے دنیا کے اُلجھے ہوئے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ ہماری اس دنیا میں اسلام کی سب سے بڑی مشکل اور اس کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ اس کے ماننے والوں میں خاص کر ان کے سر برآوردہ طبقہ میں غالب اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو اسلام کے اصول واحکام اور خدا اور رسُول کی ہدایت کے مقابلہ میں اپنی نفسانی خواہشات اور ذاتی مفادات کے زیادہ وفادار ہیں۔

بہر حال زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح سیاست وحکومت کے بارہ میں بھی اسلام کی خاص ہدایات اور منضبط اصول واحکام ہیں۔ ہم نے جس طرح پچھلے صفحات میں اسلامی تعلیم کے مختلف شعبوں کے متعلق صرف اصولی گفتگو کی ہے اسی طرح سیاست وحکومت کے متعلق بھی یہاں صرف اصولی گفتگو کی جائے گی، تفصیلات ان کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں جو خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہیں۔

## کائنات کا حقیقی مالک وفرمانروا

اسلام سیاست وحکومت کے باب میں جو کچھ رہنمائی کرتا ہے اس میں اساس وبنیاد کی حیثیت اس نظریے بلکہ عقیدے کو حاصِل ہے کہ کائنات کی اس ساری مملکت کا اصل مالک

وفرماں روا اس کا خالق اور پروردگار ہے، اور سارے انسان اُس کے بندے ہیں، اصل مالک اُس کے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔قرآن مجید میں جابجا فرمایا گیا ہے:۔

لِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اللہ ہی کے لئے آسمان و زمین کی بادشاہت ہے۔

لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

زمین و آسمان کی بادشاہت دراصل اللہ ہی کی ہے۔

اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ ط یُوْرِثُھَا مَنْ یَّشَاءُ مِنْ عِبَادِہٖ

دنیا اور اس کی زمین اللہ ہی کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے
اس کا وارث بناتا ہے۔

## نظریۂ خلافت

اسلام کی اصطلاحی زبان میں ادارۂ حکومت کے لئے خلافت اور سربراہ حکومت کے لئے خلیفہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے (جس کے اصل معنی جانشین، نائب یا نمائندہ کے ہیں) یہ صرف ایک لفظی تعبیر ہی نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ اسلامی نظام میں حکمران کی حیثیت صرف یہ ہے کہ وہ ایک مقرر کیا ہوا منتظم اور متولی ہے، اس کا منصب یہ نہیں ہے کہ جس طرح چاہے حکومت کرے، بلکہ اس کا مقام و کام صرف یہ ہے کہ دنیا کے جس حصّہ کے انتظام کی ذمہ داری اس کے سپرد کی گئی ہے، وہ اپنے کو محمد رسُول اللہ ﷺ اور ان کے سچّے جانشینوں کا جانشین سمجھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق اور اس کے مقرر کئے ہوئے اصول وضوابط کا پابند رہ کر اپنی اس ذمہ داری کو انجام دے، وہ غیر مسئول نہیں ہے، بلکہ اس کو دنیا میں بندوں کے سامنے اور آخرت میں خدا کے سامنے جواب دینا ہے۔

بہر حال اسلام نے حکومت اور حکمراں کے لئے خلافت اور خلیفہ کا لفظ استعمال کر کے اس نظریۂ خلافت کو حکومت کی ایک بنیاد بنا دیا ہے۔

نیز یہ دونوں لفظ اس حقیقت کو بھی یاد دلاتے ہیں کہ اسلامی حکومت اور اُس کے سربراہ کا کام صرف سیاست وحکومت کے دائرہ ہی میں محدود نہیں ہے، بلکہ اس کی اصل ذمہ داری جیسا کہ چند ورق

پہلے تفصیل سے بتایا جاچکا ہے یہ ہے کہ رسُول اللہ ﷺ انسانی دنیا کی ہدایت واصلاح کا جوکام لے کر آئے تھے وہ اپنے حالات وامکانات کے مطابق اُس کے لئے برابر جدوجہد کرتا رہے۔

الغرض دین وشریعت کی زبان میں اسلامی حکومت کے سربراہ کے لئے لفظ خلیفہ کے استعمال ہونے کا اصل منشا یہی ہے کہ یہ حقیقت نظروں سے کبھی اوجھل نہ ہو کہ اس کی حیثیت دنیا کے کِسی بادشاہ یا راجہ مہا راجہ کی نہیں ہے، اور نہ اس کا منصب ومقام وہ ہے جو آج کل کی ''جمہوری حکومتوں'' میں اُن کے صدر یا وزیر اعظم کا ہوتا ہے، بلکہ اس کی اصل پوزیشن یہ ہے کہ وہ محمد رسُول اللہ ﷺ اور اُن کے سچّے جانشینوں کا جانشین اور اُن کے مشن کا امین ہے، اور اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ امورِ مملکت نیز دیگر تمام متعلقہ امور کو آپؐ ہی کے طریقے پر انجام دے۔

وہ جتنا آپ کے راستہ سے ہٹے گا، منصبِ خلافت کی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں اسی قدر قصوروار ہوگا۔

## اسلامی حکومت کے سربراہ (خلیفہ) کا انتخاب!

ادارۂ خلافت اور خلیفہ کی اسلام میں جو حیثیت ہے اس کے معلوم ہو جانے کے بعد یہ بات آپ سے آپ متعین ہو جاتی ہے کہ یہ کوئی نسلی اور موروثی منصب نہیں ہے کہ باپ کے بعد بیٹا اور اُس کے بعد پوتا گدّی کا وارث ہو، بلکہ دراصل یہ پوری امت کا حق ہے، وہ اس منصب کے لئے جس کو موزوں سمجھے اس کو منتخب کرے، الغرض اسلام میں یہ منصب انتخابی ہے، ہاں! اس انتخاب کی عملی شکلیں زمانہ کے حالات کے لحاظ سے مختلف ہو سکتی ہیں، جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

## شوریٰ کی پابندی

اسلامی نظامِ حکومت میں خلیفہ کو شوریٰ کا بھی پابند کیا گیا ہے، خود رسُول اللہ ﷺ جو صاحبِ وحی بھی تھے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور تھے کہ پیش آمدہ معاملات اور مہمات کے بارے میں (جن میں وحی نے رہنمائی نہ کی ہو) اپنے اصحاب ورفقاء سے مشورہ کریں (وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ)۔

اور قرآن مجید ہی میں ایک دوسری جگہ اُمت محمدیہؐ کا لائحہ عمل اور دستور بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے ''وَاَمْرُھُمْ شوریٰ بَیْنَھُمْ'' اور ان کے کام باہمی مشورہ سے ہوتے ہیں۔

لیکن اگر کسی اہم معاملہ میں خلیفہ کو یقین ہو کہ جو کچھ میں سمجھ رہا ہوں وہی صحیح ہے، اور اس کے خلاف چلنے میں بڑا خطرہ ہے، تو شوریٰ کے اختلاف رائے کے باوجود وہ اپنے یقین اور شرح صدر کی بنا پر اپنی رائے پر اصرار کرسکتا ہے، اور جاننے والے جانتے ہیں کہ عملی دنیا میں یہ بالکل ناگزیر ہے، اور آج کی جمہوریتوں میں بھی عملاً بکثرت ایسا ہی ہوتا رہتا ہے۔

## اسلام کا حکومتی منشور اور حکومت و اقتدار کا مقصد

اگرچہ اوپر کی سطروں سے ضمناً یہ بات معلوم ہوچکی ہے لیکن مستقلاً بھی اس کا ذکر ضروری ہے کہ اسلام میں حکومت و اقتدار صرف اس مقصد کے لئے مطلوب ہے کہ دنیا میں خدا پرستی فروغ پائے، نیکیوں کا رواج ہو، اور بداخلاقیوں اور بدکرداریوں کی روک تھام ہو، ابھی چند صفحے پہلے سورۂ حج کی اِذنِ جہاد والی آیت گذر چکی ہے جس میں رسُول اللہ ﷺ کے مظلوم اصحابِ کرام کو ان کے ظالم دشمنوں کے خلاف جہاد و قتال کی اجازت دیتے ہوئے اور ان کو خداوندی مدد کا اطمینان دلاتے ہوئے ان کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ۔ (الحج)

یہ ہمارے ایسے بندے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا کے کسی حصّہ میں اقتدار حکومت عطا کر کے حکمراں بنادیں تو یہ نمازیں قائم کریں گے، زکوٰتیں ادا کریں گے، اچھے اخلاق اور اچھے کاموں کے احکام جاری کریں گے اور بداخلاقیوں اور بدکرداریوں کی روک تھام کریں گے۔

یہ آیت گویا اسلام کا حکومتی منشور بھی ہے۔

## اسلامی حکومت کی ذمہ داریاں

(۱) سورۂ حج کی مذکورہ بالا آیت سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اسلام میں حکومت

واقتدار صرف اسی لئے مطلوب ہے کہ خدا پرستی کو فروغ ہو۔ نیکوکاری پھیلے اور ترقی کرے اور بدکاری اور بداخلاقی کا خاتمہ ہو۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسلامی حکومت کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے جو انتظامات ضروری ہوں وہ ممکن حد تک ان کو بروئے کار لائے۔ مثلاً اس مقصد کا تقاضا جس قسم کے نظامِ تعلیم کے لئے ہو وہ تعلیمی نظام قائم کرے، اسی طرح اپنی ساری کارروائیوں میں بطور نصب العین کے اس مقصد کو سامنے رکھے۔ علیٰ ہذا القیاس ارشاد و احتساب کا محکمہ قائم کرے۔ وقت آجانے پر اپنی حفاظت کے لئے اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لئے مقررہ شرائط کے ساتھ جہاد کرے۔

(۲) نظریۂ خلافت کے مطابق اسلامی حکومت کی حیثیت چونکہ ایک ایسے انتظامی اور تولیتی ادارے کی ہے جو دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے ملک اور اس کی رعیّت کا انتظام کرنے کا ذمہ دار ہے اس لئے اس کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے وسائل کی حد تک اس کی پوری پوری فکر اور کوشش کرے کہ اس کے زیرِ انتظام سارے بندوں کو (بلاتفریق مذہب وملت) زندگی کی ضروریات حاصل ہوں اور کسی بھی طبقہ پر کوئی نامناسب بوجھ نہ پڑے۔ سب اپنے کو امن وحفاظت میں سمجھیں اور ان کی جان ومال اور عزّت وآبرو محفوظ رہے۔

عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ کے مثالی دور میں ان تمام ذمہ داریوں کی ادائیگی کی جس طرح فکر وکوشش کی جاتی تھی اس کی تفصیلات کتبِ سیَر میں دیکھی جاسکتی ہیں اور خلافت وخلیفہ کا لفظ ان سب ذمہ داریوں کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔

(۳) اسی طرح اسلامی حکومت کی یہ بھی ایک ذمہ داری ہے کہ انصاف کا ایسا انتظام ہو کہ ہر ایک کے لئے اس کا حاصل کرنا آسان ہو۔[۱] نیز انصاف بالکل بے لاگ ہو، نہ تعلق اور یگانگت کی بناء پر، اور نہ کسی دوسری وجہ سے کسی کے ساتھ خلافِ انصاف کوئی رعایت ہو، اور نہ مخالفت یا عداوت کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے کسی کے ساتھ کوئی زیادتی یا بے انصافی ہو۔

---

[۱] رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین جن لوگوں کو کسی علاقہ کا حاکم یا جج مقرر کرتے تھے تو ان کو ایک خاص تاکید یہ بھی فرماتے تھے کہ انصاف کے طالبوں اور دادخواہوں کے لئے اُن کا دروازہ ہر وقت کھلا رہے اور دروازہ پر کوئی دربان بھی نہ رہے۔ حدیث وسیرت کی کتابوں میں یہ روایتیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ۱۲

قرآن مجید میں صراحۃً ارشاد ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ یامُرُ بِالْعَدْلِ۔ ''اللہ تعالیٰ انصاف کا حکم دیتا ہے''۔

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:۔

اِنَّ اللّٰــہَ یَــا مُرُ کُـمْ اَنْ تُـؤَدُّوْا الْاَ مٰنٰتِ اِلٰی اَھْلِھَــا وَاِذَا حَـکَـمْـتُـمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ ط اِنَّ الـلّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمْ بِہٖ ٥ ——————— (النساء: رکوع ۸)

''اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ ساری امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کرو اور جب لوگوں کے مابین فیصلے کرو تو ہر فیصلہ انصاف کے ساتھ کرو، اللہ تعالیٰ کی یہ بہت اچھی نصیحت ہے جو تم کو کرتا ہے''۔

اس آیت میں انصاف کے حکم کے علاوہ اور اس سے پہلے یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ امانتیں اُن کے حق داروں کو ادا کی جائیں۔ عربی زبان اور خاص کر قرآن مجید کی اصطلاح میں امانت کا لفظ بہت وسیع ہے اور اس کی اسی وسعت کی بناء پر ''اداء امانت الیٰ اھلھا" کے اس حکم میں یہ بھی داخل ہے کہ ہر ذمہ داری اس کو سپرد کی جائے جو اس کا اہل ہو، اس لئے اسلامی حکومت کی یہ بھی بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ حکومت کے عہدے اور منصب اُنھیں لوگوں کو سپرد کئے جائیں جو حُسنِ سیرت اور تقویٰ کے لحاظ سے بھی اس کے اہل ہوں۔

بے لاگ انصاف کے بارے میں ایک آیت سورۂ مائدہ کی اور سُن لی جائے ارشاد ہے:۔

یَـاَیُّھَا الَّـذِیْـنَ اٰمَـنُوْا کُوْ نُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَـجْرِ مَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِ لُوْا ط اِعْدِ لُوْا ھُوَاَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی، وَاتَّقُوْاللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ٥

(المائدہ ع ۲)

''اے ایمان والو! ہو جاؤ اللہ کے لئے کھڑے ہونے والے، انصاف کے ساتھ شہادت دینے والے، اور کسی خاص قوم اور گروہ کی عداوت تمہارے لئے بے انصافی کرنے کا باعث نہ بن جائے (ہر

معاملہ میں ہر ایک کے ساتھ) انصاف ہی کرو کہ وہی قرین تقویٰ ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے، کوئی بات اس کے علم سے باہر نہیں ہے"۔

ان آیتوں کے بعد اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کی ایک دو حدیثیں بھی سُن لیجئے جن میں آپؐ نے بتایا ہے کہ عادل و منصف حکمران کا مقام اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیا ہے اور بے انصافی کرنے والے حاکموں کا انجام آخرت میں کیا ہونے والا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

اِنَّ اَحَبَّ النَّاسِ اِلَی اللّٰہِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَاَقْرَبَھُمْ مِنْہُ مَجْلِسًا اِمَامٌ عَادِلٌ وَاِنَّ اَبْغَضَ النَّاسِ اِلَی اللّٰہِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَ اَشَدَّ ھُمْ عَذَابًا اِمَامٌ جَائِرٌ ——————— (رواہ الترمذی)

"قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب اور اُس سے قریب تر منصف حکمراں ہوگا اور اس دن اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ مبغوض اور سب سے زیادہ سخت عذاب میں مُبتلا، ظلم و بے انصافی سے حکومت کرنے والا حاکم ہوگا"۔

اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِنَّ اَفْضَلَ عِبَادِاللّٰہِ عِنْدَ اللّٰہِ مَنْزِلَۃً یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اِمَامٌ عَادِلٌ رَفِیْقٌ وَاِنَّ شَرَّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰہِ مَنْزِلَۃً یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اِمَامٌ جَائِرٌ خَرِقٌ ——————— (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے بندوں میں افضل ترین وہ صاحب عدل حاکم ہوگا جو نرم اور رحم دل بھی ہو، اور بد ترین آدمی اُس دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ حاکم ہوگا جو حکومت کرنے میں بے انصاف اور تشدد پسند ہوگا۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ حکومت اور اہلِ حکومت کے لئے صرف عدل

وانصاف ہی نہیں ہے بلکہ عوام کے دُکھ درد کا احساس اور اُن کی سہولت اور رفاہیت کے لئے سچی فکرمندی اور دردمندی بھی ضروری ہے۔

حضرت انسؓ کی ایک روایت میں ہے۔

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَابَعَثَ اَحَدًا مِنْ اَصْحَابِهٖ فِيْ بَعْضِ اَمْرِهٖ قَالَ بَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا وَيَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا ——————— (رواہ البخاری ومسلم)

"رسول اللہ ﷺ جب اپنے اصحاب میں سے کسی کو حاکم یا عامل بنا کر کسی علاقے کی طرف روانہ کرتے تھے تو اُس کو نصیحت فرماتے تھے کہ لوگوں کو خوشخبریاں سناؤ (اور ان میں شوق و جذبہ پیدا کرو) اور ایسی باتیں اُن سے نہ کہیو جن سے اُن میں نفرت اور بُعد پیدا ہو اور اُن کے لئے آسانیاں اور سہولتیں پیدا کیجو، اُن کو دشواریوں اور مشکلوں میں نہ ڈالیو"۔

اس حدیث سے یہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی حکومت اس کی بھی ذمہ دار ہے کہ اس کے کارندوں کا طرزِ عمل عوام کو مرعوب اور دہشت زدہ کرنے والا اور ان کو مُشکلوں اور دشواریوں میں مُبتلا کرنے والا نہ ہو بلکہ اُن کے لئے سہولتیں اور اُن کے دِلوں میں اُمنگیں پیدا کرنے والا ہو۔

## قانون

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ قانون سازی میں بھی یہی بات ایک رہنما اصول اور بنیادی پالیسی کے طور پر سامنے رکھی جائے گی کہ عوام بے ضرورت دشواریوں اور تنگیوں میں مُبتلا نہ ہوں بلکہ حتّی الوسع اُن کے لئے آسانیاں اور کشادگیاں پیدا کی جائیں۔

قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں فرمایا گیا ہے:۔

يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلَالَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۔

"جن بوجھوں کے نیچے یہ لوگ دبے ہوئے ہیں، یہ رسول اُن

بوجھوں کو اُن کے اُوپر سے اُتارتے ہیں اور جو بندشیں اُن پر چلی
آرہی تھیں ان کو یہ رسول ختم کرتے ہیں"۔

قانون کے بارے میں یہ بنیادی اصول بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ اسلام میں قانون کا اصل سرچشمہ اللہ ورسول یا دوسرے لفظوں میں کتاب وسنّت ہے۔ پس جو قوانین کتاب وسنّت میں ہمیشہ کے لئے طے کر دیئے گئے ہیں وہ تو مفروغ عنہ ہیں، ان میں کسی ترمیم وتبدیل کا اب کسی کو اختیار نہیں، لیکن اس دُنیا میں پیش آنے والے معاملات اور ضروریات کے بہت سے گوشے وہ ہیں جن کے متعلق قرآن وحدیث میں کوئی صاف حکم موجود نہیں ہے اور حکومت کے لئے روزمرہ ایسے نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کے لئے حسبِ ضرورت قانون بنانا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ پس یہ قانون سازی بھی انھیں اصولوں کی روشنی میں ہوگی جو کتاب و سنّت اور خلفائے راشدین کے طرزِ عمل سے مستنبط ہوتے ہیں اور جیسا کہ عرض کیا گیا اس میں عوام کی سہولت اور آسانی کو بھی ایک بنیادی اصول کے طور پر سامنے رکھا جائے گا۔

## اسلامی حکومت میں عُہدوں کے طالبوں اور خواہشمندوں کو عہدے نہیں دیئے جائیں گے

اسلامی حکومت کے امتیازی اصولوں میں سے ایک یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ جو شخص کسی حکومتی عہدے کا طالب یا خواہشمند ہو اُس کو عہدے کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ روای ہیں کہ میرے خاندان کے دو آدمیوں نے رسول اللہ ﷺ سے کسی حکومتی عہدے کے لئے درخواست کی، تو آپؐ نے فرمایا:

اِنَّا وَاللّٰهِ لَا نُوَلِّی عَلٰی هٰذَا الْعَمَلِ اَحَداً سَاَلَهٗ وَلَا اَحَدًا حَرَصَ عَلَیْهِ ـــــــــــ (رواہ البخاری ومسلم)

"خدا کی قسم! ہم کسی ایسے آدمی کو کوئی حکومتی عہدہ سپرد نہیں کرتے جو اس

کے لئے خود طالب اور حریص ہو [۱]"۔

## اسلامی حکومت کے عہدیداروں کی معاشرت کا معیار زیادہ بلند نہیں ہونا چاہئے

اسی طرح ایک چیز یہ بھی اس سلسلہ میں قابلِ ذکر ہے کہ حکومت کے عہدیداروں کو اس کی ممانعت ہے کہ وہ بڑے لوگوں کی سی زندگی گزاریں، بلکہ اُنہیں حکم ہے کہ اُن کی زندگی کا معیار زیادہ بلند نہ ہو۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے متعلق مروی ہے کہ وہ اپنے عہد خلافت میں جب عُمّالِ حکومت کو اپنے عہدے کا چارج لینے کے لئے رُخصت کرتے تھے تو اُن پر پابندی لگا دیتے تھے کہ وہ اپنے علاقۂ حکومت میں ٹھاٹھ باٹھ سے نہ رہیں۔ سواری اور کھانے میں بھی بڑے لوگوں کا طریقہ اور فیشن اختیار نہ کریں۔ اور اگر وہ اس ہدایت کی خلاف ورزی کریں گے تو نااہل قرار دیئے جائیں گے اور سزا کے مستحق ہوں گے۔ حدیث کی کتابوں میں ان کی اس ہدایت کے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں:۔

شَرَطَ عَلَيْهِمْ اَنْ لَا تَرْكَبُوْا بِرْزَوْنًا وَلَا تَاكُلُوْا نَقِيًّا وَلَا تَلْبَسُوْا رَقِيْقًا وَلَا تَغْلِقُوْا اَبْوَابًا دُوْنَ حَوَائِجِ النَّاسِ فَاِنْ فَعَلْتُمْ شَيْئًا مِّنْ ذٰلِكَ فَقَدْ حَلَّتْ بِكُمُ الْعُقُوْبَةُ ثُمَّ يُشَيِّعُهُمْ ــــــ (مشکوٰۃ)

"تم اپنی سواری کے لئے ترکی گھوڑا نہ رکھنا اور روٹی مَیدے کی نہ کھانا (بلکہ آٹے کی کھانا) اور باریک قسم کے کپڑے نہ پہننا [۲]۔ اور اپنی

---

[۱] عام اصول تو یہی ہے لیکن اگر کوئی مخلص بندہ کسی خاص موقع پر محسوس کرے کہ اس اہم خدمت کو اللہ کی توفیق سے میں اچھی طرح انجام دے سکتا ہوں تو اس کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے کو پیش کر دے اور حکومت کے ذمہ دار اگر مطمئن ہوں، تو وہ خدمت اس کے سپرد کر سکتے ہیں۔۱۲

[۲] اس زمانہ میں یہ تینوں باتیں یعنی سواری کے لئے ترکی گھوڑا رکھنا، مَیدے کی روٹی کھانا اور باریک کپڑا پہننا بڑے لوگوں کا طریقہ اور فیشن تھا۔۱۲

ضرورتیں لے کر آنے والے عوام کے لئے اپنا دروازہ بند نہ کرنا اور اگر تم نے ان میں سے کوئی ایک بات بھی کی تو تم سزا پاؤ گے"۔ (اس ہدایت اور تنبیہ کے بعد آپؓ انہیں رخصت کرتے تھے۔)

شروع میں شَرَط عَلَیْهِمْ کے لفظ اور آخر میں عُقُوبَۃ یعنی سزا کی آگاہی سے ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک اس کی حیثیت صرف ایک مستحسن اور پسندیدہ بات کی نہ تھی بلکہ وہ اپنے عمالِ حکومت کے لئے ان ہدایات کی پابندی ضروری سمجھتے تھے۔

حکومت و سیاست سے متعلق اسلام کی جو تعلیمات اور اللہ و رسول کی جو ہدایات اوپر کی سطروں میں ذکر کی گئیں، ظاہر ہے کہ اُن پر عمل کرنے اور اُن کے مطابق نظام حکومت چلانے کی اصل ذمہ داری اُن مسلمانوں پر ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے کسی حصۂ زمین کا اقتدار بخشا ہے، ان کے علاوہ ان ملکوں کے مسلمانوں کے جو دوسرے طبقے ہیں اُن کی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنی حکومت کو اللہ و رسولؐ کی مرضی کے مطابق اس منہاج کا پابند کرنے کے لئے جو خدمت اور امداد اور جدوجہد وہ کر سکتے ہوں، جس سے اس مقصد تک پہنچنے کی حقیقت پسندانہ توقع ہو وہ اس میں دریغ نہ کریں۔

## اسلامی ممالک کی موجودہ حکومتوں کو اسلامی حکومت بنانے کے سلسلہ کا بنیادی کام

اس جگہ یہ عرض کر دینا بھی اپنی ذمہ داری معلوم ہوتی ہے کہ اسلام کے مزاج، مسلمانوں کی پچھلی تاریخ اور اپنے زمانے کے احوال پر غور کرنے کے بعد ہمیں اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ جن علاقوں میں مسلمان خدا کے فضل سے اکثریت میں ہیں اور اس وجہ سے وہاں اقتدار مسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں ہے وہاں بھی حکومت کو صحیح معنی میں اسلامی حکومت بنانے کی سچی خواہش رکھنے والوں کے لئے سب سے پہلا بنیادی کام کرنے کا یہی ہے کہ وہاں کے مسلمانوں کی زندگی کو ایمانی اور اسلامی زندگی بنانے کی کوشش کی جائے، اور زندگی کے ایمانی و اسلامی بننے کا مطلب اور اس کا معیار یہ ہے کہ دنیا کی فکر اور محبت پر

آخرت کی فکر اور دین کی محبت غالب ہو جائے اور رضائے الٰہی کی طلب اور ثوابِ آخرت کی طمع میں نفس کی خواہشوں کو قربان کرنا اُن کے لئے آسان ہو جائے۔ مسلمانوں میں جب تک وسیع پیمانے پر اصلاحی جدوجہد کے ذریعے یہ تبدیلی نہ ہوگی کم از کم ہمارے اس زمانے میں وہاں کی حکومتوں کا صحیح معنوں میں اسلامی حکومت بن جانا ایک خواب ہی رہے گا۔ یہ راستہ اگرچہ بے مزہ اور دیر طلب ہے، لیکن راستہ صرف یہی ہے۔ اور اس کے سوا جن راستوں کو لوگ مختصر سمجھ کر آج کل چلنے لگے ہیں وہ دراصل اس منزل پر پہنچانے والے راستے نہیں ہیں۔ یَالَیۡتَ قَوۡمِیۡ یَعۡلَمُوۡنَ۔

بلکہ اس ناچیز کو تو یہ بھی یقین ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت اگر کہیں قائم بھی ہو جائے تو صرف اسی صورت میں وہ چل سکتا اور کامیاب ہو سکتا ہے جبکہ وہاں کے مسلمانوں میں اصلاح وتقویٰ کا غلبہ ہو۔ جس ملک کے مسلمانوں میں نفس پرستی اور فسق و فجور کا غلبہ ہوگا وہاں اسلامی نظام ہرگز نہیں چل سکے گا، بلکہ ان مسلمانوں ہی کے ہاتھوں اُس کی دھجیاں اُڑیں گی اور اُس کی مٹی پلید ہوگی۔

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا وہ براہِ راست اُن ملکوں کے مسلمانوں سے متعلق تھا جہاں اقتدار مسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں ہے۔

## غیر اسلامی اقتدار کے تحت رہنے والے مُسلمانوں کا مسئلہ

اب چند اصولی باتیں ان مسلمانوں کے بارے میں بھی عرض کرنی ہیں جو ایسے علاقوں اور ملکوں میں رہتے ہیں جہاں اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے، مثلاً جو پوزیشن ہمارے ہندوستان کی یا چین یا بعض اُن یورپین ممالک کی ہے جہاں مسلمانوں کی بھی آبادیاں ہیں۔

ایسے ملکوں کے احوال چونکہ بہت مختلف ہیں اور اس سے بھی زیادہ مختلف ہو سکتے ہیں اس لئے سیاست وحکومت کے شعبہ سے متعلق وہاں کے مسلمانوں کے لئے دینی ہدایت وتعلیم کی روشنی میں کوئی ایک لائحہ اور طریق کار متعین نہیں کیا جا سکتا۔ بس چند ایسی اصولی باتیں لکھی جا سکتی ہیں جو مختلف احوال وظروف میں ان کی رہنمائی کر سکیں۔ اگلے صفحات میں

وہی لکھی جارہی ہیں۔

(۱)

ایک زمانہ وہ تھا کہ مصر کے فرعونی دَور میں فرعون کے بلائے ہوئے جادوگروں پر جب موسیٰ علیہ السّلام کی صداقت ظاہر ہوگئی اور انھوں نے اُن کی ایمانی دعوت کو حق جان کر قبول کرلیا اور اپنے مومن و مسلم ہونے کا اعلان کردیا، تو فرعون نے صرف اس جرم میں ان کو قابلِ دار اور گردن زدنی ٹھہرا کر اُن کے ہاتھ پاؤں کاٹے جانے اور سُولی پر چڑھا دیئے جانے کا حکم دے دیا۔ نیز ایمان لانے والی اپنی بیوی کے ساتھ بھی اُس ظالم نے تشدّد و سنگدلی کا ایسا ہی برتاؤ کیا۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر جن غرباء و ضعفاء نے شروع میں اسلام قبول کیا، ملّہ کے ظالم کافروں مشرکوں نے اُن پر ایسے ایسے جان لیوا ظلم کئے جن کی یاد آج بھی مضبوط سے مضبوط آدمی کو رُلا دیتی ہے۔ پس کہنا یہ ہے کہ ظلم و بربریت کا یہ دَور تو غالبًا اب گُزر گیا اور اُمید یہی ہے کہ فتنۂ دجال سے پہلے یہ تاریخ انشاء اللہ اب کہیں نہیں دہرائی جائے گی۔ لیکن اگر بالفرض کسی ملک میں مُسلمانوں کے لئے حالات ایسے ہی ہوجائیں اور وہاں کی حکومت اسلام اور مسلمانوں کی ایسی ہی دُشمن اور اُن کے حق میں ایسی ہی ظالم وجلاد ہوجائے تو اُن کے لئے تین ہی راستے ہوں گے۔

(۱) یا تو کسی ایسے ملک اور ایسی سرزمین کی طرف ہجرت کر جائیں جہاں ایمان واسلام کے ساتھ زندگی گزار سکیں (خواہ وہ بھی کوئی غیر اسلامی ہی ملک ہو) جیسا کہ صحابۂ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ کے حکم سے ملّہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔

(۲) اور اگر اس کی بھی گنجائش نہ ہو تو پھر دوسری عزیمت کی راہ یہ ہے کہ اس راہ میں جان دینے والے دوسرے شہداء سابقین کی طرح خود بھی جان دیدیں اور جنّت میں اپنے پیش رؤوں سے جاملیں۔ انشاء اللہ اُن کے خون کا ایک ایک قطرہ اس ملک میں ایمان وہدایت کے پھیلنے کا ذریعہ بنے گا۔

(۳) جو کمزور دل والے اس کی ہمّت نہ کرسکیں اُن کے لئے رُخصت واجازت اس

کی بھی ہے کہ اپنے ایمان واسلام کو چھپا کر اسی مُلک میں رہیں اور کسی اچھے موقع اور اچھے وقت کے منتظر رہیں اور اللہ تعالیٰ سے دُعا بھی کرتے رہیں۔

رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ نَصِيْرًا ـــــ (النساء۔ع ۱۰)

''اے ہمارے ربّ! ہمیں اس آبادی سے نکال لے جس کے باشندے ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنی طرف سے کوئی حمایتی اور کوئی مددگار پیدا کر دے (جس کے ذریعہ ہمیں اس ظلم وزبردستی سے نجات ملے)''۔

## (۲)

جیسا کہ عرض کیا گیا اوپر والی صورت ہمارے علم میں اس وقت دنیا کے کسی ملک اور کسی ملک اور کسی خطّہ میں بھی نہیں ہے۔ ہاں بعض حکومتیں اس وقت بھی ایسی ہیں جو اِن پُرانے دقیانوسی ظالمانہ طریقوں سے تو نہیں، لیکن نئی شاطرانہ چالوں اور سیاسی عیاریوں سے مسلمانوں کا اسلام سے (بلکہ خدا و مذہب کے ہر ماننے والے کو اُس کے مذہب اور اُس کے معبود سے) توڑنے کی کوشش خفیہ واعلانیہ کرتی ہیں، لیکن انھوں نے خدا پرستی اور کسی مذہب کے ماننے کو قانوناً جرم قرار نہیں دیا ہے۔ بلکہ جیسا کہ عرض کیا گیا دوسرے مکّارانہ طریقوں سے وہ اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتی ہیں۔

ایسی حکومتوں کے مسلمان شہریوں کے لئے لائحہ عمل یہ ہے کہ وہ اللہ اور اُس کے مقدس دین کی سچّی وفاداری اور اس راہ میں عزیمت اور صبر کو اپنی پالیسی کی بنیاد بنائیں اور اپنے گھروں میں خدا پرستی اور اسلامی زندگی کی فضا قائم رکھنے کے لئے اور نئی نسل کی دینی تعلیم وتربیت کے لئے جو تدبیر اور جو محنت وکوشش اپنے موجودہ حالات میں کر سکتے ہوں اُس میں کمی نہ کریں۔ (ہماری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ اگر سچا احساس اور صادق عزم ہو تو یہ سب کچھ ہو سکتا ہے) اور اسی کے ساتھ اپنی ملکی حکومت کو اس غلطی سے بچانے کے لئے اور حالات کو بہتر بنانے کے لئے جو خیر خواہانہ اور دانشمندانہ تدبیریں اور کوششیں ممکن ہوں اُن

سے بھی غافل نہ رہیں، اس کے راستے سیاسی بھی ہو سکتے ہیں اور بالکل غیر سیاسی بھی، اور ان کوششوں کے نتیجے ایسے بھی نکل سکتے ہیں جن کا عام انسانوں کو وہم و گمان بھی نہ ہو۔ اللہ کی قدرت ہمارے سوچ فکر اور ہمارے قیاس و اندازہ سے بہت زیادہ وسیع ہے، اور اُس کی یہ غیر مبدّل سنّت اور اُس کا یہ قطعی وعدہ ہے کہ اُس پر ایمان لانے والے اُس کے بندے اگر اُس کے ساتھ سچّی وفاداری کا ثبوت دیں گے اور ایسے ناموافق اور صبر آزما حالات میں جو کچھ وہ کر سکتے ہیں اُس کے کرنے میں کمی نہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ اُن کی مدد فرمائے گا اور پردۂ غیب سے وہ ظاہر ہوگا جو اُن کی مشکلات کو حل کر کے حالات کو اُن کے موافق بنا دے گا۔ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔

## (۴)

جن مُلکوں میں اقتدار اس وقت مسلمانوں کے ہاتھوں میں نہیں ہے اور وہاں مسلمانوں کی آبادی بھی خاصی ہے، ان میں سے اکثر و بیشتر کی نوعیت اِس دَور میں یہ ہے کہ ان ملکوں کو اور ان کی حکومتوں کو اسلام سے اور اللہ و مذہب سے ضد اور بیر نہیں ہے بلکہ وہاں کے مسلمانوں کو بھی ملک کے دوسرے طبقوں کی طرح عقیدہ اور عمل کی دستوری آزادی حاصل ہے۔ لیکن اِن حکومتوں کا نظام چونکہ غیر اسلامی اور خالص مادّہ پرستانہ ہے اس لئے اُن کے بعض قوانین ایسے بھی ہیں جو اسلامی احکام سے ٹکراتے ہیں اور اُن کی وجہ سے اسلامی احکام پر چلنا سخت مشکل ہو جاتا ہے [۱]۔ پھر ان میں بعض مُلک ایسے بھی ہیں جن میں مسلمانوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچی ہوئی ہے۔ مثلاً ہمارے مُلک ہندوستان ہی کو لے لیجئے، یہاں مسلمانوں کی آبادی ۱۳۔۱۴ کروڑ کے درمیان ہے۔ ظاہر ہے کہ ان مسلمانوں کو اپنے ان مُلکوں ہی میں رہنا ہے۔ نہ تو ان کے لئے ہجرت کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ مسلمانوں کا کوئی ملک ان کو اپنے دامن میں جگہ دے سکتا ہے۔ تو جب واقعات کی اس دُنیا میں یہ طے ہے کہ ان کروڑوں مسلمانوں کو اپنے مُلکوں ہی میں رہنا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسری امکانی صُورت

---

[۱] اور بدقسمتی سے یہ مشکل تو اس وقت اکثر اُن ملکوں کے مسلمانوں کو بھی درپیش ہے جن کا اقتدار خود مُسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں ہے۔ کیونکہ ان کا نظامِ حکومت بھی اسلامی تعلیم و ہدایت کا پابند نہیں ہے۔ ۱۲

اُن کے لئے نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ یہ مسلمان اپنے ملکوں کی حکومتوں کے غیر اسلامی ہونے کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے حکومت اور اہلِ حکومت کے مکمل بائیکاٹ اور بے تعلقی کا فیصلہ تو نہیں کر سکتے اور نہ شریعت نے اُن سے اس نا قابلِ عمل پالیسی کا مطالبہ کیا ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کے لئے مسلمان رہتے ہوئے اس کی بھی گنجائش نہیں ہے کہ وہ زندگی کے سیاست وحکومت جیسے اہم شعبہ کو دین وشریعت کے دائرہ اقتدار ورہنمائی سے بالکل باہر قرار دیتے ہوئے مُلک کے صرف ایک شہری کی حیثیت سے دوسرے غیر مسلم شہریوں کی طرح ملکی سیاست وحکومت میں جس طرح چاہیں حصّہ لیں۔اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم نے زندگی کے اس اہم شُعبہ میں اپنے کو اللہ ورسول کی ہدایت واطاعت کا پابند نہیں کیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اسلام سے ایک طرح کا انحراف ہوگا۔

اس لئے ان ملکوں کے مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی راہ نہیں ہے کہ وہ اپنے لئے ایک خاص پالیسی اپنے اپنے حالات کے مطابق اسی بنیاد پر وضع کریں کہ اُنہیں اوّل وآخر مسلمان اور تاحدِ استطاعت وامکان اللہ ورسولؐ کے احکام کا پابند رہ کر زندہ رہنا ہے اور اس چیز کو ہر دوسری چیز سے حتّٰی کہ اپنے جان ومال اور عزّت وآبرو سے بھی عزیز تر اور مقدّس رکھنا ہے اور اسی کے ساتھ اپنے ملک کا بہی خواہ خیر اندیش اور اچھا شریف شہری بھی بننا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ان دونوں بُنیادی باتوں کے بارے میں خود مسلمانوں کا ذہن صاف اور بالکل صاف ہو اور یہ اُن کا اجتماعی اور قومی فیصلہ ہو۔اگر بالفرض کسی ملک کے مسلمانوں کے ذہن اس بارے میں پوری طرح صاف نہ ہوں تو ضروری ہوگا کہ پہلے اس مقصد کے لئے ایک مہم چلا کر اس کو مسلمانوں کا ایسا اجتماعی اور قومی فیصلہ بنالیا جائے جس کے بارے میں ان میں کوئی تذبذب اور کوئی قابلِ لحاظ اختلافِ رائے نہ رہے۔

ایک بات یہ بھی بنیادی اصول ہی کے طور پر اس سلسلہ میں یہاں قابلِ ذکر ہے کہ دُنیا کے دوسرے مسلمانوں کی طرح ان ملکوں کے رہنے والے مسلمانوں کے لئے بھی یہ تو ضروری ہے بلکہ گویا شرطِ ایمان ہے کہ وہ اسلام، اسلامی تعلیم، یعنی انفرادی واجتماعی زندگی کے لئے قرآن مجید کے بتائے ہوئے اور محمد رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے قانونِ حیات اور نظامِ زندگی

کو حق وہدایت سمجھیں اور اسکے خلاف ہر نظریہ اور ہر نظام کو غلط اور باطل یقین کریں اور اس لئے انسانی ہمدردی کے تقاضے سے بھی اُن کی دلی آرزو اور چاہت یہی ہو کہ ساری دُنیا اس حق کو قبول کرلے اور دین اسلام کو اپنالے، اور رُوئے زمین کے سارے مُلکوں میں اللہ تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے مقدس قانون کی حکومت وفرمانروائی ہو (وَيَكُونَ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ)۔

لیکن اُن کے اپنے اپنے ملکوں کے جو حالات ہوں اور جو نظامِ حکومت وہاں قائم ہو اس کو ایک نفس الامری حقیقت اور ایک واقعہ تسلیم کرتے ہوئے اور موافق وناموافق امکانات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے ہوئے ان کو اپنا لائحۂ عمل تجویز کرنا ہوگا اور اس سلسلہ میں شریعت کے معروف اصول " اختیار انفع ودفع اضر " [۱] کو بطور رہنما اصول کے اپنے سامنے رکھنا ہوگا۔ اسی اصول کی رہنمائی میں وہ مختلف حالات میں حکومت میں شرکت یا عدم شرکت، تعاون یا عدم تعاون وغیرہ کا فیصلہ کرسکیں گے۔

ایک چیز جو دینی اور شرعی حیثیت سے ہر مسلمان کے لئے یکساں درجہ میں ضروری ہے خواہ وہ دنیا کے کسی بھی علاقہ کا رہنے والا ہو اور اُس کی اصل جزا آخرت میں جنت اور اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔ لیکن غیر اسلامی ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کے مسائل ومشکلات کو حل کرنے اور ان کو عزت واحترام کا مقام دلانے میں اس کو خاص دخل ہے۔ وہ ایمان ویقین اور اعتماد علی اللہ کی دولت، تقویٰ یعنی سیرت کی طہارت وپاکیزگی، اللہ تعالیٰ سے خاص رابطہ اور خلق اللہ کی نفع رسانی والی زندگی ہے۔ ان ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کی یہ خاص الخاص ضرورت ہے کہ اپنے اندر یہ ایمانی اوصاف پیدا کرنے اور ان اوصاف کو اپنے معاشرہ میں عام کرنے کے لئے ہر دوسری چیز سے زیادہ جدوجہد کریں۔ اگر اُنھوں نے ایسا کیا تو اُن کے لئے وہ راہیں کھُلیں گی جن کا اُن کو گمان بھی نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید میں جابجا اس کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک آیت یہاں بھی

---

[۱] اس اصول کا حاصل یہ ہے کہ جب حالات ایسے ہوں کہ کسی چیز کو کلی طور پر دین وشریعت کے تقاضوں کے مطابق کرنا بس میں نہ ہو تو وہ رویہ اختیار کیا جائے جس میں نسبتاً بہتری کا پہلو ہو اور جس سے شر اور ضرر میں کمی کی توقع ہو، اسی اصول کا دوسرا عنوان "اختیار أهون البَلِيَّتَين " ہے۔۱۲

پڑھ لیجئے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ کَانُوْا یَتَّقُوْنَ لَھُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّ نْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ط لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ ط ذَالِکَ ھُوَالْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ——————— (یونس: ع ۷)

''جو بندے صاحبِ ایمان ویقین ہوں اور تقویٰ اُن کا شعار ہو' اُن کے لئے فلاح وکامیابی کی بشارت ہے دُنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی، اللہ تعالیٰ کے سب فرمان پُورے ہونے والے اور اٹل ہیں (دُنیا اور آخرت کی) یہ کامیابی بڑی فیروزمندی ہے''۔

## سُورۂ یوسف کا پیغام

ہمارے اس زمانے میں مسلمان جن مُلکوں میں سیاسی حیثیت سے کمزور یا اقلیت میں ہونے کی وجہ سے اپنے کو بے بس اور مغلوب ومجبُور محسوس کر کے مایوسی ودل شکستگی کی زندگی گزار رہے ہیں، اُن کے لئے قرآن مجید کی سورۂ یوسف میں خاص روشنی اور امید کا خاص پیغام ہے۔

حضرت یوسف علیہ السّلام کے واقعہ کا خاص سبق یہی ہے کہ کسی مُلک میں مسلمانوں کی سیاسی پوزیشن خواہ کتنی ہی کمزور ہو، خواہ وہ بالکل اکیلا ہی ہو، کوئی دوسرا اس کا ہم مذہب اور ہم مسلک نہ ہو اور اُسے ہم نسلی اور ہم وطنی کی ہمدردی بھی کسی طبقہ کی حاصل نہ ہو، لیکن اگر وہ سچا مومن اور خدا پرست ہے، تقویٰ اور پرہیز گاری اُس کا شعار ہے اور اُس میں کچھ ایسی صلاحیتیں بھی ہیں جن سے وہ ملک اور اہل مُلک کو فائدہ پہنچا سکتا ہے اور وہ فائدہ پہونچاتا بھی ہے، تو مُلک چاہے اُس کا کلمہ نہ پڑھے لیکن مُلک میں اُس کو عزّت واحترام کا خاص مقام ضرور حاصل ہوگا، اور اُن کے دین ومذہب کو بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا، اور اہلِ مُلک اُس کے سامنے جھکنے پر مجبور ہوں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سُنّت اور اُس کا دستور ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کی اس حیرت کو رفع کرنے کے لئے کہ جس یوسف کو ہم نے کنوئیں میں ڈال دیا تھا وہ مصر میں اقتدار کے اس مقام تک کیسے پہنچ گیا؟ یہ جو ارشاد فرمایا تھا:۔

اِنَّہٗ مَنْ یَّتَّقِ وَیَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝

"جو بندہ تقویٰ اور صبر اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ وہ نیکو کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا، اُن کو اجر ضرور مل کر رہے گا"۔

اس میں اللہ تعالیٰ کے اسی دستور کا ذکر ہے اور اوپر کی سطروں میں اس سلسلہ میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے، درحقیقت وہ اللہ تعالیٰ کے اس ازلی قانون و منشور ہی کی بُنیاد پر کہا گیا ہے۔

خالص فکری راستہ سے عقل کا اس پر مطمئن ہو جانا پہلے شاید کچھ مشکل رہا ہو، لیکن جمہوریت اور آزاد خیالی کے اس دور میں تو یہ بات دو اور دو، چار کی طرح آسانی سے سمجھ میں آجانے والی ہے۔

لیکن وائے بدقسمتی! اس وقت پورے عالَم کے مسلمانوں کا یہ عجیب حال ہے کہ سیاست وحکومت کے سلسلہ کی اپنی مشکلات اور اپنے مسائل حل کرنے کے لئے اُن سب ٹکڑ بازیوں کو تو وہ اختیار کر سکتے ہیں جو خالص مادّی تحریکوں کی ایجاد ہیں اور جن کے نتیجہ میں نہ کوئی خیر کبھی پیدا ہوا ہے نہ پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن قرآن مجید کے بتائے ہوئے اس راستہ کو وہ آزمانے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔ گویا اُن کا حال اس وقت بعینہٖ وہ ہے جو قرآن مجید میں بنی اسرائیل کے ایک بے توفیق گروہ کا ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے:۔

وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْہُ سَبِیْلًا ۚ وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الْغَیِّ یَتَّخِذُوْہُ سَبِیْلًا ——— (اعراف ع:۱۷)

"اگر وہ ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا راستہ نہ بنائیں (اور اس پر چلنے کے لئے آمادہ نہ ہوں) اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا راستہ بنا لیں (اور اُس پر چل پڑیں"۔)

غیر اسلامی مُلکوں میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے یہ رہنمائی تو قرآن مجید کے بیان کے مطابق اُسوۂ یوسفی کی تھی اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت مقدسہ کے واقعات میں صلح حدیبیہ سے بھی، بڑی رہنمائی ان مسلمانوں کو مل سکتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کی صلح، مکّہ کے کافروں، مشرکوں کے ساتھ بادیٔ النظر

میں ایسی مغلوبانہ شرائط پر اور بظاہر اس قدر دَب کر کی تھی کہ حضرت عمرؓ جیسے کامل الایمان اور وفادار صحابی کو اس پر ضبط کرنا اور ادب کے تقاضے کے مطابق خاموش رہنا بھی مشکل ہو گیا۔ لیکن یہ صُلح آپؐ نے اس قدر دَب کر اور بظاہر ایسی ذلّت آمیز ہار مان کر کیوں کی؟ ہر صاحبِ فکر اور واقف کار جانتا ہے کہ اُس وقت آپؐ کے سامنے ایک خاص مقصد یہ تھا کہ مکّہ والوں کے ساتھ (جو اس وقت اسلام دُشمنی میں گویا پورے عرب کے لیڈر تھے) مسلمانوں کے اختلاط کی راہیں کھلیں، تعصّب اور اشتعال کی فضا ختم ہو اور اُنھیں اس کا موقع ملے کہ وہ مسلمانوں کو اور اسلام کو برت کر دیکھ سکیں اور صلح کی ٹھنڈی فضا میں ٹھنڈے دل سے معاملہ پر غور کرنا اور حقیقت کا سمجھ سکنا اُن کے لئے آسان ہو جائے۔

اور تاریخ گواہ ہے کہ ''بظاہر اس مغلوبانہ صُلح'' ہی نے مکّہ والوں کے لئے اسلام کی طرف آنے کا راستہ کھولا۔ اس کے بعد حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت عمر بن عاصؓ جیسے کتنے ہی ممتاز قریشی سرداروں نے اسلام قبول کیا۔ اہلِ سیر کا بیان ہے صلح حدیبیہ کے بعد کے چند سالوں میں جتنے لوگوں نے برضا و رغبت اسلام قبول کیا ہے اُن کی تعداد اُن سے کہیں زیادہ ہے جنہوں نے آغازِ اسلام سے صلح حدیبیہ تک کے ۱۹۔۲۰ برسوں میں قبول کیا تھا۔ اسی لئے قرآن مجید میں صلح حدیبیہ کو ''فتح مبین'' کہا گیا ہے۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ''۔(سورۃ الفتح ع:۱)

تو کہنا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ میں اس قدر مغلوبانہ صلح کر کے کفار مکّہ کے ساتھ پُرسکون ٹھنڈی فضاء میں مسلمانوں کے اختلاط و تعلقات کا موقعہ حاصل کرنے کا جو خاص فائدہ اٹھایا تھا، وہ آج اکثر غیر اسلامی ملکوں کے رہنے والے مسلمانوں کو بڑی حد تک اس وقت حاصل ہے، لیکن خود مسلمانوں میں وہ ایمان، وہ ایمانی زندگی، وہ اسلامی اخلاق، تمام بنی نوع انسان کا درد اور ان کی ہمدردی و غمخواری کا جذبہ، اور اللہ تعالیٰ کی طرف اور اُس کی جنّت کی طرف سب کو کھینچنے کا مخلصانہ داعیہ، اور دین کی بے لوث دعوت، کچھ بھی نہیں ہے، نتیجہ وہ ہے جو آنکھوں کے سامنے ہے۔

پس ان ملکوں کے مسلمان اگر اسلام اور قرآن سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہمارے

لئے کیاہدایت ہے اور ہمارے مسائل کا کیا حل ہے؟ تو اصل جواب بس یہ ہے کہ اپنے کومُسلمان بناؤ۔سب سے پہلے ایمان ویقین اور ایمان ویقین والی زندگی اور ایمانی صفات واخلاق اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کی مخلصانہ فکر اپنے میں اور دوسرے مسلمانوں میں پیدا کرنے اور عام کرنے کے لئے جِدّ وجہد کرو۔اس کے بعد تمہارے لئے وہ راہیں کھُلیں گی جن کا اس وقت تم کو وہم وگمان بھی نہیں ہوسکتا۔وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰیٓ اَمْرِہٖ

ان مُلکوں کے مسلمانوں کے لئے سب سے اہم اور بنیادی بات تو بس یہی ہے جو اُوپر عرض کی گئی ہے۔اس کے بعد چند اصولی ہی باتیں اور عرض کرنی ہیں، لیکن اُن کے حیثیت ہمارے نزدیک ثانوی اور فروعی ہے۔بہرحال ہم ان کو بھی ذکر کرتے ہیں۔

یہ بات اُوپر ذکر کی جاچکی ہے کہ ان مُلکوں کے مسلمانوں کو سب سے پہلے یہ فیصلہ اور اس کا عزم کرلینا چاہئے کہ انہیں مسلمان رہ کر اور اسلام احکام پر چلتے ہوئے اپنے ملک میں رہنا ہے۔یہ ایسا مسئلہ ہے کہ مُلکی حکومت غیر اسلامی ہوتے ہوئے بھی اپنی معقولیت اور انصاف پسندی کی وجہ سے اس میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں بھی پیدا کرسکتی ہے اور اپنی بدنیتی اور تنگ نظری کی وجہ سے اس کے راستے میں سخت مشکلات بھی پیدا کرسکتی ہے۔اس لئے سیاست وحکومت کے باب میں ان مُلکوں کے مسلمانوں کا ایک اصول یہ بھی رہے گا کہ وہ ملک میں ایسے عنصر اور ایسی پارٹی کے برسراقتدار آنے میں اگر مدد دے سکتے ہوں تو ضرور مدد دیں جس سے اس مقصد میں ہمدردی اور زیادہ سہولتیں حاصل ہونے کی امید ہو۔

مثلاً کسی ملک میں متعدد سیاسی پارٹیاں ہیں جو ملک کے نظامِ حکومت کو اپنے ہاتھ لینے کے لئے الیکشن کے میدان میں اُتری ہوئی ہیں اور مسلمان یہ محسوس کرتے ہیں کہ کسی پارٹی کو برسرِ اقتدار لانے میں اُن کی حمایت وتائید اثر انداز ہوسکتی ہے تو وہ اس پارٹی کو برسراقتدار لانے کی کوشش کریں جس سے یہ اُمید ہو کہ مسلمانوں کے ساتھ اور خاص کر اُن کے دینی مسائل کے ساتھ اُس کا رویہ زیادہ ہمدردانہ رہے گا۔اسی طرح اگر اس مقصد کا تقاضا حکومت میں شرکت کا ہو، تو اُس میں شریک بھی ہوں۔

یہ حکمت عملی بداہتِ عقل کا بھی تقاضا ہے اور شریعت میں اس کی بنیاد وہ معروف ومسلم

اصول ہے جس کا مشہور عنوان فقہاء اور اصولیین کی زبان میں "اختیار اَھون البلیَّتین" ہے اس کی صریح نظیر (بلکہ دلیل بھی) وہ مشہور واقعہ ہے کہ جس زمانہ میں صحابۂ کرامؓ کی ایک جماعت نے ہجرت کر کے حبشہ میں قیام کرلیا تھا تو حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے کسی دُشمن نے اُسی زمانے میں نجاشی کے خلاف فوج کشی کی۔ اس موقع پر صحابۂ کرامؓ نے نجاشی کی فتح یابی کے لئے بڑے اخلاص اور الحاح سے دُعائیں کیں، اور مہاجرین کے اس قافلہ کے سردار حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اس معرکہ میں کوئی ایسا کارنامہ بھی انجام دیا جس کی وجہ سے نجاشی کے ہاں اُن کا اعتماد اور زیادہ بڑھ گیا۔ ؎

اس واقعہ سے متعلق حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی مفصّل روایت میں تصریح ہے

---

؎ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک رسالہ "الحسبہ فی الاسلام" میں اس پر کلام کرتے ہوئے کہ جب کوئی ایسا معاملہ درپیش ہو کہ ہماری کسی کوشش سے صورت حال میں نسبتاً کچھ بہتری پیدا ہوسکتی ہو یا کسی بُرائی میں کچھ کمی کی جاسکتی ہو تو مسلمانوں کو اس کے لئے جد و جہد کرنی چاہئے۔ استناد اور استشہاد کے طور پر لکھتے ہیں:۔

وقد کان النبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم و اصحابہ یفرحون بانتصار الروم والنصاریٰ علی المجوس وکلا ھما کافر لان احدالصنفین اقرب الی الا سلام وانزل اللہ فی ذالک سورۃ الروم .....وکذالک یوسف الصدیق کان نائبًا لفرعون مصروھو و قومہ مشرکون وفعل من العدل والخیرما قدرعلیہ ودعاالی الایمان بحسب الامکان ————— (الحسبہ صفحہ ۲۸)

جس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جب ایران کے آتش پرستوں اور روم کے عیسائیوں میں جنگ ہو رہی تھی تو اگر چہ دونوں فریق کافر تھے، لیکن چونکہ رُومی عیسائی بہ نسبت مجوسیوں کے اسلام سے قریب تھے اس لئے رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرامؓ کو عیسائیوں کی فتح کی خبروں سے خوشی ہوتی تھی اور سورۂ روم اسی سلسلہ میں نازل ہوئی تھی، اور اسی طرح مصر کے بادشاہ فرعون اور اس کی پوری قوم کے مشرک ہونے کے باوجود سیّدنا یوسف علیہ السّلام نے اُس کا نائب ہونا قبول فرمالیا تھا اور جو اختیارات ان کو اس طرح حاصل ہوگئے تھے، ان کو انھوں نے خیر اور عدل کے لئے حسب استطاعت استعمال فرمایا اور اپنے امکان کے بقدر لوگوں کو ایمان کی دعوت دی۔ شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی یہ عبارت اس سلسلہ میں بالکل واضح اور فیصلہ کن ہے۔ ۱۲

کہ نجاشی کے ساتھ ہماری یہ ہمدردی اس لئے تھی کہ ہم سمجھتے تھے کہ نجاشی کا دشمن اگر کامیاب ہوگیا تو اس کا سلوک ہمارے ساتھ اتنا اچھا نہ ہوگا کہ جتنا اچھا نجاشی کا ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام صفحہ ۳۶۱ رج ۱، البدایہ والنہایہ صفحہ ۷۵ رج ۳، شرح سیر کبیر صفحہ ۱۸۷ رج ۳)

جس قسم کے مُلکوں کے بارے میں یہ گفتگو ہو رہی ہے اُن کے رہنے والے مُسلمانوں کی ایک نہایت اہم ضرورت جس کا تعلق وہاں کی حکومتوں سے ہے، یہ بھی ہے کہ حکومت مسلمانوں کے ''پرسنل لاء'' کو اُن کی خالص دینی چیز سمجھتے ہوئے اُس میں عدم مداخلت کے اصول کو تسلیم کرلے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے ہر مناسب تدبیر اور ہر ممکن جدوجہد کرنا ان مسلمانوں کا فرض ہوگا۔ اسی طرح مسلمانوں کا یہ بھی فرض ہوگا کہ ان کی زندگی کے جو مسائل اسلامی حکومت نہ ہونے کی صورت میں اُن کے اپنے کسی اجتماعی شرعی نظام کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان کے لئے وہ شرعی اجتماعی نظام قائم کرلیں[۱]۔

جس قسم کے ملکوں کے بارے میں یہ گفتگو تھی اُن میں رہنے والے مسلمانوں کیلئے سیاست

---

[۱] اس طرح کا ایک نظام دوسری جنگِ عظیم سے کچھ پہلے تک یوگوسلاویہ میں قائم تھا، وہاں تو اس کی حیثیت ایک نیم سرکاری نظام کی تھی، اور ہمارے ہی زمانہ کے ایک بالغ النظر ہندوستانی عالم مولانا محمد سجاد مرحوم (نائب امیرِ شریعت صوبۂ بہار) نے ایسے ہی ایک نظام کا خاکہ ''محکمۂ نظارت امور شرعیہ'' کے عنوان سے غالباً ۱۹۳۸ء میں مرتب کرکے شائع کیا تھا۔

جن ملکوں میں مُسلمانوں کی آبادی بھی کافی ہے، وہاں کے مسلمان اگر حکمت و دانشمندی اور عزم کے ساتھ اس طرح کے نظام کے لئے جدّ و جہد کریں تو وہاں کی حکومتیں اس کو ماننے پر آمادہ ہوسکتی ہیں۔

اس قسم کا نظام خود اُن ملکوں اور ان حکومتوں کے لئے بھی مفید ہوگا، لیکن اگر بالفرض ان ملکوں کی حکومتیں ایسے کسی نظام کو سرکاری طور پر تسلیم نہ کریں تو مسلمانوں کے لئے اس میں تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے کہ وہ اپنی دینی ضرورتوں کے لئے اپنا ایک شرعی نظام کم از کم اسی طرح کا قائم کرلیں جس طرح کا ہمارے ملک کے صوبۂ بہار میں ''امارتِ شرعیہ'' کے نام سے ایک نظام قائم ہے۔ اگر کسی مُلک کے عام مسلمانوں کا تعاون و اعتماد ایسے کسی نظام کو حاصل ہو تو مسلمانوں کی بہت سی دینی ضرورتیں اور بہت سی وہ مشکلات جو اسلامی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے پیش آتی ہیں حل ہوسکتی ہیں۔ ۱۲

وحکومت کے باب میں جو اصلی باتیں یہاں لکھنا مناسب سمجھی گئیں وہ یہی تھیں جو لکھیں جا چکیں۔

آخر میں ہم پھر اس بات کو دہراتے ہیں کہ ان مسلمانوں کو رہنمائی کے لئے اپنے سامنے سیّدنا یوسف علیہ السلام کی اُس سرگزشت کو رکھنا چاہئے جس کو قرآن مجید نے پوری تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ جس ملک میں بھی مسلمان حقیقی ایمان، پاک سیرت اور احسانی زندگی اور دانشمندی کے ساتھ رہیں گے اور اپنے وجود کو مُلک اور اہل ملک کے لئے نفع مند ثابت کر دیں گے۔ اس ملک میں اُن کو اور اُن کے دین کو عزت و احترام کا مقام حاصل ہو کر رہے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سُنت ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔

# احسان وتصوّف

## احسان وتصوّف کی حقیقت

دین کا ایک اہم شعبہ، جس سے دین کی تکمیل ہوتی ہے، وہ ہے، جس کو حدیث نبویؐ میں ''احسان'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور ہمارے عُرف میں اسی کو تصوف بھی کہا جاتا ہے، جس کی حقیقت مختصر اور عام فہم الفاظ میں یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بندہ کے قلب کو ایسا یقین واطمینان نصیب ہو جائے جیسا کہ کسی حقیقت کے مشاہدہ سے ہوجایا کرتا ہے (جس کے بعد اس کے خلاف کسی وہم اور وسوسہ کی بھی گنجائش نہیں رہتی) پھر اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبدیت کا وہ رابطہ پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے قلب ہمہ دم اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی عظمت ومحبت سے معمور رہے اور پھر اُس بندہ کی عبادت اُس کے اخلاق، اس کی معاشرت اور اُس کے سارے معاملات، یعنی اُس کی پوری زندگی کی رُوح یہی ایمان و یقین اور یہی رابطۂ عبدیت بن جائے۔ پھر وہ جو کچھ کرے اسی ایمان اور رابطۂ عبدیت کے داعیہ سے اور اُسی کے تقاضے کے مطابق کرے اور اس طرح اُس کی قالبی اور ظاہری زندگی بھی اسی قلبی وباطنی رنگ میں رنگ جائے۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ط

احسان وتصوف کی یہ حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد ہر شخص آپ سے آپ سمجھ سکتا ہے کہ یہ عین کمالِ دین وایمان ہے اور جس کو یہ دولت جتنی نصیب ہو، اتنا ہی اس کا دین کامل ہے اور جس میں اس لحاظ سے جتنی کمی ہو، اُتنی ہی اُس کے دین کے کمال میں کمی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی مشہور حدیث جو حدیث جبرئیل کے نام سے معروف ہے اور جس میں سوال وجواب کے پیرائے میں صحابۂ کرامؓ کو بالاجمال گویا پورے دین کی تعلیم دی گئی ہے،

اُس میں اسلام وایمان کے بعد جس طرح احسان کا ذکر کیا گیا ہے اُس سے احسان کی حقیقت معلوم ہونے کے ساتھ یہ بھی اشارہ مل جاتا ہے کہ ایمان واسلام کی تکمیل مقامِ احسان ہی سے ہوتی ہے اور دین کی تکمیل کا وہی آخری عنصر ہے۔

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ چند صحابہ کرامؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ایک نو وارد اجنبی آدمی کی شکل میں آئے اور رسول اللہ ﷺ کے قریب آکر بیٹھ گئے، اور آپؐ سے سوالات کرنے شروع کئے:۔

پہلے پوچھا کہ بتلایئے ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے اس کا جواب دیا۔ پھر پوچھا کہ بتایئے اسلام کیا ہے؟ آپؐ نے اس کا بھی جواب دیا۔ (یہ دونوں سوال تو گویا دین کے نظامِ اعتقادی وعملی سے متعلق تھے) اس کے بعد تیسرا سوال یہ کیا کہ بتایئے احسان کیا ہے؟ اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا:

اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَاَنَّکَ تَرَاهُ، فَاِنْ لَمْ تَکُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ یَرَاکَ۔

اور اسی حدیث کی بعض روایات میں "اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ" کی جگہ "اَن تَخْشَى اللّٰهَ" اور بعض میں "اَنْ تَعمَلَ لِلّٰهِ" کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ مقامِ احسان یہ ہے کہ بندے کی یہ حالت ہو جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت وبندگی اس طرح کرے اور اپنے ہر کام میں اللہ تعالیٰ کا ایسا ادب ولحاظ رکھے کہ گویا اللہ تعالیٰ اُس کی نگاہ کے سامنے ہے اور وہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ کیونکہ بندہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھتا بلکہ اس دُنیا میں دیکھ ہی نہیں سکتا لیکن اس میں تو شبہ ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ حاضر ناضر ہے اور وہ بندہ کو ہر وقت دیکھتا ہے۔ لہٰذا بندے کو ہر وقت اور اپنے ہر کام میں اُس کا ایسا ہی ادب ولحاظ کرنا چاہیئے کہ گویا اللہ تعالیٰ اُس کی نگاہ کے سامنے ہے اور وہ اس کو دیکھ رہا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ یہ کیفیت جب ہی پیدا ہوتی ہے جبکہ بندہ کو حقیقتِ یقین نصیب ہو جائے اور وہ اس کے قلب پر اس طرح چھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی گویا ہر وقت اُس کے سامنے رہے۔ یہی وہ حالت ہے جس کے لئے رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ سے دُعا فرماتے تھے:۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ اَخْشَاکَ کَاَنِّیْ اَرَاکَ اَبَدًا حَتّٰی اَلْقَاکَ الخ

''اے اللہ! میری حالت یہ کردے کہ میں تجھ سے ایسا ڈروں اور تیرا ایسا ادب و لحاظ کروں کہ گویا تجھے ہر وقت دیکھ رہا ہوں (یہی میری حالت ہو جائے) یہاں تک کہ میں اسی حالت میں تجھ سے جا ملوں''۔

## حضورؔ، یادداشت ونسبتؔ، احسانی کیفیت ہی کی تعبیریں ہیں

اسی حالت و کیفیت کو حضرات صوفیہ لفظ ''حضورؔ'' و ''یادداشت'' سے تعبیر کردیتے ہیں اور اسی کو ''نسبت'' کہا جاتا ہے، اور کسی بندہ کے صاحبِ نسبت ہونے کا مطلب ان حضرات کی اصطلاح میں یہی ہوتا ہے کہ اس کو یہ دولت کسی قابل لحاظ درجہ میں نصیب ہے۔

یہ کیفیت اور یہ نسبت جب کسی بندہ کو کامل درجہ میں نصیب ہو جاتی ہے تو پھر اُس کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے غافل ہونا بھی چاہے تو غافل نہیں ہو سکتا اور وساوس وخطرات سے ایسا محفوظ ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی خطرہ اور وسوسہ قلب میں لانا بھی چاہے تو نہیں لاسکتا۔ امامِ ربّانی حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ غالبًا اپنا ہی یہ حال اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

''درویشے از مخلصاں ایں سلسلہ علیہ بحکم ''وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ'' از حال خود چنیں خبر می دہد کہ خواطر از قلب بحدے منتفی می گردد کہ اگر فرضًا عمر حضرت نوح علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسّلام بصاحب آں قلب بدہند ہرگز خاطرے بر قلب عبور نہ کند.... بلکہ در اتیان خاطر اگر سالہا تکلف نماید ہم میسر نشود''۔ (دفتر اول مکتوب نمبر ۶۰)

''اس سلسلۂ عالیہ (نقشبندیہ) سے مخلصانہ تعلق رکھنے والے ایک درویش، بحکم خداوندی ''وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ'' کے مطابق اپنا یہ حال بتاتے ہیں کہ خطرے اور وسوسے قلب سے اتنے ناپید

ہو گئے ہیں کہ اگر بالفرض حضرت نوح علیہ السّلام کی سی لمبی عمر مل
جائے تو قریباً ہزار سال کی اس طویل مُدّت میں ایک خطرہ اور
وسوسہ بھی قلب میں نہیں آئے گا، بلکہ اگر کسی خطرہ کے دل میں لانے
کی برسوں تک کوشش کی جائے گی جب بھی خطرہ نہیں آسکے گا"۔ [۱]

پھر اس نُورِ یقین، اس حضوری نسبت اور احسانی کیفیت کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تعلق کے مقابلہ میں سارے تعلقات فنا ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اُس کے تمام ظاہری و باطنی اعمال مثلاً دوستی، دشمنی، کسی سے ملنا اور کسی سے نہ ملنا، لینا اور دینا سب اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہونے لگتے ہیں۔ یہی وہ مقامِ اخلاص ہے جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ ——— (مشکوٰۃ۔ بحوالہ ابوداؤد)

"جس کا حال یہ ہو کہ وہ جس سے محبت کرے اللہ تعالیٰ ہی کے لئے
کرے اور جس سے بُغض رکھے اللہ تعالیٰ ہی کے لئے رکھے اور جس کو
کچھ دے تو اللہ تعالیٰ ہی کے لئے دے اور جس کے دینے سے ہاتھ
روکے، اللہ تعالیٰ ہی کے لئے روکے، تو اُس نے اپنا دِین کامل کر لیا"۔

اس دولت کا اعلیٰ ترین درجہ رسول اللہ ﷺ کا حصّہ تھا اور اس کی وجہ سے علم و معرفت اور تقویٰ و خشیت میں بھی سب سے بلند مقام آپؐ ہی کا تھا۔ چنانچہ ایک موقع پر ارشاد بھی فرمایا:۔

اِنَّ اَتْقَاكُمْ وَاَعْلَمَكُمْ بِاللّٰهِ اَنَا (صحیح بخاری، کتاب الایمان)

"میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور اُس کا ادب

---

[۱] اور جو لوگ اپنی محرومی و بے نصیبی اور عدم مناسبت کی وجہ سے اس سے انکار کریں اور اس کو "افسانہ" کہیں، اُن کے بارے میں اسی مکتوب کے آخر میں امام ربانی نے عارف رومی کے یہ دو شعر لکھے ہیں۔

هر کس افسانه بخواند افسانه است — وانکه دیدش نقد خود مردانه است
آب نیل است و بقبطی خوں نمود — قوم موسیٰ را نه خوں بود آب بود

ولحاظ کرنے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے متعلق علم و یقین میں بھی سب سے زیادہ حصہ میرا ہی ہے''۔

پھر آپؐ کے فیضِ صحبت سے یہ دولت اپنی اپنی استعداد اور اپنے اپنے احوال کے مطابق صحابۂ کرام کو بھی بالعموم حاصل تھی اور ہر دَور کے اولیاء اللہ کا خاص سرمایہ بھی یہی دولت رہی ہے۔ یعنی یہ نورِ یقین اور اس سے پیدا ہونے والا رابطۂ عبدیت اور کیفیت خشیت و محبت، تصوّف کے سارے اذکار و اشغال اور مجاہدات کا مقصود و منتہیٰ یہی ہے۔

ہمارے اس صدی کے ربّانی عالم اور محقق صوفی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (نوّر اللہ مرقدہٗ) اپنے ایک مکتوب میں اسی نورِ یقین کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

''یہ انتہا سب طرُق کی ہے...... صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے تمام اپنا جان و مال اور آبرو و جاں کیوں دی تھی؟ کیا دیکھا تھا یہی کہ فیضِ صحبت فخرِ عالم علیہ السّلام سے یقین حاصل ہو گیا تھا۔ پس اس پر مدار سب کام کا تھا۔ حضرت سیّدی عبدالقادر جیلانی اور خواجۂ خواجگان معین الدین چشتیؒ اور سیّد الطائفہ بہاء الدین بخاری کیوں بڑے ہو گئے؟ اسی یقین کے سبب سے بڑے ہوئے تھے''۔

چند سطر کے بعد فرماتے ہیں:۔

''اس نسبت کا نام احسان ہے کہ بعثت جناب فخرِ رُسُل علیہ السلام کی اس کے ہی واسطے تھی اور صحابہ جملہ اس نسبت کے حامل تھے۔ علیٰ حسبِ مراتبہم، پھر اولیاء امت نے اس کو دوسرے طریقے سے پیدا کیا۔

(مکاتیبِ رشیدیہ صفحہ ۸۱)

الغرض اس باب میں اصل چیز اسی نُورِ یقین اور اسی احسانی نسبت کی تحصیل ہے اور جیسا کہ معلوم ہوا، صحابۂ کرامؓ کو یہ چیز کامل عقیدت و محبت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی صحبت اور آپ کی ہدایت کے مطابق اعمالِ خیر کی مشغولیت اور اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی سے حاصل ہوئی تھی۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے دُنیا سے تشریف لے جانے کے بعد

اکابر صحابہ (جو اس دولت میں امتیازی مقام رکھتے تھے) انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی صحابۂ کرام کی پوری جماعت اس باب میں گویا آپ کی قائم مقام تھی، اور ایمان واعمالِ صالحہ اور عقیدت ومحبت کے ساتھ ان حضرات کی صحبت ورفاقت اس مقصد کے حصول کے لئے کافی ہوجاتی تھی۔

## احسانی نسبت پیدا کرنے کے لئے
## طریقۂ صوفیہ کا آغاز

پھر اس کے بعد جب صحابۂ کرام بھی دُنیا میں نہیں رہے اور مُرورِ زمانہ کے ساتھ اسلامی معاشرہ میں خیر کی مقدار گھٹتی اور شر کی مقدار بڑھتی رہی، تو ایک وقت آیا کہ اُمّت کے ایسے افراد نے جو اُس دَور میں اس احسانی نسبت کے خاص وارث اور امین تھے (اور جن کو اس شعبہ میں تخصص وحذاقت کا قریباً وہی مقام حاصل تھا جو فقہ میں ائمہ مجتہدین کو حاصل تھا) یہ دیکھ کر کہ اب ہماری اس دُنیا میں رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرامؓ کی موثر صحبتیں بھی موجود نہیں ہیں اور اسلامی معاشرہ میں بھی بہ نسبت سابق کے خیر بہت کم اور شر بہت زیادہ ہوگیا ہے۔ قلب میں نورِ یقین اور احسانی کیفیت اور اللہ کی محبت وخشیت پیدا کرنے کے لئے بطور تدبیر کے کچھ ایسے اعمال واشغال تجویز کیے جن کو انھوں نے اس کے حصول میں مفید اور معاون سمجھا۔ مثلاً کثرتِ ذکر، مراقبہ اور مجاہدہ نفس وغیرہ، جن کا اس مقصد کے حاصل ہونے میں مفید اور معاون ہونا عقلی طور پر بھی سمجھ میں آنے والی بات ہے اور ان کی اس خصوصیت اور تاثیر پر نصوص میں واضح اشارات بھی ملتے ہیں اور پھر ان بزرگوں کی اصابتِ رائے پر سب سے بڑی مُہر جمہورِ اُمت کی قبولیت اور تجربہ کی کامیابی نے لگائی۔

## ہزار سال سے زیادہ کا تجربہ
## اور صلحائے اُمت کا اتفاق

قریباً ہزار سال بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت سے امت محمدیہ کے صالح ترین طبقہ

نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ نورِ یقین اور رابطہ مع اللہ یعنی احسانی نسبت حاصل کرنے کے لئے صوفیاء کرام کا یہ طریقہ (جس کا نام سلوک وطریقت ہے) اصولاً صحیح اور نتیجۃً کامیاب ہے۔ کون اس سے انکار کرسکتا ہے کہ مشاہیر اولیاء امت مثلاً خواجہ معروف کرخی، بشر حافی، سری سقطی، شفیق بلخی، بایزید بسطامی، جنید بغدادی، ابوبکر شبلی، شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ احمد رفاعی، شیخ ابوالحسن شاذلی، خواجہ عثمان ہارونی، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بہاء الدین نقشبند۔ اور پھر ہمارے اس دوسرے ہزارہ کی گزشتہ تین صدیوں میں خواجہ باقی باللہ، امام ربانی مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندیؒ اور اُن کے خلفاء اور شاہ ولی اللہ دہلوی اور سید احمد شہید (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین) اور اُن جیسے ہزاروں، بلاشبہ ہزاروں، بلکہ لاکھوں افراد ہیں جو اپنے اپنے وقت میں اس نسبت کے حامل، بلکہ اس راہ کے امام اور داعی ہوئے ہیں اور ان میں سے ایک ایک کی صحبت وتربیت سے اللہ تعالیٰ کے ہزاروں، لاکھوں، بندوں کو یہ دولت حاصل ہوئی ہے۔

جو شخص ان سلسلوں سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ ان بزرگوں کو جو کچھ حاصل ہوا اسی راہ سے حاصل ہوا تھا۔

پس جس طریقہ نے اُمتِ محمدیہ میں اتنے کاملین اور اس قدر اصحابِ احسان ویقین پیدا کئے ہوں جن کو بجا طور پر اس امت کا گلِ سرسبد کہا جاسکتا ہے اُس کے صحیح اور کامیاب ومقبول ہونے میں کیا شُبہ ہوسکتا ہے۔

## اغلاطِ تصّوف اور ان کی اصلاح

ہاں! جس طرح دین کے دوسرے شعبوں میں عقائد میں بھی اور اعمال میں بھی اُمّت کے بعض حلقوں سے چھوٹی بڑی غلطیاں بھی ہوئی ہیں، اسی طرح سلوک وتصّوف کا شعبہ بھی غلطیوں سے محفوظ نہیں رہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس طرح علماء ربانی ومجدّدینِ اُمت کے ذریعہ عقائد واعمال کی غلطیوں کی اصلاح ہوتی رہی ہے، اسی طرح اس شعبۂ احسان وتصّوف کے سلسلہ کی اغلاط وضلالات کی اصلاح بھی من جانب اللہ محققینِ صوفیاء

کے ذریعہ برابر ہوتی رہی ہے۔ ؎

پس کسی کے لئے جس طرح یہ درست نہیں ہے کہ وہ دین کے نظام عقائد یا نظامِ اعمال میں کچھ طبقوں کی غلط روی کی وجہ سے غیر مطمئن ہوکر عقائد واعمال کی فکر سے بے نیاز ہوجائے۔ اسی طرح کسی کے لئے یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ وہ سلوک وتصوف میں کچھ لوگوں کی غلط روی کی وجہ سے دین کے اس شعبہ ہی سے بے نیاز ہوجائے جس کے بغیر بندہ کا دین کامل نہیں ہوسکتا اور حلاوتِ ایمان نصیب نہیں ہوتی۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اُس سے ناظرین کو یہ تو معلوم ہوگیا کہ دین میں ''احسان'' کا مقام کیا ہے اور اس کی کیا حقیقت ہے اور یہ بھی کہ طالبوں کے لئے اس مقام تک پہنچنے کی عام شاہراہ وہی ہے جس کو ہمارے عرف میں سلوک وطریق کہتے ہیں۔

## ضرورت مُرشد

اس کے بعد معلوم ہونا چاہئے کہ اس فن کے ائمہ اور ماہرین سب اس پر متفق ہیں اور سلوک کے تمام سلسلوں کا یہی تعامُل بھی ہے کہ اس راہ کو طے کرنے کے لئے کسی رہنما کی رہنمائی ضروری ہے، یعنی جس طرح کوئی شخص صرف طِب کی کتابیں دیکھ کر اپنی اور دوسروں کی بیماریوں کا علاج نہیں کرسکتا اور اگر کرے تو غلط اور خطرناک ہے۔ اسی طرح اس روحانی

---

؎ خاص کر ان آخری ۳-۴ صدیوں میں تصوف کی اصلاح وتجدید کا جو کام ہندوستان میں ہوا ہے، وہ تو دُودھ اور پانی کو الگ الگ کرنے کا بہترین نمونہ ہے۔ امام ربانی حضرت مجددؒ الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے فرزند وجانشین خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات کے ضخیم ضخیم دفتر، پھر حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی تصانیف اور اُن کے مکاتیب، پھر حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کا مرتب کیا ہوا حضرت سیدؒ احمد شہیدؒ کے ملفوظات وافادات کا مجموعہ (صراط مستقیم)۔

پھر خاص ہماری اس صدی میں حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے اس سلسلہ کے رسائل ومکاتب اور سب سے آخر میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا تصنیف کیا ہُوا اس سلسلہ کا ایک پُورا کتب خانہ۔ ان کوششوں نے تصوف کو اتنا صاف وروشن اور ایسا بے غل وغش کردیا ہے کہ اب اس راہ میں کسی کا گمراہ ہونا صرف اس کی بدقسمتی ہے۔

معالجہ میں بھی کسی ایسے روحانی طبیب سے استفادہ اور اس کی ہدایات وتجاویز کا اتباع ضروری ہے جو خود اسی طریقہ پر چل کر یہ مقصد یعنی احسانی کیفیت اور رابطہ مع اللہ پیدا کر چکا ہو، اور اس راہ کے گرم و سرد سے واقف ہو۔ اس لئے طالب کا پہلا کام اور پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ اپنی رہنمائی کے لئے اپنی مناسبت کے لحاظ سے وہ کسی صاحبِ نسبت اور صاحبِ ارشاد کا انتخاب کرے اور اُس سے علاج اور رہنمائی کا طالب ہو۔ اسی کا نام ارادت ہے۔

اس میں تو کوئی شُبہ نہیں کہ ایسے بندگانِ خدا کی روز بروز کمی ہوتی جارہی ہے لیکن الحمدللہ دُنیا ابھی اللہ والوں سے خالی نہیں ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے اب بھی موجود ہیں جن کے بارے میں اپنے محدود بشری علم واندازہ کے مطابق کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہمارے اس زمانہ میں اس دولت ونسبت کے وارث اور امین ہیں اور ان کی رہنمائی میں اس راہ پر چلنے والے اور محنت ومجاہدہ کرنے والے مخلص طالب انشاءاللہ محروم نہیں رہیں گے۔

## اللہ والوں کی پہچان

اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ جو شخص بھی کہیں پیر بنا بیٹھا ہے وہ اس راہ کی رہنمائی کا اہل ہے۔ کون اس صورتِ حال سے ناواقف ہے کہ آج کل جس طرح عالموں، مولویوں، طبیبوں اور ڈاکٹروں میں ناقص وکامل اور اصلی ونقلی سب طرح کے ہیں۔ اسی طرح ''پیروں'' میں بھی سب طرح کے ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہاں نقل اصل سے بہت زیادہ ہے۔ لیکن جس طرح دُوسری لائنوں میں اصلی اور نقلی کو پہچانا جاسکتا ہے، اسی طرح تصوف کی اس لائن میں بھی اہل و نااہل کا پہچاننا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔

اس راہ کے محققین نے جو علمِ شریعت کے بھی ماہر ہیں (مثلاً قریبی زمانہ کے بزرگوں میں حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت قاضی ثناء اللہ رحمہما اللہ) کتاب وسُنّت کے اشارات اور اپنی دینی فہم وفراست اور اس راہ کے تجربہ سے اللہ تعالیٰ کے صادق بندوں کی ایسی علامتیں لکھ دی ہیں جن سے اہلِ قلوب واصحابِ ارشاد کو پہچانا جاسکتا ہے۔ سب سے بڑی نشانی ان بزرگوں نے اللہ تعالیٰ کے صادق اور صاحبِ نسب وارشاد بندوں کی یہ لکھی ہے کہ تقویٰ واتباعِ شریعت کے ساتھ ان کی یہ کیفیت ہو کہ اُن کے قریب رہنے سے اللہ

تعالیٰ یاد آتا ہو، دُنیا کی محبت کم ہوتی ہو اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور آخرت کی فکر بڑھتی ہو اور ان کی رہنمائی میں اس راہ پر چلنے والوں میں یہ چیزیں صاف محسوس ہوتی ہوں۔

پس طالب کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی ایسے بندے کو یا تو خود تلاش کرے یا اگر دوسرے ثقہ اور اصحابِ نظر حضرات کے بتانے سے کسی بزرگ کے متعلق اس بارہ میں اطمینان ہو جائے اور اُن کی خدمت میں پہنچ کر وہ اطمینان اور بڑھے تو پھر ان کی طرف رجوع کرے اور ان سے رہنمائی کا طالب ہو، اور پھر ان کی تجاویز و ہدایات کی اسی طرح پیروی اور پابندی کرے جس طرح جسمانی مریض اپنے معالج طبیب کے نسخہ اور ہدایات کی پابندی کرتا ہے۔

اگر ایسا کیا گیا تو انشاء اللہ محرومی نہیں رہے گی اور اللہ تعالیٰ اُس نورِ یقین اور اس احسانی کیفیت کا کوئی حصہ ضرور نصیب فرمائیں گے جس سے دین و ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔ ایمان بالغیب مثل ایمان بالشہود کے ہو کر ہر قسم کے شک و شُبہ اور وسوسہ سے محفوظ ہو جاتا ہے اور جس کے نتیجہ میں پوری زندگی احسانی زندگی بن جاتی ہے۔

سلوک وتصوف کا اصل موضوع اور اس کی اصل غایت تو یہی نورِ یقین اور احسانی کیفیت اور رابطہ مع اللہ ہے۔ لیکن یہ جیسی اعلیٰ ترین نعمت ہے ویسی ہی اُس کی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ یعنی صرف وہی طالبانِ خدا اس کو حاصل کر سکتے ہیں جو صرف اسی کو اپنا مطلوب و مقصود بنالیں اور اس کی طلب میں اپنا عیش و آرام اور اس کے علاوہ بھی اپنا سب کچھ قربان کر دینے کی ہمت کر سکیں اور اپنی جان کو بھی اس راہ میں بے قیمت کر دینا اُن کے لئے آسان ہو۔ اس لئے ہر دور میں اس کے طالب اور اس راہ کے سالک کم ہی رہے ہیں۔

## اصلاحِ عام

لیکن اس سے نیچے کا ایک درجہ یہ ہے کہ بندہ اس کی فکر اور کوشش کرے کہ عقائد کی صحت اور پختگی کے ساتھ اس میں عبادت اور یادِ الٰہی کا کچھ ذوق و شوق پیدا ہو جائے اس میں اُسے لذّت آنے لگے۔ اُس کی کم از کم ضروری درجہ کی عملی اور اخلاقی اصلاح ہو جائے۔ بُرے اعمال سے اُسے نفرت اور اچھے اعمال کی اُسے رغبت ہو جائے اور اُسی کے

مطابق اُس کی عادت بن جائے [1]۔

الحمد للہ اس کی فکر اور اس کا شوق مُسلمانوں کے دیندار طبقہ میں ابھی اچھی خاصی حد تک باقی ہے اور اصحابِ ارشاد مشائخ کے پاس آنے والے اکثر طالبین فی زماننا اسی مقصد کو لے کر آتے ہیں۔

اوپر جس نسبتِ احسانی اور رابطہ مع اللہ کا ذکر کیا گیا (جو سلسلۂ تصوّف کی اصل غایت ہے) اس کے بارے میں تو یہ عاجز کچھ عرض کرنے کا بالکل بھی اہل اور حق دار نہیں ہے، اس کے طالبوں کو تو کسی صاحبِ دولت سے وابستہ ہو کر اور اُن کی رہنمائی و نگرانی ہی میں یہ سفر شروع کرنا چاہئے۔

لیکن دوسرے درجہ کے طالبین کے لئے چند وہ اصلاحی باتیں یہاں لکھ دینے میں، جن کی اپنے بزرگوں کو تلقین کرتے ہوئے دیکھا ہے (اور جو عمومی قسم کی دینی و شرعی ہدایات ہیں) یہ ناچیز کوئی حرج نہیں سمجھتا، بلکہ امید رکھتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے کسی بندہ نے بھی ان پر عمل کیا اور کچھ فائدہ اُٹھایا تو ارحم الرحمین جتنا اجر و ثواب اُس بندے کو اُس کے عمل کا عطا فرمائے گا، اُتنا ہی اپنے قانونِ کرم "مَنْ دَلَّ عَلٰى خَيْرٍ فَلَهٗ مِثْلُ اَجْرِ فَاعِلِهٖ" [2] کے مطابق اس بے عمل ناکارہ کو بھی عطا فرمائے گا۔

بس اسی اُمید اور طمع میں ایک مختصر اصلاحی لائحۂ عمل اس دوسرے درجہ کے طالبوں کے لئے لکھتا ہوں۔

## اس درجہ کے طالبین کے لئے ابتدائی لائحۂ عمل:

(۱) سب سے مقدم چیز ایمان اور عقائد کی درستگی و پختگی ہے۔ عقیدہ اگر خراب ہو،

---

[1] حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے طریقے پر اس کو احسان کا عوامی اور لازمی درجہ قرار دیا جا سکتا ہے جس سے عام مسلمانوں کو حتیٰ کہ اُن میں کے مزدوروں اور دست کاروں جیسے مشغولین کو بھی خالی نہ رہنا چاہئے۔ بعض اکابر کی اصطلاح میں اس کو "اصلاحِ عام" بھی کہا جاتا ہے اور ہم نے عنوان میں اسی اصطلاح کو اختیار کیا ہے۔ ۱۲

[2] یہ حدیث نبویؐ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی نیک کام کی طرف رہنمائی کرنے والے کو بھی اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا کہ اُس کے کرنے والے کو ملے گا۔ (رواہ مسلم)

مثلاً کسی قسم کے اعتقادی شرک میں مبتلا ہو یا عقیدے میں کوئی اور ایسی ہی خرابی ہو تو ہر عمل اکارت ہے۔ حتیٰ کہ اگر ہمیشہ دن کو روزہ رکھے اور پوری رات عبادت و ذکر کیا کرے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اُس کی کوئی قیمت نہ ہوگی۔ اس لئے پہلا کام ایمان اور عقیدہ کی درستی ہے۔ اس کتاب کے شروع میں، اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اصولی اور اجمالی حد تک وہ بھی کافی ہے۔

(۲) دین کے ضروری احکام و مسائل (خواہ اُن کا تعلق نماز روزہ وغیرہ عبادات سے ہو جن کا ہر شخص مکلّف ہے یا روزمرہ کے اپنے دوسرے معاملات سے) اگر معلوم نہیں ہیں تو ان کے معلوم کرنے اور سیکھنے کا اہتمام کیا جانے اور اپنے حالات کے لحاظ سے جو طریقہ اس کے لئے سہل اور مناسب ہو، وہ اختیار کیا جائے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کے احکام کے بارے میں اب تک جو کوتاہیاں ہوتی رہی ہیں اور زندگی کا جو حصّہ معصیت اور غفلت میں گزرا ہے اس سے سچّی توبہ کر کے آئندہ کے لئے اُس مالک کے حکموں پر چلنے کا اور بندگی والی زندگی گزارنے کا پختہ فیصلہ اور پکّا ارادہ کیا جائے۔

(یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو جس چیز کا بھی حکم ہے وہ وہی ہے جس کو بندہ کر سکتا ہے اور بغیر کسی مشکل میں پڑے کر سکتا ہے۔ جس عمل کا کرنا بندے کے اختیار میں نہ ہو اُس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مُطالبہ ہی نہیں ہوتا۔ دین میں تو آسانی کا اتنا لحاظ ہے کہ اگر بیماری کی وجہ سے نماز کھڑے ہو کر پڑھنی مشکل ہو تو بیٹھ کے اور یہ بھی مشکل ہو تو لیٹے لیٹے پڑھ لینے کی اجازت ہے۔ اسی طرح بیماری کی وجہ سے اور صرف سفر کی وجہ سے بھی رمضان کے روزے قضاء کر دینے کی اجازت ہے، یہی حال سارے احکام کا ہے۔ اس لئے دین پر چلنا ہرگز مشکل نہیں ہے، جن کو مشکل معلوم ہوتا ہے ہمّت نہ کرنے اور عادت نہ ہونے کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے، اگر ہمت کر لی جائے اور چند دن کر کے عادت ڈال لی جائے، تو پھر انشاء اللہ یہ

حالت ہو جائے گی کہ دین پر چلے بغیر چین ہی نہ ملے گا''۔)

(۴) ہم بشر ہیں اور ہمارے ساتھ بشری کمزوریاں لگی ہوئی ہیں۔ شیطان اور نفس کا بھی ہر وقت کا ساتھ ہے اس لئے ایسا ہوتا ہے کہ آدمی معصیت سے بچنے کا اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلنے کا پکّا ارادہ کر لیتا ہے لیکن شیطان و نفس کے بہکانے سے پھر اُس سے معصیت ہو جاتی ہے۔ اس لئے اپنا یہ دستور و معمول بنا لیا جائے کہ جب کوئی غلط قدم اُٹھ جائے اور کوئی معصیت ہو جائے تو شعور اور تنبّہ ہو جانے پر فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لی جائے اور آئندہ کے لئے اُس سے بچنے کا عہد کر لیا جائے۔ گناہ کے بعد رنجیدہ اور نادم ہو کر توبہ کر لینے سے گناہ کے بالکل معاف اور کالعدم ہو جانے کے علاوہ بندہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور محبّت کا مستحق ہو جاتا ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ۔

''اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے بندوں کو پیار کرتا ہے''۔

اور اگر معصیت ایسی ہوئی ہے جس کا تعلق کسی بندہ کے حق سے بھی ہے مثلاً کسی پر کوئی ظلم ہو گیا ہے، کسی کی غیبت کی ہے، کسی کا کوئی حق مار لیا ہے، یا کسی کا دل دکھایا ہے تو اُس کے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے کے علاوہ اُس صاحبِ حق بندہ سے معاف کرانا یا اس کا حق ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ اسی کتاب میں ''معاشرت و معاملات'' کے بیان میں وہ حدیث ذکر کی جا چکی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ بعض لوگ قیامت کے دن اس حال میں آئیں گے کہ اُن کے پاس عبادات، نماز، روزہ، صدقہ و خیرات وغیرہ کا پورا ذخیرہ ہوگا، لیکن اسی کے ساتھ اُن کے ذمّہ بہت سے بندوں کے حقوق بھی ہوں گے، کسی کو ستایا ہوگا، کسی کا حق مارا ہوگا، کسی کی غیبت یا آبروریزی کی ہوگی، کسی کو گالی دی ہوگی، وغیرہ وغیرہ۔ تو وہاں اُن کی ساری عبادتیں اُن کے مظلوم حق داروں کو دلوا دی جائیں گی اور جن حق داروں کا حساب اُن کی عبادتوں سے بھی پورا نہ ہو سکے گا، اُن کے گناہ اِن ظالم عبادات گزاروں کے سر پر لاد کر ان کو جہنّم میں جھونک دیا جائے گا۔ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا۔

(۵) دین میں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اخلاق کی جو اہمیّت ہے، اور کسی آدمی کو اللہ کریم کی رحمت اور رضا کا مستحق بنانے میں حسنِ اخلاق کو جتنا دخل ہے اس کا بیان اسی کتاب

میں ''اخلاق'' عنوان کے تحت کیا جا چکا ہے، اس لئے طالب خدا اور طالبِ دین کی بڑی فکر یہ ہونی چاہئے کہ اس کی زندگی اچھے اخلاق سے آراستہ اور بُرے اخلاق (یعنی رزائل) سے پاک ہو جائے۔ لیکن اخلاق کا تعلق چونکہ بہت کچھ بندہ کی جبلت اور اُس کے پیدائشی مزاج سے ہے اس لئے اصلاحِ اخلاق کا معاملہ بہ نسبت اصلاحِ اعمال کے زیادہ مشکل ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ جس کے لئے آسان کر دے اُس کے لئے مشکل نہیں۔

اس کی ایک عام تدبیر یہ ہے کہ اچھے اخلاق مثلاً تواضع، نرمی، حلم، ترحم، وشفقت، صبر وقناعت، ایثار وفیاضی، دوسروں کی خیر خواہی وغیرہ کے تقاضوں پر اہتمام اور تکلّف سے عمل کیا جائے اور اسی طرح ان کے اضداد رزائل، مثلاً کبر، غصہ، بخل، طمع، حسد، شماتت وخود غرضی وغیرہ کے تقاضوں کے خلاف چلنے کے لئے عزیمت سے کام لیا جائے اور اس بارے میں اپنی قوتِ ارادی کو پوری طرح استعمال کیا جائے۔ انشاء اللہ تھوڑے دنوں کے اس مشق ومجاہدہ سے طبیعت اس سانچہ میں ڈھل جائے گی۔

حدیث نبویؐ:۔ من يستعف يعفه الله ومن يستغن يغنيه الله ومن يتصبر يصبّر الله" [1] اور آپؐ کے ارشاد " امسح رأس اليتيم" [2] میں اسی طریق علاج کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، اور اطباء اخلاق کا یہی تجربہ بھی ہے۔

(۲) عبادات، خاص کر نماز اچھی طرح ادا کرنے کا اہتمام کیا جائے اور نفلی عبادات کا بھی اپنے کو عادی بنایا جائے۔ نفلی نمازوں میں خصوصیت سے تہجد کا اہتمام کیا جائے۔ عبادات خواہ بدنی ہوں، خواہ مالی، خواہ مرکب قسم کی اور خواہ فرائض ہوں یا نوافل، (اگر روح سے خالی نہ ہوں تو) قربِ خداوندی اور روحانی ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔

---

[1] اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بہ تکلّف عفت کا طرزِ عمل اختیار کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو باعفت بنا دیں گے اور جو شخص بہ تکلّف استغنا کا رویہ اختیار کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو غنا عطا فرما دیں گے اور جو شخص ہمت سے صبر کا رویہ اختیار کرے گا، اللہ تعالیٰ اُس کو صابر بنا دیں گے۔ (بخاری ومسلم)

[2] ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے دل کی سختی کی شکایت کی تو آپؐ نے ان کو یہ ہدایت فرمائی جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''تم یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو''۔ (مسند احمد)

نماز، روزہ، اور صدقہ وخیرات وغیرہ عبادات کو بہتر طریقہ سے ادا کرنے اور اُن کو جاندار اور موٴثر بنانے کے لئے جو مشورے اس کتاب میں عبادات کے بیان میں دیئے گئے ہیں انشاء اللہ اُن پر عمل کرنا اس بارے میں بہت مفید ہوگا۔

(۷) قرآن مجید کی تلاوت اور ذکر اللہ کا بھی کچھ معمول مقرّر کرلیا جائے۔ مثلاً صبح شام ایک تسبیح (یعنی سودفعہ) کلمۂ تمجید:۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَر"۔ اور ایک تسبیح استغفار، اور ایک تسبیح درود شریف کی پابندی سے روزانہ پڑھ لی جائے اور ان کلمات کو معنی مطلب کے دھیان کے ساتھ دل لگا کر اور ذوق لے لے کر پڑھا جائے اور اس پڑھنے میں ثواب اور رضائے الٰہی کے علاوہ یہ بھی نیت رکھی جائے کہ ان کی برکت سے دل کو اللہ تعالیٰ کے نامِ پاک کی نورانیت اور اس کی محبت نصیب ہو۔

اس کے علاوہ ہر نماز کے بعد تسبیح فاطمہ یعنی ۳۳ دفعہ سُبْحَانَ اللّٰہ، ۳۳ دفعہ الحمد للّٰہ ۳۴ دفعہ اللّٰہ اکبر پڑھنے کی بھی حتی الوسع پابندی کی جائے، اس میں پورے پانچ منٹ بھی نہیں لگتے۔ بس اہتمام کی ضرورت ہے۔

رات کو سوتے وقت بستر پر پہنچنے کے بعد بھی یہی تسبیح فاطمہ اور ۳ دفعہ کلمہ استغفار "استغفر اللّٰہ الذی لا الٰہ الّا ھو الحیّ القیُّوم واتوبُ الیہ" پڑھ لیا جائے۔

قرآن مجید کی تلاوت کے لئے بھی کوئی مناسب وقت مقرر کیا جائے۔ تلاوت کی مقدار اگرچہ کم سے کم ہو (مثلاً رکوع دو رکوع ہی ہو) لیکن پابندی اور صحت کے اہتمام کے ساتھ اور ادب وعظمت کے ساتھ ہو۔

اس کی بھی عادت ڈالی جائے کہ اپنے کاروبار اور دوسرے کاموں کی مشغولیت کے اوقات میں کسی عنوان سے اور کسی انداز میں اللہ تعالیٰ کا نامِ پاک تھوڑی تھوڑی دیر بعد زبان پر آیا کرے۔ مثلاً "یَا اللّٰہ" یا "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" یا پورا کلمۂ طیبہ، یا کلمۂ شہادت یا استغفار یا کوئی اور ایسا ہی کلمہ۔ تھوڑے دنوں کی ارادی مشق کے بعد انشاء اللہ یہ عادت

ہو جائے گی: ـ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ"[1] کے زمرے میں شامل ہونے کی ایک صورت یہ بھی ہے۔

(۸) رات کو بعد نمازِ عشاء یا دن میں اطمینان کا کوئی وقت اس کے لئے مقرر کر لیا جائے کہ اپنے خیالات کو ہر طرف سے ہٹا کے چار پانچ منٹ اپنی موت کا مراقبہ کیا جائے، یعنی یہ سوچا جائے کہ جب موت آئے گی (جو بالکل یقینی ہے) تو مجھ پہ کیا گزرے گی؟ پھر نہلا کفنا کے اور نمازِ جنازہ پڑھ کر جب مجھے قبر کے سپرد کر دیا جائے گا، تو تنہائی کے اُس گھر میں میرا کیا حال ہوگا؟ پھر اگر میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور بخشش کے قابل نہ ہُوا، تو قیامت تک کا طویل زمانہ کیسی مصیبت سے کٹے گا۔ پھر قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی اور میرا نامۂ اعمال میرے سامنے رکھا جائے گا اور حساب ہوگا تو اُس وقت میری کیا حالت ہوگی؟ (موت اور اس کے بعد کی ان منزلوں کا اس طرح تصوّر کیا جائے کہ گویا اس وقت وہ اسی منزل میں ہے) اس کے بعد الحاح کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنے سب گناہوں سے معافی مانگی جائے، اور ایمان پر خاتمہ اور قبر اور اگلی منزلوں میں رحم و کرم کا معاملہ کرنے کی دُعا کی جائے۔ اس مراقبہ کے لئے ۴ یا ۵ منٹ کافی ہو جاتے ہیں، بس اہتمام کی ضرورت ہے۔

(۹) ذکر و عبادت اور جو نیک عمل بھی کیا جائے، دل میں اُس کے ثواب کا یقین رکھتے ہوئے ثواب اور رضائے الٰہی کی غرض سے نیت اور دھیان کے ساتھ کیا جائے۔ دین کی خاص اصطلاح میں اس کا نام ایمان و احتساب ہے، جو دو رکعت نماز ایمان و احتساب کے ساتھ پڑھی جائیں وہ اُن دو سو رکعتوں سے زیادہ قیمتی ہے جو اُس کے بغیر پڑھی جائیں۔ نیت اور ایمان و احتساب وہ کیمیا ہے جس سے کھانا کمانا، چلنا پھرنا، بیوی بچوں سے ہنسنا بولنا، غرض زندگی کا ہر جائز عمل عبادت یعنی کارِ ثواب بن جاتا ہے۔

(۱۰) اپنے دینی اور جائز دنیوی مقاصد و ضروریات کے لئے دُعا کرنا، اُن کے حصول کا ذریعہ اور وسیلہ ہونے کے علاوہ ایک مستقل عبادت بھی ہے، بلکہ رسول اللہ ﷺ

---

[1] قرآن مجید کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کی یہ صفت بیان کی ہے کہ "ان کو تجارت اور خرید و فروخت کی مشغولیت اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتی"۔

کی ایک حدیث میں دعا کو "عبادت کا مغز اور جوہر" بتلایا گیا ہے۔[۱] فرمایا گیا ہے کہ "جس بندہ کے لئے دُعا کا دروازہ کھُل گیا اُس کے لئے رحمت کے دروازے کھُل گئے"۔[۲]

اس لئے طالبِ خدا کو چاہئے کہ وہ دُعا کو اللہ تعالیٰ کی رضا و رحمت اور اُس کے قرب کا خاص وسیلہ جانتے ہوئے دُعاؤں کی کثرت کرے، خاص کر نمازوں کے بعد اور اس کے علاوہ مناسب اوقات میں اہتمام اور الحاح کے ساتھ دُعا کیا کرے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو جو نعمتیں عطا ہوئی تھیں اُن میں ایک خاص الخاص نعمت دُعا کے مضامین اور اُن کا سوز و گداز تھا۔ آپ کی سینکڑوں دُعائیں حدیث کی کتابوں میں محفوظ ہیں، ان میں بڑی نورانیت اور برکت ہے۔ بعض بندگانِ خدا نے آپؐ کی دُعاؤں کے مستقل مجموعے بھی تیار کر دیئے ہیں، ان میں مُلّا علی قاریؒ کی "الحزبُ الاعظم" اور حکیم الامّت حضرت تھانویؒ کی "مناجات مقبول"[۳] اُردو ترجموں کے ساتھ چھپی ہوئی عام طور سے مل جاتی ہیں۔ دونوں ہفتوں کے سات دنوں کے لحاظ سے سات سات منزلوں پر تقسیم ہیں، اگر ہو سکے تو اُن میں سے کسی ایک کی ایک منزل روزانہ پڑھ لی جایا کرے۔

اس عاجز راقم سطور نے اپنی کتاب "اسلام کیا ہے" کے آخر میں قرآن و حدیث سے منتخب کر کے مختصر اور ایسی جامع چالیس دُعائیں شامل کر دی ہیں جن میں دُنیا و آخرت کی ہر ضرورت آ گئی ہے۔ ان کو ترجمہ کے ساتھ بھی صرف پانچ منٹ میں پڑھا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کم از کم ان ہی دُعاؤں کو اپنا ورد اور معمول بنالیں۔

اگر عمل کیا جائے تو طالبینِ اصلاح کے لئے یہ دس نمبر انشاء اللہ تعالیٰ کافی ہیں، لیکن اکثر طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ایسی باتوں کا کسی کتاب میں پڑھ لینا اُن کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ کسی "زندہ کتاب" سے استفادہ اور صحبت کے بغیر عمل کی گاڑی نہیں چلتی۔ یہ بات عقلِ سلیم والوں کے لئے بدیہی ہے ؎

شو ہمدمِ پروانہ تا سوختن آموزی
با سوختگاں بنشیں شاید کہ تو ہم سوزی

---

[۱] [۲] رواھما الترمذی (مشکوٰۃ) [۳] الحمد للہ "مناجات مقبول" مولانا عبدالماجد دریابادی کے ترجمہ کے ساتھ الفرقان بکڈپو سے شائع ہو کر دستیاب ہے۔

# رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

# دو خاص دُعائیں

پچھلے صفحہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاؤں کا ذکر آیا ہے۔ برکت اور حُسنِ اختتام کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو دُعائیں یہاں نقل کی جاتی ہیں، اور بس یہی اس کتاب کا خاتمہ ہے۔

## (۱)

اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ تَسْمَعُ کَلَامِیْ وَتَرٰی مَکَانِیْ وَتَعْلَمُ سِرِّیْ وَعَلَانِیَتِیْ وَلَا یَخْفٰی عَلَیْکَ شَیْءٌ مِنْ اَمْرِیْ وَاَنَا الْبَائِسُ الْفَقِیْرُ اَلْمُسْتَغِیْثُ الْمُسْتَجِیْرُ اَلْوَجِلُ الْمُشْفِقُ اَلْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِیْ، اَسْئَلُکَ مَسْئَلَةَ الْمِسْکِیْنِ وَابْتَھِلُ اِلَیْکَ اِبْتِھَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِیْلِ وَاَدْعُوْکَ دُعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِیْرِ وَدُعَاءَ مَنْ خَضَعَتْ لَکَ رَقَبَتُهٗ وَفَاضَتْ لَکَ عَبْرَتُهٗ وَذَلَّ لَکَ جِسْمُهٗ وَرَغِمَ لَکَ اَنْفُهٗ۔

اَللّٰھُمَّ لَاتَجْعَلْنِیْ بِدُعَاءِکَ شَقِیًّا وَکُنْ لِیْ رَؤُفًا رَّحِیْمًا۔ یَاخَیْرَ الْمَسْئُوْلِیْنَ یَا خَیْرَ الْمُعْطِیْنَ ط

ترجمہ:۔اے میرے اللہ! تو میری بات سُنتا ہے اور میں جس جگہ اور جس حال میں ہوں وہ تیری نظر میں ہے، اور میرا ظاہر و باطن سب

تیرے سامنے ہے اور میری کوئی چیز بھی تجھ سے پوشیدہ نہیں ہے اور میں ایک دُکھی اور فقیر ہوں مدد کا طالب اور پناہ جُو ہوں، تیرا خوف اور ڈر مُجھ پر چھایا ہُوا ہے۔ میں اپنے گناہوں کا اقراری ہوں۔ میں تجھ سے کسی عاجز و مسکین بندہ کی طرح سوال کرتا ہوں اور ایک ذلیل گناہگار کی طرح تیرے حضور میں گڑگڑاتا ہوں، اس بندہ کی سی دُعا جس کی گردن تیرے سامنے خم ہو اور جس کے آنسو تیرے حضور میں بہہ رہے ہوں اور جس کا جسم جھکا ہو اور جو تیرے سامنے اپنی ناک رگڑ رہا ہو اور زمین پر سر رکھے پڑا ہو۔

اے میرے اللہ! میری دُعا کو رد کر کے مجھے شقی (بدبخت اور بے نصیب) نہ بنا اور مُجھ پر مہربانی اور رحم فرما۔ اے سب سے اچھے سب سے بڑے داتا، اے خیر المسئولین!"

## (۲)

اَللّٰهُمَّ بِعِلْمِكَ الْغَيْبِ وَقُدْرَتِكَ عَلَى الْخَلْقِ اَحْيِنِيْ مَا عَلِمْتَ الْحَيٰوةَ خَيْرًا لِّيْ وَتَوَفَّنِيْ اِذَا عَلِمْتَ الْوَفَاةَ خَيْرًا لِّيْ ۔ اَللّٰهُمَّ وَاَسْئَالُكَ خَشْيَتَكَ كَلِمَةَ الْحَقِّ فِي الرِّضَا وَالْغَضَبِ، وَاَسْئَالُكَ الْقَصْدَ فِي الْفَقْرِ وَالْغِنٰى وَاَسْأَلُكَ نَعِيْمًا لَّا يَنْفَدُ وَاَسْأَلُكَ قُرَّةَ عَيْنٍ لَّا تَنْقَطِعُ وَاَسْئَالُكَ الرِّضَاءَ بِالْقَضَاءِ وَاَسْئَلُكَ بَرْدَ الْعَيْشِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَاَسْئَلُكَ لَذَّةَ النَّظْرِ اِلٰى وَجْهِكَ وَالشَّوْقَ اِلٰى لِقَآئِكَ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ ضَرَّآءِ مُضِرَّةٍ وَّفِتْنَةٍ مُضِلَّةٍ ۔

اَللّٰهُمَّ زَيِّنَّا بِزِيْنَةِ الْاِيْمَانِ وَاجْعَلْنَا هُدَاةً مُّهْتَدِيْنَ ط

ترجمہ:۔اے اللہ! بوسیلہ اپنے عالم الغیب ہونے کے،اور مخلوق پر قادر ہونے کے، مجھے اُس وقت تک زندہ رکھ، جب تک کہ تیرے علم میں زندگی میرے لئے بہتر ہو،اور مجھے اُٹھالے جب کہ تیرے علم میں موت مرے لئے بہتر ہواور میں تجھ سے مانگتا ہوں تیرا خوف غائب اور حاضر میں،اور میں تجھ سے توفیق مانگتا ہوں حق بات کہنے کی،خوشی میں اور ناراضی میں اور میانہ روی کی تنگدستی میں اور خوشحالی میں،اور میں تجھ سے مانگتا ہوں وہ خوش عیشی جو سدا رہنے والی ہواور آنکھوں کی وہ ٹھنڈک جو دائمی اور ابدی ہواور میں تجھ سے مانگتا ہوں اپنے دل کی رضا تیرے حکم اور فیصلہ پر،اور میں سائل ہوں تجھ سے موت کے بعد زندگی کی ٹھنڈک کا اور میں سائل ہوں تجھ سے تیرے دیدار کی لذّت کا،اور تیرے وصال کی تڑپ کا (میں ان سب نعمتوں کا تجھ سے طالب اور سائل ہوں) اور تیری پناہ چاہتا ہوں ہر تکلیف دینے والی مصیبت سے اور ہر گمراہ کرنے والے فتنہ سے۔اے اللہ! ہم کو ایمان کی زینت سے آراستہ کردے اور ہم کو بنادے ہدایت یاب اور دوسروں کا ہادی ورہنما"۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ۔

☆☆☆

# ضمیمہ

# غیر اسلامی نظامِ حکومت میں
## شرکت اور ملازمت
# ایک سوال اور اُس کا جواب

یہ کتاب ''دین وشریعت'' جب پہلی دفعہ ۱۳۷۸ھ (۱۹۵۸ء) میں شائع ہوئی تو ایک صاحب نے اس کی ایک اہم بحث (غیر اسلامی اقتدار کے تحت رہنے والے مُسلمانوں کا مسئلہ) سے متعلق ایک سوال بھیجا، یہ سوال سنجیدہ اور معقول تھا، اس لئے راقم سطور نے اس کا جواب دینا ضروری سمجھا اور جواب دیا۔ موضوع کی اہمیت کے لحاظ سے اس سوال وجواب کا حق تھا کہ اس کو بھی اصل کتاب کے ساتھ شامل کر دیا جاتا، لیکن اب تک ایسا نہ ہو سکا۔ البتہ اسی زمانے میں یہ ''الفرقان'' کے ایک شمارے میں شائع کر دیا گیا تھا اور اس لئے محفوظ ہو گیا تھا۔ اب جبکہ اس کتاب کا جدید ایڈیشن ناچیز مصنف کی نظر ثانی اور بعض اضافات کے ساتھ شائع ہو رہا ہے تو اس کو بھی آخر میں ضمیمہ کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

جمادی الاولیٰ ۱۴۰۴ھ (فروری ۱۹۸۴ء)

## سوال

آپ نے اپنی کتاب ''دین وشریعت'' میں سیاست وحکومت کے باب میں غیر اسلامی (غیر شرعی) حکومت کے تحت رہنے والے مسلمانوں کے لئے جو اصولی راہِ عمل تحریر فرمائی ہے جس کے ماتحت وہ حکومت کے بہت سے شعبوں میں ملازمتیں بھی جائز طور پر کرسکتے ہیں، اور ملت کی دینی و دنیوی مصالح کا تقاضا ہو تو حکومت اور قانون ساز اداروں میں شرکت بھی کرسکتے ہیں۔ اس کو میرے دل ودماغ نے پوری طرح قبول کیا ہے۔ بات بالکل دل لگتی اور شرعی نقطۂ نظر سے حق نظر آرہی ہے، اور آپ نے جو استدلالی بحث اس سلسلہ میں کی ہے اگر چہ وہ بہت مختصر ہے مگر میرے نزدیک کافی حد تک اطمینان بخش ہے۔ لیکن ایک خلش یہ باقی رہ گئی کہ آپ نے اُن دلائل اور اُس نقطۂ نظر سے بالکل تعرض نہیں فرمایا جس کی بنیاد پر ہندوپاک کا ایک مشہور ومعروف دینی مکتب فکر کسی غیر اسلامی حکومت یا اس کے قانون ساز اداروں میں شرکت کو ہر حال میں ایک طاغوتی عمل اور ایسی حکومتوں کی ملازمت کو مطلقاً ''تعاون علی الاثم والعُدوان'' اور طاغوت کی چاکری قرار دیتا ہے۔

ان حضرات کی مشہور دلیل سورۂ توبہ کی آیت '' اِتَّخَذُوا اَحبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ'' الخ اور اس کی شرح کرنے والی حدیث بروایت عدی بن حاتم ہے۔ اس کی تفصیل یقیناً آپ کے علم میں ہوگی، اچھا ہو کہ آپ اس پر بھی روشنی ڈال کر مجھ جیسے لوگوں کی یہ خلش دُور فرمادیں۔

## جواب

''دین وشریعت'' کی جس بحث کا آپ نے اپنے سوال میں حوالہ دیا ہے واقعہ یہ ہے کہ جب میں نے ابتداءً اس کو لکھا تھا تو اپنے مدعا اور مسلک کی وضاحت سے فارغ ہونے کے بعد اس مخالفانہ نقطۂ نظر اور اس کے ان مشہور دلائل سے بھی تعرض کیا تھا، جن کا آپ نے تذکرہ کیا ہے۔ لیکن بعد میں مجھے یہ خیال ہوا کہ پوری کتاب میں میرا یہ روّیہ رہا ہے کہ دین کے جس باب میں جو میرے نزدیک حق تھا بس اُسی کو میں نے وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ناظرین کے اطمینانِ قلب اور تاثیر کے لئے جہاں جتنی استدلالی بحث ضروری سمجھی بس اسی قدر بحث کی ہے۔ مخالفانہ دلائل سے کہیں بھی تعرض نہیں کیا ہے۔ اس لئے مجھے یہی مناسب معلوم ہوا کہ اس بحث میں بھی اسی طریقہ کی پابندی کی جائے۔ چنانچہ وہ لکھا لکھایا حصّہ میں نے کتاب سے نکال لیا۔ لیکن نکالا ہُوا وہ حصّہ اصل مسوّدہ میں محفوظ تھا۔ اس لئے الفاظ کے معمولی تصرف کے ساتھ میں اسی کو نقل کئے دیتا ہوں۔ انشاء اللہ آپ جیسے سلیم القلب حضرات کے اطمینان کے لئے وہی کافی ہوگا۔

پہلے میں نے چند سطروں میں اسی مخالفانہ نقطۂ نظر کا تذکرہ کیا تھا جس کا آپ نے حوالہ دیا ہے، اس کے بعد میں نے لکھا تھا کہ ''کتاب وسنت'' اور امت کے مسلسل تعامل سے اس بارے میں جو کچھ ہم نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کے لئے یہ تو ضروری اور گویا شرطِ ایمان ہے کہ وہ اسلام، اسلامی تعلیم، یعنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے حضرت محمد ﷺ کے لائے ہوئے ضابطۂ حیات اور نظامِ زندگی کو حق وہدایت سمجھے اور اس کے خلاف جو کچھ ہے اُس کو غلط وباطل یقین کرلے اور اس لئے اس کی دلی آرزو اور چاہت یہی ہو کہ تمام انسان اللہ اور رسولؐ پر ایمان لے آئیں اور ان کے مقدّس دینِ اسلام کو اپنالیں اور ساری دنیا اس کی حلقہ بگوش اور اسی کے زیرِ اقتدار ہو جائے۔ (ویکونَ الدِّینُ کُلُّهٗ لِلّٰه)

نیز امتِ مسلمہ کا یہ بھی فرض ہے کہ اس مقصد کے لئے جس وقت براہِ راست یا بالواسطہ جو سعی وتدبیر مناسب ہو اس سے دریغ نہ کیا جائے (یہ بات ''دین وشریعت'' میں ''دین کی خدمت ونصرت'' کے زیرعنوان تفصیل سے لکھی بھی جا چکی ہے) لیکن ان حضرات کا یہ کہنا کہ کسی ملک کی غیر اسلامی حکومت کے ساتھ کسی معاملہ میں تعاون اور اس کی کوئی ملازمت بھی کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں اور اس کو مستقل شرعی ''فتویٰ'' کی حیثیت دینا ہمارے نزدیک ایسی بات ہے جس کی شریعت میں کوئی دلیل و بنیاد نہیں ہے۔ علاوہ ازیں بعض حالات میں اسی غالیانہ ''فتوے'' سے مسلمانوں کے دینی مقاصد ومصالح کو بھی سخت ضرر پہنچ سکتا ہے۔

ہمارے نزدیک عام شرعی مسئلہ اس باب میں یہ ہے کہ ایک مسلمان جس طرح کسی غیر صالح یا غیر مسلم فرد کے اُن معاملات کی انجام دہی کے لئے اُس کی ملازمت اور اس کے ساتھ تعاون اشتراک کر سکتا ہے جو اِثم وعُدوان نہ ہوں، اسی طرح غیر اسلامی حکومتوں اور اس طرح کے دوسرے اجتماعی اداروں کے بھی ان کاموں میں ہم تعاون کر سکتے اور عملی حصہ لے سکتے ہیں جو خلافِ شریعت اور ازقبیل اِثم وعُدوان نہ ہوں اور جس میں اسلام اور مسلمانوں کا کوئی ضرر نہ ہو۔ مثلاً حکومتوں کا محکمۂ صفائی، محکمۂ غذا، محکمۂ صحت، مواصلات، زراعت، صنعت، انسدادِ جرائم اور قیامِ امن اور ان کے علاوہ اور بھی متعدد شعبے حکومتوں کے ایسے ہیں جو اِثم وعدوان نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بعض میں تو خدمتِ خلق اور رفاہِ عام کا پہلو بھی غالب ہے۔ پس ایسے کاموں میں تعاون اور ان صیغوں میں ملازمت کے شرعی عدم جواز کی کوئی بھی وجہ نہیں ہو سکتی۔

یہاں ایک بڑا اصولی مغالطہ جس پر عدم جواز کے اس فتوے کی بنیاد رکھی جاتی ہے یہ ہے کہ، کہا جاتا ہے کہ ہر غیر اسلامی حکومت اللہ تعالیٰ کے مقدس دین کے مقابلہ میں ایک متوازی دین اور اللہ تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے نظامِ حق کے مقابلہ میں ایک باغیانہ نظام ہے اس لئے اس کے کسی بھی کام میں تعاون واشتراک اور کسی بھی شعبہ میں اُس کی ملازمت

وخدمت دینِ حق کے مقابلہ میں ایک دینِ باطل کی خدمت اور مقدس الٰہی نظام کے مقابلہ میں ایک باغیانہ طاغوتی نظام کے ساتھ تعاون اور اس کی خدمت ہے۔

لیکن اگر اللہ تعالیٰ نے دین کا کچھ بھی علم وفہم دیا ہو تو تھوڑا سا غور کرنے سے معلوم ہوجائے گا کہ یہ بات شرعی دلیل سے زیادہ خطابت اور شاعری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس قسم کی دنیوی حکومتوں کے بارے میں یہاں گفتگو ہورہی ہے (ان کے حدود واختیار اور حدودِ کار کی موجودہ وسعت کے باوجود) ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے کہ وہ ملکی نظم ونسق کو چلانے والے ایسے ادارے ہیں جن کے افراد بھی بدلتے رہتے ہیں، پارٹیاں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ اصول اور دستور تک میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، ان سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں ان غلطیوں پر نکتہ چینی بھی کی جاتی ہے، خاص کر جمہوری حکومتوں والے مُلکوں میں تو یہ نکتہ چینیاں بعض اوقات نہایت سخت اور حد درجہ رسوا کرنے والی ہوتی ہیں۔

پھر ان حکومت کے بڑے بڑے ذمّہ داروں پر بھی بعض اوقات مقدمات چلتے ہیں اور ان کو سزائیں بھی دی جاتی ہیں۔ پھر عوام کے لئے ان حکومتوں کے بدلنے کا حق بھی تسلیم کیا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر ملکوں میں یہ حکومتیں آئے دن بدلتی بھی رہتی ہیں، اور اسی بناء پر حکومتوں کی اصل حیثیت بس یہی ہے کہ یہ ملکی نظم ونسق کے چلانے کے ادارے ہیں۔ ان میں بسا اوقات مختلف عقائد وخیالات رکھنے والے اور مختلف ادیان ومذاہب کے ماننے والے اور کبھی کبھی تو مختلف سیاسی نظریات رکھنے والے بھی شریک ہوجاتے ہیں جن کے درمیان صرف حکومت کے اصولی پروگرام پر اتفاق ہوتا ہے۔

پس جن حکومتوں کی واقعی حیثیت اور پوزیشن یہ ہے کہ ان کے غیر اسلامی اور غیر شرعی ہونے کی وجہ سے شریعت کی زبان میں ان کو ناحق اور غیر صحیح حکومتیں تو بے شک کہا جاسکتا ہے، لیکن یہ کہنا کہ ایسی ہر حکومت اللہ تعالیٰ کے مقدّس دین کے مقابلہ میں ایک متوازی دین ہے اور ان کو چلانے والے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں خدائی کے دعوے دار ہیں' جب ہی صحیح ہوسکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے مقدّس دین کو بہت نیچے اُتار لیا جائے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو دنیوی

حکمرانوں اور فرماں رواؤں کی قسم کا بس ایک حاکم اور فرماں روا اور اس کے دین کو بس ایک ''اسٹیٹ'' اور ''نظامِ حکومت'' سمجھ لیا جائے۔ تعالیٰ اللّٰہ عن ذٰلک علوًا کبیرا۔

اسی طرح کا ایک دوسرا مغالطہ اس سلسلہ میں یہ بھی ہے کہ اِن حکومتوں کی صرف دنیوی قانون سازی کو اللہ تعالیٰ کی دینی تشریع کے مقابل قرار دے کر ''شرک'' بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ''خدائی کا دعویٰ'' کہا جاتا ہے اور اسی بناء پر ان حکومتوں کی مجالسِ قانون ساز کی شرکت کو دعوائے خدائی کو متضمن اور قطعی حرام قرار دیا جاتا ہے، حالانکہ جس تشریع کا حق غیر اللہ کے لئے ماننا واقعۃً شرک ہے وہ دینی تشریع ہے، یعنی یہ کہ کسی مخلوق (فرد یا طبقہ یا ادارہ) کو مقدس مُطاع اور منزّہ عن الخطا مانتے ہوئے اُس کو تحریم و تحلیل اور امر و نہی کا حق دار مانا جائے اور اس کے احکام کی تکمیل کو برّ و سعادت اور اس کی نافرمانی کو گناہ و شقاوت سمجھا جائے۔

قرآن مجید میں نصاریٰ کے جس گروہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ:۔

اِتَّخَذُوا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (توبہ ع:۴)

''انھوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اپنے مذہبی عالموں اور دُرویشوں کو اپنا معبود بنا لیا''۔

اُن کی گمراہی یہی تھی اور اپنے احبار و رُہبان کو انھوں نے تقدس و تشریع کا یہی مقام دے رکھا تھا۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت عدی بن حاتم سے جو حدیث مروی ہے خود اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے [1]۔ اور مسیحیت کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ چیز اور زیادہ وضاحت و تفصیل سے معلوم ہو جاتی ہے۔

---

[1] جامع ترمذی وغیرہ میں حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عدی بن حاتم جو عیسائی تھے، انھوں نے جب رسول اللہ ﷺ سے سورۂ توبہ کی یہ آیت سنی تو عرض کیا کہ عیسائیوں نے اپنے عالموں اور درویشوں کو تو معبود نہیں بنایا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا ایسا نہیں ہے کہ اُن کے یہ عالم اور درویش جس چیز کو حرام یا حلال قرار دے دیتے ہیں، عیسائی ان کی تحریم و تحلیل کو مان کر اُن کا اتباع کرتے ہیں، یہی اُن کو معبود بنانا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ کی مراد دینی تحریم و تحلیل ہے اور مسیحیت کی تاریخ کے مطالعہ سے اس کی پوری تفصیل بھی معلوم ہو جاتی ہے۔

اور بالکل ظاہر ہے کہ عہدِ حاضر کی جن غیر اسلامی حکومتوں کے بارے میں یہ گفتگو ہو رہی ہے اُن کی اور اُن کے قانون کی حیثیت کسی کے نزدیک بھی یہ نہیں ہے، اس لئے اُن کی قانون سازی کو وہ تشریع قرار دینا جو درحقیقت صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور اس بناء پر اس کو خدائی کا دعویٰ یا شرک یا حرام کہنا سراسر شاعرانہ غلو ہے، اور پھر اس کے ثبوت میں سورۂ توبہ کی مندرجہ بالا آیت پیش کرنا اور بھی بے جا جسارت ہے۔

امید ہے کہ اس مسئلہ سے متعلق یہی سطریں آپ کی اور آپ جیسے دیگر حضرات کی ''خلش'' دور کرنے کے لئے کافی ہوں گی۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے صحیح اور جائز حکومتیں تو صرف وہی ہو سکتی ہیں جو حکومت و سیاست کے اسلامی ضابطہ کی بنیاد پر قائم ہوں اور جن کے دستور و قانون کی اساس کتاب وسنّت اور اسلامی شریعت کو قرار دیا گیا ہو، لیکن جو حکومتیں ایسی نہیں ہیں (خواہ اُن کے چلانے والے غیر مسلم ہوں یا مسلمان یا مخلوط) اُن کے غیر صحیح اور ناجائز ہونے کے باوجود اسلام اُن کے وجود کو اسی طرح تسلیم کرتا ہے جس طرح وہ غیر صالح اور غیر مسلم افراد کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ پھر ان کے حالات کے اختلاف کے لحاظ سے وہ ان کو مختلف قسموں میں تقسیم کرتا ہے اور ان کے بارے میں الگ الگ احکام دیتا ہے۔

پھر جس طرح وہ عام حالات میں غیر مسلم افراد کے ساتھ ایسے امور میں تعاون اور اشتراک سے منع نہیں کرتا جو اِثم و عدوان نہیں ہیں، اسی طرح وہ ایسے امور میں غیر اسلامی حکومتوں کے ساتھ اشتراک وتعاون سے بھی منع نہیں کرتا، بلکہ اگر غیر مسلم افراد اور اسی طرح غیر اسلامی حکومتیں کوئی ایسا کام کریں جس میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی بھلائی ہو تو اس میں تو تعاون کی اپنے پیروؤں کو ترغیب دیتا ہے۔ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں تعاون وتناصر کا حکم صرف مسلمانوں ہی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کے عموم میں غیر مسلم بھی شامل ہیں [1]۔

---

[1] جس مکتب فکر کے نقطۂ نظر پر یہ بحث کی گئی ہے، اس کے فکری رہنما مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے سورۂ مائدہ کی آیت ''تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ'' کے ذیل میں ''تفہیم القرآن'' میں جو کچھ لکھا ہوا ہے ان کے معتقدین اس موقع کو ضرور دیکھ لیں۔

علاوہ ازیں کسی غیر اسلامی حکومت کے مسلمان شہریوں کے لئے ایسے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں (بلکہ اکثر و بیشتر ایسا ہوگا) کہ حکومت کے کاروبار اور اُس کی مجالس قانون ساز میں شرکت خود مسلمانوں کو دینی و دنیوی نقصانات سے بچانے کے لئے اور ان کے دوسرے اہم ملّی مصالح کے لئے ضروری سمجھی جائے۔

پس ایسے حالات اور ایسی صورت ہوتو ان مخلص مسلمانوں کا جو اس کے لئے اہل اور موزوں ہوں حکومت کے کاروبار میں شریک ہونا ضروری ہوگا اور بالکل اسی طرح ان ملکوں کے مسلمانوں کے لئے ایسے حالات بھی آسکتے ہیں کہ حکومت کے کاروبار سے بالکل بے تعلقی اور عدم تعاون مسلمانوں کے دینی، ملّی مصالح کا تقاضا ہو، اور اُن کے اہلِ علم اور ارباب دانش اسی پالیسی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کریں، اس وقت ان ملکوں کے مسلمانوں کو اسی کے مطابق چلنا اور اسی پالیسی پر عمل پیرا ہونا ضروری ہوگا۔ لیکن اس وقت بھی اس فیصلہ کی بنیاد یہ نہ ہوگی کہ ''غیر اسلامی حکومت سے اشتراک و تعاون، ایمان باللہ اور کفر بالطاغوت کے بنیادی حکم کے منافی ہے اور اس لئے قطعاً حرام ہے''۔ بلکہ وہ اس وقت کے خاص حالات کا تقاضا اور مخصوص صورتِ حال کا حکم ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْهَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَامِنْ لَدُنْکَ رَحْمَةً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّاب ۝

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

(ذی الحجہ ۱۳۷۸ھ (جولائی ۱۹۵۹ء)

# حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی نظر میں

## یہ کتاب

مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے اور اُن غیر مسلموں کیلئے بھی جو اسلام کو کسی حد تک علمی و عقلی اور عملی طور پر سمجھنا چاہتے ہیں، ایک رہنما اور معلّم کتاب ہے۔

کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عام فہم ہونے کے ساتھ اس میں دین کی صحیح فہم، مطالعہ اور صحبت کا نچوڑ آ گیا ہے، اسی کے ساتھ اس میں توازن، حقیقت پسندی بھی ہے، اور وہ مولانا کی عمومی تحریری خصوصیت کے مطابق حشو وزائد سے پاک ہے۔

اس میں بعض ایسے مضامین بھی آ گئے ہیں جو عقائد کی ''عُرفی'' کتابوں میں نہیں ملیں گے، مثلاً وحدتِ اَدیان کے فتنہ کا رد، منکرین حدیث کی گمراہی کا بیان، اہل السنۃ والجماعۃ کے بنیادی امتیاز کا اظہار' نئے زمانے کے نئے بتوں کا تذکرہ، نفس پرستی پر ضرب، اعجاز قرآن پر مختصر لیکن مفید بحث، ارکان اربعہ کی اصل روح اور مقصد کی توضیح۔

...... بعض قدیم و دقیق کلامی مسائل کی بڑی خوبی سے تلخیص و تسہیل کی ہے، مثلاً رویتِ باری، جبر و قدر کا مسئلہ، آخرت کی ضرورت، اور یہ کہ جزا و سزا اس دنیا میں کیوں نہیں دی جاتی، سلف صالحین کے اتباع کی کیا اہمیت ہے؟ خلافت راشدہ کی عظمت وانفرادیت' سیاست وحکومت کے بارے میں متوازن و معتدل نقطۂ نظر اور جامع گفتگو۔

اس طرح اس کتاب نے دین کی تفہیم اور اسلام کی ضروری تعلیم کے ساتھ، ایک مختصر لیکن جامع رہنمائے زندگی کی حیثیت اختیار کر لی ہے، جس کو ایک مشغول و متوسط درجہ کا آدمی اپنی زندگی کا دستور عمل بنا سکتا ہے۔

(منقول از ''مقدمہ'' کتاب ہٰذا)

Designed & Printed at:- Kakori Offset Press, Lucknow, Mob.: 0522-4240926